اتنے سال کسی اخبار، رسالے پر ان کی تصویر کیوں نہ آسکی؟
خواتین میں بے پناہ مقبول
رضیہ بٹ
۸۸ رسالہ
خوشگوار سفر
تمام ہوا
نیا انداز
نومبر
2012
اُردو ڈائجسٹ
/urdudigest.pk
وسطی ایشیا کی نئی
گریٹ گیم
روسی صدر کا دورۂ پاکستان، التوا کی اصل وجہ؟
8 ٹیکنالوجیز
جو انقلاب لا رہی ہیں
تخلیقی صلاحیت میں اضافہ کیسے ممکن ہے؟
ذہن کُھلا رکھیں
www.paksociety.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت میں مشقت

(اے محمد ﷺ) ہم نے تم پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم مشقت میں پڑ جاؤO بلکہ اس شخص کو نصیحت دینے کے لیے (نازل کیا ہے) جو ڈر رکھتا ہو۔O (طٰہٰ ۲۰:۲۔۱)

(جناب سید عالم ﷺ ساری ساری رات نماز میں کھڑے ہو کر قرآن پڑھتے اور اپنی امت کے لیے ہدایت اور بخشش کی دعا مانگتے یہاں تک کہ پائے اقدس پر ورم آجاتا۔ اس پر یہ آیات کریمہ نازل ہوئیں)

رسول کا فرمان

سورۃ فاتحہ

اس کا ایک اہم نام "الصلوٰۃ" بھی ہے۔ نبی کریمؐ نے اس سورۃ کو متعدد ناموں سے یاد کیا ہے۔ فاتحہ الکتاب، الشفاء، السبع المثانی، اُم القرآن۔

۱۔ بروایت حضرت ابوہریرہؓ

رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز یعنی "سورۃ فاتحہ" میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ نصف میرے لیے ہے اور نصف میرے بندے کے لیے ہے اور جو کچھ میرا بندہ مانگتا ہے وہ اُس کو دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم)

۲۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ سورۃ فاتحہ کی نظیر نہ تورات میں نازل ہوئی نہ انجیل اور زبور میں اور نہ خود قرآن کریم میں کوئی دوسری سورۃ اس کی مثل ہے۔ (الترمذی، مسلم، مظہری)

۳۔ بروایت حضرت انسؓ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کریم کی سب سورتوں میں عظیم ترین **الحمد للہ رب العالمین** ہے۔ (صحیح بخاری)

WWW.PAKSOCIETY.COM

نومبر 2012

فہرست

سرِ ورق پر

تخلیقی صلاحیت میں اضافہ کیسے ممکن ہے؟

ذہن کھلا رکھیں

اچانک سوجھنے والا نادر، شگفتہ اور اعلیٰ خیال کہاں سے آتا ہے؟

روسی صدر کا دورۂ پاکستان، التوا کی اصل وجہ؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا کا خطبہ عمدہ، بروقت اور برموقع تھا

لاہور کے سامعین نے دل جیت لیے

منٹو کے بارے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی تحقیق نے حیران کردیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

فہرست

نومبر 2012

گوشۂ اقبال

TED

Ideas Worth Spreading

کہانیاں

کیہ جاناں میں کون

شاہد خان

WWW.PAKSOCIETY.COM

شفاف انتخابات کب اور کیسے؟

مختلف واقعات اور محرکات نے عام انتخابات کے بروقت انعقاد کے بارے میں بڑے بڑے سوالات اُٹھا دیے ہیں۔ ملالہ یوسف زئی، شازیہ اور کائنات پر طالبان کے بزدلانہ حملے کے بعد شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن کے حق میں جو فضا تیار کی جا رہی تھی، اس میں بروقت انتخابی عمل کی بہت کم گنجائش نظر آتی تھی۔ وزیرداخلہ جناب رحمٰن ملک نے یہ ”مژدہ“ سنا دیا تھا کہ فوجی آپریشن زیرِ غور ہے، کیونکہ قاتل شمالی وزیرستان سے آئے تھے۔ جنرل کیانی کے بعض اقدامات اور بیانات سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ دہشت گردوں پر کاری ضرب لگانے کا ارادہ کر لیا گیا ہے۔ چیئرمین جائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی جنرل خالد شمیم وائیں نے کاکول میں لانگ مارچ پریڈ سے خطاب کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہا ہے کہ قومی سلامتی کے لیے پوری قوم کو متحد ہو کر فوج کی پشت پر کھڑا ہونا ہو گا جو ہر قسم کے داخلی اور خارجی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے اور مٹھی بھر شدت پسند بہادر قوم کو یرغمال نہیں بنا سکتے۔ پاکستان کے نام نہاد

WWW.PAKSOCIETY.COM

لبرل حلقے بھی فوری آپریشن کا مطالبہ کر رہے تھے، جبکہ امریکی دباؤ میں بھی ہر لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

شمالی وزیرستان میں آپریشن کے خلاف بیشتر سیاسی اور مذہبی جماعتیں اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ اُنہوں نے ملالہ یوسف زئی پر قاتلانہ حملے کی پرزور مذمت کرتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس واقعے کو فوجی آپریشن کا جواز نہیں بننے دیں گے اور اس کی پوری قوت کے ساتھ مزاحمت کی جائے گی۔ چنانچہ اس پر جناب زرداری نے دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ غیر مبہم بیان دیا ہے کہ شدت پسندوں کے خلاف آپریشن کے لیے ملک گیر اتفاقِ رائے نہیں پایا جاتا جس کے بغیر فوجی کارروائی خطرناک ہوگی۔ بیشتر قومی زعماء کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ فوجی آپریشن کے نتیجے میں عام انتخابات کا بروقت انعقاد ناممکن ہوگا اور ملک ایک گہری دلدل میں پھنس جائے گا۔ اُن کے خدشات پر حکومتی اور عسکری قیادت نے بڑے گہرے غور و خوض کے بعد ایک درست حکمتِ عملی طے کی ہے جس کے نتیجے میں عام انتخابات پر چھائے ہوئے شکوک و شبہات کے بادل کس قدر چھٹنے لگے ہیں، تاہم بعض حلقوں میں ابھی تک یہ بدگمانی پائی جاتی ہے کہ حکومت کی میعاد بڑھانے کی درپردہ سازشیں ہو رہی ہیں۔

ائیر مارشل (ر) اصغر خاں کی رٹ پٹیشن پر عدالتِ عظمیٰ نے جو تاریخی فیصلہ دیا ہے، اس کی جو من مانی تعبیریں کی جا رہی ہیں، اُن سے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے بارے میں شیطان کی آنت کی طرح خدشات پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ جنرل (ر) اسلم بیگ اور لیفٹیننٹ جنرل (ر) اسد درانی کے حلفیہ بیانات میں یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں مثبت نتائج حاصل کرنے کے لیے سیاست دانوں میں رقوم تقسیم کی گئی تھیں، چنانچہ فاضل عدالت نے اُن پر آئین اور قانون کے مطابق مقدمات چلانے کے لیے حکومت کو حکم صادر کیا ہے اور یہ ہدایت بھی دی ہے کہ ایف آئی اے ان سیاست دانوں کے خلاف تحقیقات کرے جنہوں نے خفیہ ایجنسیوں سے رقوم وصول کی ہیں۔ پیپلز پارٹی کی قیادت اس تاریخی فیصلے کی یہ تشریح کر رہی ہے کہ جن سیاست دانوں کے نام فہرست میں شامل ہیں، وہ اب نااہل ہو چکے ہیں اور عدالتی سطح پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ۱۹۹۰ء کے انتخابات ایجنسیوں نے چُرا لیے تھے۔ اس کے جواب میں نواز لیگ نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ۱۹۹۳ء میں وزیر اعظم نواز شریف کی حکومت گرانے کے لیے اسٹیبلشمنٹ نے بے نظیر کو فنڈز فراہم کیے تھے اور صدر زرداری نے ۲۰۰۹ء میں پنجاب حکومت کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے سول خفیہ ایجنسی آئی بی سے پچاس کروڑ نکلوائے تھے۔ اپوزیشن لیڈر جناب چودھری نثار علی خاں نے ایف آئی اے کے ذریعے تحقیقات اس بنیاد پر مسترد کر دی ہے کہ وہ ادارہ وزیر داخلہ کے تحت کام کرتا ہے جن سے غیر جانب داری کی توقع نہیں کی جا سکتی، چنانچہ ایک ایسا تنازع اُٹھ کھڑا ہوا ہے جو پورے جمہوری نظام کو تہ و بالا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کر سکتا ہے۔

اس عدالتی فیصلے کے چند اور پہلو بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ عمل درآمد کے وقت یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان دونوں جرنیلوں کا کورٹ مارشل کیا جائے یا آئین کی خلاف ورزی پر سول عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ ایک نقطۂ نظر کے مطابق فوجی عدالت میں کارروائی سے فوج کا امیج بلند اور اُس کا وقار دوچند ہوگا اور عسکری قیادت پر اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ آئین شکنی کا کس قدر عبرت ناک انجام ہو سکتا ہے۔ دوسرا زاویہ ہے کہ فوج کے مورال پر منفی اثرات مرتب ہوں گے جن کے باعث سول ملٹری تعلقات میں دراڑیں پڑ سکتی ہیں جبکہ حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ حکومت اور فوج ایک فیصلے پر متفق نظر آئیں۔ اس کے علاوہ بریگیڈیئر (ر) حامد سعید کے عدالتی بیان کے وہ پیراگراف بھی ظاہر کر دینے چاہئیں جن میں اُن وجوہات کا ذکر ہے جن کی بنیاد پر سیاست دانوں میں رقوم تقسیم کی گئی تھیں۔ اس طرح عوام اس واقعے کے پورے پس منظر سے آگاہی حاصل کر سکیں گے اور آج بعض سیاست دان پارسائی کے جس بلند مقام سے بات کر رہے ہیں، اُنہیں اپنی پارٹی کا اصل چہرہ نظر آ جائے گا۔ اس کھینچا تانی سے باہر آنے کا ایک ہی راستہ ہے جو میثاقِ جمہوریت میں درج ہے کہ سچ بولنے اور مصالحت کرنے کا ایک کمیشن قائم کیا جائے جس میں لوگ سچے دل سے اپنے جرائم کا اعتراف کریں اور قومی صلح جوئی کے حوالے سے اُنہیں معاف کر کے قومی دھارے میں شامل کر لیا جائے۔ اس طرح جمہوریت کا پراجیکٹ آگے کی طرف بڑھے گا اور عام انتخابات بھی وقت پر منعقد ہو سکیں گے۔

عوام انتخابات کے ذریعے اعلیٰ تعلیم یافتہ، دیانت دار اور اہل قیادت لانے کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ سپریم کورٹ بلوچستان بدامنی کیس میں یہ عبوری حکم جاری کر چکی ہے کہ صوبائی حکومت اپنے بنیادی فرائض ادا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس حکم کے آ جانے کے بعد وزیراعلیٰ بلوچستان جناب نواب اسلم رئیسانی کو مستعفی ہو جانا چاہیے تھا، مگر ۶۵ میں سے ۶۲ ارکینِ اسمبلی اقتدار سے چمٹے ہوئے ہیں جن کی انتخابی کامیابیوں میں خفیہ ایجنسیوں نے کردار ادا کیا تھا۔ بیشتر سیاسی تجزیہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ اگر بلوچستان میں شفاف انتخابات کے ذریعے عوام کی حقیقی نمائندہ حکومت قائم ہو جاتی ہے، تو معاملات سلجھنا شروع ہو جائیں گے۔ کچھ ایسا معاملہ صوبہ سندھ کا بھی ہے جس میں سیاست کے نام پر فاشسٹ جماعتیں ریاستی وسائل پر قابض ہیں اور اُن کے زیرِ اثر کام کرنے والے مافیاؤں نے بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان اور ٹارگٹ کلنگ کا گھناؤنا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ عام انتخابات میں بہت سارا گند بہہ جائے گا۔ خیبر پختون خواہ میں بھی یہی لوگ ایک بڑی تبدیلی کے حق میں ہیں جہاں عمران خان کی سیاسی طاقت میں غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں

آ رہا ہے۔ عام انتخابات میں پنجاب میں سرگرم سیاسی جماعتیں بہتر امیدوار کھڑا کریں گی اور لوگ اُنھیں ووٹ دیں گے جو اچھی شہرت اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوں گے۔ فاٹا میں اگر پولیٹکل پارٹیز ایکٹ نافذ کر دیا جائے، تو وہ بھی انتخابات کے ذریعے بڑی حد تک قومی دھارے میں آ سکتا ہے۔

آج انتہائی غور طلب سوال یہ ہے کہ عام انتخابات کب ہونے چاہئیں۔ آئینی پوزیشن یہ ہے کہ موجودہ اسمبلی کی ٹرم ۱۷ مارچ ۲۰۱۳ء کو ختم ہو رہی ہے اور اس کے بعد ساٹھ دنوں میں انتخابات کا انعقاد لازمی ہے۔ سترہویں ترمیم سے پہلے دستور میں یہ درج تھا کہ قومی اسمبلی کی مدت ختم ہونے سے ساٹھ دن پہلے انتخابات ہونے چاہئیں۔ جنرل پرویز مشرف نے اپنے مفاد کی خاطر آئینی ترمیم کرائی تھی۔ اب اگر آئین کی رُو سے مئی ۲۰۱۳ء کے وسط میں انتخابات ہوتے ہیں، تو قومی اسمبلی کی باقاعدہ تکمیل وسط جون تک نہیں ہو سکے گی اور نئی حکومت کو بجٹ کی تیاری کا وقت میسر ہی نہیں آئے گا، جبکہ ۲۰۱۲ء میں بجٹ ۸ جون کو پیش کر دیا گیا تھا۔ یہ اہم پہلو اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ عام انتخابات زیادہ سے زیادہ مارچ کے وسط میں منعقد ہو جائیں اور قومی اسمبلی بجٹ پیش ہونے سے ایک ماہ پہلے وجود میں آ جائے تاکہ ارکانِ اسمبلی اپنی اپنی تجاویز دے سکیں۔ حکومت دو ماہ پہلے عام انتخابات کا اعلان کرنے کا اختیار اور جواز رکھتی ہے۔

اور جہاں تک شفاف انتخابات کی ضمانت کا تعلق ہے، ایک آزاد اور خود مختار الیکشن کمیشن وجود میں آ چکا ہے جو فاضل جسٹس (ر) فخر الدین جی ابراہیم کی قیادت میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے لیے ضروری اقدامات کر رہا ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ساتھ ہی مقامی حکومتوں کے انتخابات بھی کرانے کا جائزہ لیا جائے تاکہ ایک ہی وقت میں سارے منتخب ادارے وجود میں آ سکیں اور مقامی سطح پر لوگوں کے مسائل حل ہونے کی فوری سبیل نکل آئے۔ شفاف انتخابات کے لیے پوری سوسائٹی میں ایک تحریک اُٹھانا اور لوگوں کو ووٹ کی اہمیت اور قدر و قیمت کا احساس دلانا ہوگا۔ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے پر ذاتی حملوں کی یلغار کرنے کے بجائے ایشوز پر عوام کی سیاسی تربیت کریں اور ابھی سے پولنگ ایجنٹس کی ٹریننگ پر توجہ دیں۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر بھی گراں قدر ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اُمیدواروں کے ایکسرے عوام کے سامنے پیش کرتا رہے تاکہ وہ انتخابات کو شفاف بنانے اور ایک اہل قیادت لانے کا ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہو۔

الطاف حسن قریشی

WWW.PAKSOCIETY.COM

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

روشن مستقبل کا حقیقی راز

ہماری سیاست میں کیونکر استحکام آسکتا ہے،
ہماری معیشت کس طرح مضبوط ہو سکتی ہے،
ہمارا دفاع کیسے ناقابلِ تسخیر بن سکتا ہے،
اِن موضوعات پر ان دنوں بہت خیال آرائیاں ہو رہی ہیں،
لیکن ایک واقعے نے ہمیں جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے
اور ایک نئی موجِ خیال بلند ہوتی جا رہی ہے
حالات کے بہاؤ کا تجزیہ۔ الطاف حسن قریشی کے قلم سے

پاکستان

پاکستان کے بعد آزاد ہونے والے ممالک ترقی اور خوشحالی کی بڑی منزلیں طے کر چکے ہیں، جبکہ ہماری پس ماندگی اور زبوں حالی اقوامِ عالم کا موضوعِ گفتگو بنی ہوئی ہے۔ بلاشبہ ہمارے ملک نے حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی ہیں، جبکہ پاکستانی قوم روز بہ روز زوال کی طرف مائل ہے۔ اس کی بڑی وجہ ہمارے حکمرانوں کی بے تدبیری اور اخلاقی گراوٹ کے علاوہ اُن کی قومی تعلیم و تربیت کے بارے میں بے حسی اور مجرمانہ غفلت کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ انہیں ذرہ برابر احساس ہی نہیں کہ اُن کی تعلیمی پالیسیاں نئی نسل کے مستقبل پر کس قدر زہرناک اثرات مرتب کر رہی ہیں۔ تعلیم جسے دفاع کے برابر اہمیت دی جانی چاہیے تھی، وہ آج قومی ترجیحات میں سب سے پیچھے ہے۔ تحقیق و تفتیش اور منصوبہ بندی کے بغیر نئے نئے تعلیمی تجربات کیے جا رہے ہیں جن کے باعث قوم ایک خوفناک طبقاتی تصادم کے دہانے پر کھڑی ہے۔

ترقی، خوشحالی اور یک جہتی کی آرزومند قومیں نصاب سازی کو اوّلین اہمیت دیتی ہیں۔ قائداعظمؒ نے حصولِ آزادی کے بعد پہلی قومی تعلیمی کانفرنس کے خطاب میں تعلیم کو مرکزی حکومت کی تحویل میں دینے کا اصول صراحت سے بیان کیا تھا، لیکن ۲۰۱۰ء میں اٹھارویں دستوری ترمیم کے ذریعے تعلیم کے جملہ امور صوبوں کی تحویل میں دے دیے گئے ہیں اور یوں نصاب سازی کا نظام جو فکری وحدت اور قومی یک جہتی کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے، وفاقی سطح پر اس کا وجود تحلیل ہو گیا ہے۔ اس غیر دانش مندانہ اقدام سے قومی ذہن سازی کی مرکزی حیثیت یقینی طور پر متاثر ہو گی اور طلبہ کے اندر بنیادی تصورات اور مشترک مقاصد کی آبیاری دشوار تر ہو جائے گی۔ یہ درست ہے کہ تعلیمی نصاب کے اندر مقامی ضرورتوں اور ثقافتی لطافتوں کو سمونے کا رجحان فروغ پا رہا ہے، تاہم ہر قوم اپنی نئی نسل میں امتیازی اوصاف پیدا کرنے اور تاریخی پس منظر میں اعلیٰ نصب العین کا شعور جاگزیں کرنے پر خصوصی توجہ دیتی ہے، لیکن لامحدود ہوسِ شکم پروری نے ہمارے ناخداؤں کو ایک اہم ترین فریضے سے مجرمانہ حد تک غافل کر دیا ہے اور شہری جو جمہوری معاشرے کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے، وہ تعلیمی افلاس کی جانکنی سے گزر رہا ہے۔

☆☆☆

قوم کی شیرازہ بندی میں قومی زبان کلیدی کردار ادا کرتی ہے، مگر ہم پینسٹھ برسوں میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم نہ بنا سکے جسے دستور میں قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اِس کے برعکس بیرونی امداد کے لالچ میں ہمارے کھیون ہار پہلی جماعت سے انگریزی پڑھانے کے غیر فطری اور تباہ کن تجربات کی مشق فرما رہے ہیں۔ پنجاب میں اس کا آغاز جناب میاں منظور وٹو کے دورِ حکومت میں ہوا تھا اور میاں شہباز شریف بھی اسی راستے پر چلنے میں فخر محسوس کر رہے ہیں، جبکہ زمینی حقیقت یہ ہے کہ انگریزی پڑھانے والے اساتذہ سرے سے دستیاب ہی نہیں اور پرائمری اسکولوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پہلے مطلوبہ تعداد میں انگریزی کے اساتذہ تیار کیے جاتے اور اس کے بعد پہلی جماعت سے انگریزی کی تدریس کا پروگرام ترتیب دیا جاتا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے منصوبہ ساز انگریزی کو قابلیت، ترقی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور جدیدیت کی علامت سمجھ بیٹھے ہیں اور اس طرح پہلی جماعت سے انگریزی کی تعلیم پر اربوں روپے ضائع ہونے کے علاوہ یہ پروگرام قومی ارتقاء کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوا ہے۔ بلاشبہ یورپی ممالک میں بچوں کو اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانیں بھی سکھائی جاتی ہیں، لیکن مرکزی حیثیت قومی زبان ہی کو دی جاتی ہے۔ تعلیم کے ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ بچے کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما قومی زبان میں سب سے بہتر ہوتی ہے۔ ہمارے مایہ ناز سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں اس حقیقت کا بار بار اظہار کر چکے ہیں کہ ان کے ذہن کو جلا اور سائنسی حقائق پر گرفت اُردو زبان سے حاصل ہوئی تھی، مگر آج اس کی ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ملک میں اُردو پڑھانے والے اساتذہ کی تعداد دن بدن خطرناک حد تک کم ہوتی جارہی ہے، جو اُبھرتے ہوئے خوفناک المیے کی نشان دہی کرتی ہے۔ اُردو زبان تحریکِ پاکستان کی روحِ رواں تھی اور اسی کو تعلیمی اداروں، عدالتوں اور حکومت کے اداروں اور ایوانوں میں رائج کر کے ایک تابناک مستقبل کی طرف پیش قدمی کی جاسکتی ہے۔

قومیں یکساں نظامِ تعلیم کے ذریعے یکساں طرزِ احساس اور یکساں سماجی شعور کی پرورش کرتی ہیں، مگر پاکستان جو اسلام کے تصورِ مساوات اور حریت فکر کی اساس پر وجود میں آیا تھا، اس میں بڑی تیزی سے ایک ہلاکت خیز طبقاتی نظامِ تعلیم پروان چڑھ رہا ہے۔ ایک طرف لاکھوں کی تعداد میں گورنمنٹ کے خستہ حال تعلیمی ادارے ہیں، دوسری طرف ہزاروں دینی مدرسے لاکھوں طلبہ کو تعلیم دے رہے ہیں اور تیسری طرف نہایت مہنگی پرائیویٹ درس گاہوں کی تعداد میں ہوشربا اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے، جن میں انگریزی ذریعہ تعلیم ہے۔ جب پاکستان وجود میں آیا تھا، تو سرکاری اسکول، کالج اور یونیورسٹی حصولِ علم کا سب سے بڑے مراکز تھے جنہوں نے عظیم اہلِ قلم، اعلیٰ درجے کے منتظم، بلند پایہ ریاضی دان، سائنس دان اور چوٹی کے معلمین پیدا کیے تھے۔ ان میں امیروں اور غریبوں کے بچے ایک ساتھ پڑھتے اور ایک ہی تہذیبی ماحول میں پرورش پاتے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پورے ملک سے طلبہ تعلیم حاصل کرتے اور گہرے سماجی رشتوں میں بندھتے چلے جاتے تھے۔ اسی طرح پنجاب یونیورسٹی بھی پاکستان کے طول و عرض سے علم کے شائقین کو اپنی طرف کھینچتی رہتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گورنر پنجاب جناب عبدالرب نشتر کے بیٹے سائیکلوں پر سنٹرل ماڈل اسکول جاتے اور معاشرے سے وابستہ رہتے تھے۔

☆☆☆

انگریزوں نے اپنی وفادار اشرافیہ کی تعلیم و تربیت کے لیے ایچی سن اسکول اور لارنس پور کالج قائم کیے تھے جن میں تمام صوبوں کے مراعات یافتہ طبقات تعلیم حاصل کرتے تھے۔ تحریکِ پاکستان کے بیشتر

قائدین اور سرگرم کارکن علی گڑھ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے اور پاکستان بننے سے پہلے قدرے خوشحال مسلم گھرانوں کے نوجوان بھی اس عظیم درس گاہ سے فیض حاصل کرتے تھے۔ تقسیم کے وقت مشرقی بنگال کے علاوہ صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب میں دینی مدارس بھی موجود تھے۔ ۱۹۷۴ء میں مسٹر بھٹو کی تعلیمی اصلاحات کے بعد سرکاری اداروں کا زوال شروع ہوا اور گزشتہ دس بارہ برسوں میں شدت کے ساتھ یہ احساس ہو رہا ہے کہ ریاست تعلیم کی ذمے داریوں سے سبکدوش ہوگئی ہے۔ اب پبلک اسکولوں کی چار دیواری ہے نہ اُن میں فرنیچر، نہ پینے کا پانی، نہ واش روم اور نہ مناسب تعداد میں اساتذہ۔ یوں تو اسکول ڈائریکٹریٹ بھی ہیں اور کاغذوں میں اساتذہ کی ایک فوج ظفر موج بھی، مگر پرائمری اور ثانوی اسکولوں میں خاک اُڑ رہی ہے۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق لاہور کی ایک مضافاتی بستی میں طلبہ اکڑوں بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ایک استاد بیک وقت دو جماعتوں کو پڑھاتا ہے۔ اس روح تڑپا دینے والے منظر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے پس ماندہ علاقوں میں غریبوں کے بچوں پر کیا بیت رہی ہے۔ ہمارے مڈل اور لوئر مڈل کلاس کے کروڑوں طلبہ اور طالبات سرکاری اسکولوں میں حصولِ علم کے لیے جاتے ہیں، مگر اُن کی اُٹھان کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے اور وہ جہالت اور احساسِ کمتری کے اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ ہمارے حکمران ان ہونہار بچوں کے مستقبل کی تباہی کے ذمے دار ہیں، مگر انہیں خطرناک نتائج کی ذرا پروا نہیں۔ وزیراعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف نے غریبوں کی تقدیر بدل دینے کے لیے ایچی سن کالج کے شاندار معیار کے مطابق چند دانش اسکول قائم کیے ہیں، مگر اہلِ دانش کی رائے میں اُن کی افادیت انتہائی محدود اور اُن پر صرف ہونے والے وسائل بہت زیادہ ہیں جن سے پورے پنجاب کے اُجڑے ہوئے سرکاری اسکولوں میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔ ہر قوم کا درمیانی طبقہ انقلابی تبدیلیوں کا ہراول دستہ ہوتا ہے مگر جسے ہم نے اسے غبارِ راہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ اس گھناؤنے جرم پر ہمارے حکمرانوں کو ایک روز جواب دہی کے نہایت سخت عذاب سے گزرنا ہوگا۔

معاشرے کے بے وسیلہ خاندانوں کے لاکھوں بچے ہمارے دینی مدرسوں میں زیرِ تعلیم ہیں جن کے ماحول اور نصابِ تعلیم کے اندر جوہری تبدیلی لانے کی حکومت کی طرف سے کوئی نتیجہ خیز کوشش نہیں ہوئی۔ ان مدارس میں بھی لیپ ٹاپ، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور ابتدائی سائنس پڑھانے کے لیے اساتذہ فراہم کیے جاسکتے تھے۔ اس طرح یہ لاکھوں طلبہ جو فقہی مسلکوں کے قیدی بنے رہتے ہیں، انہیں ہائی اسکولوں کے تعلیمی معیار تک لاکر مفید شہری بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح قومی تعلیمی کانفرنس جس میں علمائے دین اور انگلش میڈیم کے منتظمین بھی مدعو کیے جائیں، یہ بنیادی پالیسی طے کی جانی چاہیے کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

دسویں جماعت کی سطح تک تمام سرکاری، دینی اور نجی اداروں میں ایک ہی نصابِ تعلیم پڑھایا جائے گا اور اس کے بعد اختصاص (Specialization) کی راہیں اختیار کی جا سکیں گی۔ اِس طرح قومی وحدت کو فروغ حاصل ہوگا اور طبقاتی تعلیم کے فاصلے ختم کیے جا سکیں گے۔ یوں تمام نظام ہائے تعلیم ایک دوسرے کے قریب آ سکتے اور معاشرے کی ترقی اور خوشحالی میں یکساں طور پر مفید ثابت ہو سکتے ہیں، مگر اس طرف مثبت قدم اُٹھانے کی کوئی جرأت نہیں کرتا، اس لیے فرقہ پرستی بھی بڑھتی جا رہی ہے اور معاشرہ طبقات کے اندر تقسیم ہو رہا ہے۔ دینی مضامین کے ساتھ جدید علوم کی تدریس و تعلیم سے مدرسوں کے طلبہ کے ورلڈ ویو میں بڑی وسعت پیدا ہوگی اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے اور مشترک مقاصد کے لیے جدوجہد کا عزم بیدار ہوتا جائے گا۔ مگر ہمارے حکمرانوں کے پاس ان عظیم انقلابی اقدامات کے لیے وقت ہے نہ بصیرت، جبکہ قوم کے مستقبل کا انحصار عصرِ حاضر کی روح سے منور تعلیمی نظام پر ہے۔

☆☆☆

خوش قسمتی سے دینی مدرسوں میں جدید مضامین کی تدریس کا رجحان بتدریج بڑھ رہا ہے اور وہاں کے فارغ التحصیل نوجوان زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو رہے ہیں اور وہاں کے ذہین اور محنتی طلبہ سیکنڈری بورڈز میں پہلی آٹھوں پوزیشنیں لے رہے ہیں۔ بیشتر مدارس میں کمپیوٹر کی تعلیم دی جا رہی ہے اور دسویں جماعت کا نصاب بھی پڑھایا جانے لگا ہے۔ ہماری وفاقی اور صوبائی حکومتیں جو سرکاری اسکولوں کا نظم و نسق چلانے میں ناکام ہیں، اُنہیں دینی مدارس کے منتظمین کا شکر گزار ہونا چاہیے جو دور دراز اور پس ماندہ علاقوں میں بھی علم کا چراغ روشن رکھے ہوئے ہیں اور لاکھوں طلبہ کی کفالت کا بار اُٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ حکومت کی مداخلت ہرگز برداشت نہیں کریں گے، البتہ مشاورت اور معاونت کا ایک آبرومندانہ نظام وضع کیا جا سکتا ہے جو مجمع بحرین ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ تاثر غلط فہمی اور بدگمانی پر مبنی ہے کہ دینی مدرسے طالبان پیدا کر رہے ہیں، البتہ بعض مدرسے اسلامی اقدار کے بجائے اس کے ظواہر کو زیادہ اہمیت دیتے اور تنگ نظری کو پروان چڑھاتے ہیں۔ دراصل طالبان کا دینی علوم اور اسلام کی عظیم روایات سے دور کا بھی تعلق نہیں، وہ زیادہ تر نیم خواندہ ہیں اور ذہنی گمراہی اور معاشرے میں بڑھتی ہوئی ناانصافی اور غیر محتاط فوجی کارروائی کی پیداوار ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت علی ؓ کے دورِ خلافت میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا تھا جس نے معمولی اختلاف پر کفر کے فتوے جاری کرنے اور اپنے عقائد سے اختلاف کرنے والوں کو قتل کرنے کا ہولناک سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ خلیفۂ چہارم اسی گروہ کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ یہ فرقہ خوارج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو ہماری تاریخ کے مختلف ادوار میں بڑے

فتنے اُٹھاتا رہا، لیکن بعد ازاں اُن کے عقائد میں بتدریج صحت مند تبدیلیاں آتی گئیں اور آج کل سلطنت مسقط و عمان میں اُن کی حکومت قائم ہے۔

انگلش میڈیم کے تعلیمی ادارے غیر معمولی رفتار سے پھیلتے اور امیر اور غریب کے درمیان گہری خلیج حائل کرتے جا رہے ہیں جو زیادہ تر بیرونی یونیورسٹیوں کے ساتھ ملحق ہیں۔ اُن کا نصاب قومی نصاب سے یکسر مختلف اور اُن کا ماحول پاکستان کی عمومی فضا سے یکسر متصادم ہے۔ کتابیں باہر سے چھپ کر آتی ہیں اور اُن کے بیشتر اسباق اور مضامین مغربی تہذیب و تاریخ سے ماخوذ ہیں۔ اُن میں اردو زبان کا داخلہ تقریباً ممنوع ہے اور مقامی تہذیبی روایات کا وہاں کوئی عمل دخل نہیں۔ اُن کے تعلیمی اخراجات اس قدر ہوشربا کہ متوسط خاندان کا فرد اُن میں داخلہ نہیں لے سکتا۔ سرمائے کی طاقت سے ہمارا پورا نظام تعلیم یرغمال بنا لیا گیا ہے اور یوں لگتا ہے کہ حکمران اور بالادست اشرافیہ نے تمام شہریوں سے کٹ کر اپنی بستیاں، اپنے تعلیمی ادارے، اپنے ہسپتال اور اپنی تفریح گاہیں آباد کر لی ہیں۔ اس کا عوام کے جذبات اور اُمنگوں سے حقیقی رشتہ کٹ چکا ہے اور حکومت کے اہم اور کلیدی مناصب اِن کی اولاد کی جاگیریں بن چکی ہیں۔ بلاشبہ انگلش میڈیم کے بعض تعلیمی ادارے اعلیٰ خدمات سرانجام دے رہے ہیں، مگر زیادہ تر قومی تشخص اور تہذیبی عظمت کی قتل گاہیں ثابت ہو رہے ہیں۔ برطانیہ میں اے لیول ختم ہو چکا ہے، لیکن ہمارے انگریزی اسکولوں کے طلبہ اس کے حصول میں آج بھی سرگرداں ہیں اور ہر سال بڑی تعداد میں ڈالر ملک سے باہر بھیج رہے ہیں۔ اِن اداروں نے اکیڈمیز کا مافیا اس قدر طاقت ور بنا دیا ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم اُس کے سامنے سرنگوں ہو چکا ہے اور غریبوں کے کروڑوں بچے اپنے مستقبل سے مایوس نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

اِن تعلیمی اداروں کو بھی قومی دھارے میں لانے کا راستہ دریافت کرنا چاہیے تاکہ پورا ملک آگے بڑھے اور قومی شیرازہ بکھرنے کے بجائے اُسے تقویت حاصل ہو۔ ماہرینِ تعلیم کی مشاورت سے ایک ایسی ریگولیٹری اتھارٹی قائم کی جا سکتی ہے جو پرائیویٹ اداروں کے معاملات پر کڑی نگاہ رکھے اور اُنہیں ایسے مضامین کی تدریس کا پابند کرے جن سے طلبہ کا قومی مزاج اور مقاصد کے ساتھ رشتہ قائم رہے اور انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ اُردو زبان اور اسلام اور پاکستان کی تاریخ سے بھی وابستگی قائم ہو جائے۔ اس کے علاوہ مقامی سطح پر ایسی کتابیں تیار کی جائیں جو ہمارے گردوپیش کی عکاسی کریں اور ان اعلیٰ روایات کو فروغ دیں جو ہمارے قومی وجود کا ایک ناگزیر حصہ ہیں۔ ہمارے ماہرینِ تعلیم اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

ارباب سیاست کو ایک ایسا دس سالہ منصوبہ تیار کرنا چاہیے جو پوری قوم کے اندر زیادہ سے زیادہ سپاہِ دانش تیار کرنے کے ساتھ ساتھ کوالٹی ایجوکیشن کو یقینی بنا سکے۔ آنے والے انتخابات میں سیاسی جماعتوں کو اپنے منشور میں تعلیم کو بنیادی حیثیت دینے کے جملہ اقدامات اور قابلِ حصول اہداف کا واضح تعین کرنا ہوگا۔ عوام کو صراحت سے بتانا ہوگا کہ وہ کن کن شعبوں میں اخراجات کم کر کے تعلیم پر جی ڈی پی کا سات فی صد حصہ خرچ کریں گے اور ہر سال اس میں ایک فی صد کا اضافہ کرتے جائیں گے۔ چند سال پہلے ملائیشیا کے سابق وزیراعظم جناب مہاتیر محمد انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انوار حسین صدیقی کی دعوت پر یونیورسٹی آئے تھے اور اُنہوں نے اپنی بے مثل کامیابی کا راز یہ بتایا تھا کہ وہ بیس سال تک تعلیم پر بجٹ کا ۲۵ فی صد حصہ خرچ کرتے رہے تھے۔ اگر پوری قومی قیادت اور معاشرے کے طاقت ور عناصر اس حقیقت کا صحیح احساس کر پائیں کہ ہم کوالٹی ایجوکیشن کے ذریعے پاکستان کو ملائیشیا سے بڑی سماجی اور اقتصادی طاقت بنا سکتے ہیں' تو ہماری قومی ترجیحات میں ایک انقلابی تبدیلی رونما ہوگی اور انیس کروڑ تازہ افکار سے بہرہ مند اور محنت و مشقت میں بے مثل شہری جہالت اور بدامنی کو شکست بھی دیں گے اور اپنے وطن کو صفِ اول میں بھی لے آئیں گے۔

اس مقصد کے لیے ہمیں اپنا پورا نظامِ تعلیم جدید خطوط پر ترتیب دینا اور اساتذہ میں ایک نئی روح پھونکنا ہوگی۔ وہ تمام فرسودہ طور طریق رد کرنا ہوں گے جن میں طلبہ ذہن کو بروئے کار لائے بغیر رٹہ لگا کر زیادہ نمبر حاصل کر لیتے ہیں یا فرفر انگریزی بول کے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما روک دیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے اربابِ اختیار کو نصاب سازی پر غیر معمولی توجہ دینا ہوگی کہ اُسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے قومی آدرشوں کا محافظ بنانا ہوگا۔ ہمارے اسکولوں میں جو کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں' وہ مرکزی فلسفے اور کردار سازی کی صلاحیت سے محروم ہیں اور کسی کو احساس نہیں کہ اس ذہنی ابتری سے قوم کتنی پس ماندہ رہ گئی ہے اور اِس کے کتنے قیمتی سال ضائع ہو چکے ہیں۔ آج استاد کے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں آتا۔ اس کا قومی شعور بے حد ناقص اور اس کو شعور زنگ آلود ہے۔ معاشرے میں سماجی حیثیت ختم ہو جانے سے اس پر نفس غالب آتا جا رہا ہے۔ پرائمری اسکولوں میں وہ اکثر غیر حاضر پایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے طالب علموں کی تعلیمی بنیادیں بڑی کمزور ہیں اور ڈراپ آؤٹ کی شرح خوفناک حد تک زیادہ ہے۔ بلاشبہ پنجاب میں ذہین طلبہ و طالبات کی حوصلہ افزائی سے نوجوانوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا رجحان پرورش پا رہا ہے۔ اس کام کا آغاز ۲۰۰۳ء میں اُردو ڈائجسٹ کے تحت قائم ہونے والے ادارے کاروانِ علم فاؤنڈیشن نے کیا تھا جسے اب

وزیراعلیٰ پنجاب نے نئی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے اور وہ پورے پاکستان کے باصلاحیت نوجوانوں کو ایک لڑی میں پروتے جا رہے ہیں۔ اس متواتر عمل سے پڑھی لکھی قیادت کے آگے آنے کے امکانات بہت روشن ہیں۔

☆☆☆

مینگورہ کی ملالہ پر قاتلانہ حملے اور اس کی زخمی ساتھیوں کے واقعے سے لڑکیوں کی تعلیم کا موضوع بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے اور عجیب و غریب اعداد و شمار سامنے آ رہے ہیں۔ یہ بڑے دکھ اور گہرے افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کے بعض علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم شجرِ ممنوعہ ہے' حالانکہ ایک تعلیم یافتہ عورت پورے خاندان کو علم کی روشنی سے منور کر دیتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں تعلیمِ اطفال اور تعلیم نسواں کی صورتِ حال انتہائی پریشان کن ہے۔ ملک میں ڈھائی کروڑ بچے اسکول نہیں جاتے' اُن میں دو تہائی لڑکیاں ہیں۔ اس خطے کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں پاکستان کی طرف سے اس شرح میں کمی لانے کی کوششیں خاصی محدود ہیں۔ بھارت' نیپال اور بنگلہ دیش نے پچاس فی صد تخفیف کر لی ہے' جبکہ پاکستان صرف سولہ فی صد کمی کر سکا ہے۔ ایک تازہ رپورٹ کے مطابق ۵۹ فی صد لڑکوں کے مقابلے میں صرف ۳۹ فی صد لڑکیاں پرائمری تعلیم مکمل کر پاتی ہیں۔ اُن کے لیے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مواقع اور بھی محدود ہیں۔ اس کی بڑی وجہ لڑکیوں کے لیے ثانوی اسکولوں کی تعداد نہایت کم ہے اور دہشت گردوں نے مالاکنڈ ڈویژن میں ایک سو سے زائد اسکول منہدم کر دیے ہیں۔ بدقسمتی سے تین سال سے قیامت خیز سیلاب سینکڑوں اسکولوں کی تباہی کا باعث بنے ہیں۔ پاکستان کی نجات اور اس کا روشن مستقبل اس میں مضمر ہے کہ حکومت اپنی اوّلین ذمے داری محسوس کرتے ہوئے تعلیم کو ترجیحی بنیادوں پر فروغ دے اور خواتین کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے پر خصوصی توجہ سے کام لے' کیونکہ وہ تعلیم کے میدان میں مردوں پر سبقت لے جا رہی اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں۔ غالباً معاشرہ ایک نئی کروٹ لے رہا ہے اور بلاشبہ ملالہ کی تعلیم لڑکیوں کے لیے عظیم جدوجہد اور دہشت گردوں کے خلاف ناقابلِ تسخیر مزاحمت بلکہ عالمی تحریک میں ڈھلتی جا رہی ہے جس نے پاکستان کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM urdudigest.pk

گینز ورلڈ ریکارڈ

اہل پاکستان نے نئی پہچان پائی

BUILD THE FUTURE OF YOUR DREAMS

Punjab YOUTH FESTIVAL 2012

42,813 ہم آواز پاکستانیوں نے اکٹھے ترانہ پڑھنے کا ریکارڈ قائم کر دکھایا

شاباش نوجوانو

ابھی تو یہ آغاز ہے......

اختر عباس

اتنا جوش، اتنا جذبہ، اس قدر والہانہ پن پاکستان زندہ باد کے نعروں کی گونج لاہور کے ہاکی اسٹیڈیم کی فضاؤں میں پوری طرح رچی ہوئی تھی۔

وزیٹر کاؤنٹر نے 42,813 لوگوں کو اسٹیڈیم کے اندر آتے شمار کیا تھا۔ اس میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ سکولوں کے بچے، ان کے اساتذہ، کالجز کی لڑکیاں، ان کی ٹیچرز، یونیورسٹیوں کے لڑکے، ان کے گروپ، فنکار، موسیقار، بینڈ والے، مصور، انجینئر، ڈاکٹر اور والدین۔

اور عام پاکستانی، ملک کی محبت سے سرشار ایک جشن کا سماں تھا۔

جوش سے بھری کمپیئرنگ کرتے ہوئے ساحر لودھی کی آواز کبھی بھرا جاتی کبھی بیٹھ جاتی۔ نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پھر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

ون... ٹو... تھری... ''ھیر وی گو (Here we go)''

اور اگلے لمحے پورا اسٹیڈیم پاکستان کا قومی ترانہ گا رہا تھا۔ جذبات کا یہ عالم تھا کہ لڑکے لڑکیاں گاتے ہوئے رو رہے اور جذبات میں چہرے اور جسم تنے ہوئے تھے۔

یہ جذبات، یہ جوش کسی کے خلاف نہیں اپنے ہونے، اپنی پہچان بنانے اور اپنے ملک سے محبت کو دنیا سے منوانے کے لیے تھا۔ گینز ورلڈ ریکارڈز کے لیے ریکارڈ کرنے والی ٹیم بڑی حیرت سے ماحول کو دیکھ رہی تھی۔ دنیا میں ایک جگہ، ایک وقت میں لوگوں کے اکٹھا قومی ترانہ پڑھنے کا پہلے سے موجود ریکارڈ ۱۵ ہزار چار سو ۲۳ لوگوں کا تھا۔ جنھوں نے بھارت میں مل کر بندے ماترم پڑھا اور گایا تھا، اور گینز ریکارڈز میں اپنا نام لکھوایا تھا۔

اہل لاہور نیشنل ہاکی اسٹیڈیم میں اس ریکارڈ کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

توڑنے جارہے تھے۔

حکومت پنجاب اپنے ان تھک اور جنونی وزیراعلیٰ کی قیادت میں کئی ہفتوں سے اس کام پر لگی تھی۔ اسکولوں کالجوں میں تیاری ہورہی تھی، اساتذہ اور طلبہ کی موٹیویشن کے بعد لاہور میں اتنا بڑا اکٹھ سب کو حیرت میں مبتلا کیے دیتا تھا۔ ہرطرف رنگ رنگ کے لباسوں میں ملبوس لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں قطار اندر قطار کسی نہ کسی سرگرمی میں مصروف نظر آتی تھیں۔ نغمات، نعرے، باتیں، توقعات اور خدشات کیا ہم کر پائیں گے؟

جب گینز ورلڈ ریکارڈ کرنے والی ٹیم کے نمائندے نے رومن حروف میں لکھا ہوا یہ جملہ پڑھا۔ ''آپ نے دنیا میں سب سے زیادہ لوگوں کے ترانہ پڑھنے کا ریکارڈ توڑ ڈالا ہے۔'' تو اسٹیڈیم میں نہ ختم ہونے والی تالیوں کا ایک ایسا سلسلہ تھا، جس میں لوگوں کے دونوں ہاتھ نہیں روح کی سرشاری بھی شامل تھی۔

میں سوچ رہا تھا یہ قوم برسوں سے ہر محفل میں اپنے لیڈر شپ اور قیادت کو ڈھونڈتی پھرتی ہے، صرف اپنی پہچان پانے۔ ملک وقوم کی کھوئی عزت کو واپس لانے اور دنیا کو ایک نیا چہرہ دکھانے، جو تعلیم یافتہ اعلیٰ کردار، اعلیٰ مزاج اور اعلیٰ اطوار کا حامل ہو، جس کے پیچھے اعتماد سے چلا جاسکتا ہو۔

وزیراعلیٰ شہباز شریف اسٹیڈیم میں 42,813 لوگوں کے اس تاریخی واقعہ کا حصہ بنے موجود تھے۔ یہ ان کا خواب تھا جو انہوں نے رانا مشہود ڈپٹی اسپیکر اور متحرک افسروں کی ٹیم کے ذریعے پورا کر دکھایا تھا۔

گینز ورلڈ ریکارڈ کرنے والی ٹیم ابھی پاکستان میں ہی ہے۔ وہ دنیا کے سب سے بڑے یوتھ فیسٹول میں بننے والے ریکارڈ کی گواہی اور تصدیق کے لیے ہر چھوٹے

۱۲/سالہ بچی مہک نے شطرنج کی بساط کو تیز ترین بچھانے کا عالمی ریکارڈ بنایا

سعدی محمد نے مونچھوں سے ۱۷۰۰/کلو وزنی کوچ کھینچ دکھائی

محمد منشا نے ۳/منٹ ۳۹. ۱۴/سیکنڈز میں ۳/روٹیاں بنا، لگا اور پکا کر ورلڈ ریکارڈ قائم کر دیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

- ★ احمد امین بودلا نے ۳منٹ میں ۶۱۶رنگیں لگا کر ملک کا نام روشن کر دیا۔
- ★ ڈینیل گل اور قمر رضوان نے فٹ بال ہیڈز میں ۴منٹ ۴۶سیکنڈز میں ۳۳۵ہیڈ لگا کر ۱۷۰ہیڈ کا پرانا ریکارڈ توڑ دیا۔
- ★ شہزاد اور سرفراز نے ۳۰سیکنڈز میں ۳۴مینڈک جمپ لگا کر ۳۰جمپس کا ریکارڈ توڑ ڈالا۔
- ★ سب سے کم وقت میں کرکٹ کٹ پہننے کا ریکارڈ جلیل الحسن نے بنایا۔
- ★ نارووال کے نعمان انجم نے ۳۵سیکنڈز میں پلگ وائرنگ کر دکھائی۔

بڑے دعویٰ کو بغور دیکھتے اور ریکارڈ کرتے جا رہے ہیں۔
ریکارڈ قائم کرنے اور توڑنے کا سلسلہ چل نکلا ہے اب تک ۸ریکارڈز منظر عام پر آچکے ہیں۔

وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف نے پنجاب یوتھ فیسٹول کی افتتاحی تقریب میں ''اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم'' گانا گا کر، شرکاء محفل کے جذبات کو گرما دیا اور یوتھ فیسٹول کی اس تقریب میں ہزاروں نوجوانانِ پاکستان سے اپنے وطن کی خاطر کام کرنے اور قربانی دینے کا عہد بھی لیا۔ اپنی محبت اور جذبات کا نہایت ہی جوش و خروش

سے اظہار کیا۔

یوتھ فیسٹول کی اس تقریب میں نہ صرف اہلیانِ لاہور نے جوش و جذبے سے حصہ لیا بلکہ پنجاب کے مختلف علاقوں سے لوگ بڑے جوش و جذبے سے آئے۔ پنجاب یوتھ فیسٹول نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا میں منعقد ہونے والا یوتھ کا سب سے بڑا پروگرام قرار پایا۔

آج یہ نوجوان چھوٹے چھوٹے اچھوتے ریکارڈ قائم کر رہے ہیں۔ کل یہی اور ان جیسے سیکڑوں ہزاروں ملک و قوم کو تعلیم، ٹیکنالوجی، مہارت، تحقیق و جستجو، کھیلوں، خدمت، بزنس، سیاست میں آگے لے جائیں گے۔ آپ نام لیتے جائیے اور اپنے لوگوں اور نوجوانوں کو وہاں اونچائی پر بیٹھے دیکھتے جائیے۔

دعائیں اور آرزوئیں رنگ لائی ہیں۔ اِن تازہ ہوا کے جھونکوں نے ملک سے محبت کرنے اور اس کا نام سربلند کرنے والوں کی امیدوں کے چراغوں کو روشن ہی نہیں کیا، ان کی لَو کو بہت بلند بھی کر دیا ہے۔

ابھی تو یہ آغاز ہے...... اقبال نے بہت پہلے ذرا نم ہو تو مٹی کے بڑا زرخیز ہونے کی نوید سنائی تھی۔

شاباس نوجوانو...... چھولو آسمان!

قبیلۂ اوس کے ایک شیریں نفس، پاکیزہ مزاج
شاداب اطوار، بہادر و جاں سپار سپاہی کا تذکرہ

حضرت خُبیب بن عدی رضی اللہ عنہ

اُس نے پوری یکسوئی اور آسانی سے اپنا دل، معاملہ اور انجام سب کچھ
اُس وقت اللہ کے سپرد کر دیا تھا، جب موت ہم سفر ہونے کو تھی

خالد محمد خالد/ارشاد الرحمن

اور اب......
لوگو!...... اب اس بہادر کے لیے راستہ چھوڑ دو۔
آؤ...... ہر طرف اور ہر مقام سے آؤ۔
آؤ...... ہلکے ہو یا بوجھل، چلے آؤ۔
تیزی کے ساتھ آؤ مگر پورے ادب و احترام اور انکسار و تواضع کے ساتھ آؤ......! اور ہمہ تن گوش ہو جاؤ کہ تم فداکاری و جاں سپاری کا ایسا درس سننے والے ہو جس کی کوئی نظیر نہیں۔

یقیناً وہ بھی ایسے ہی دروس تھے۔ ان کے حسن و جمال کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے مثیل و نظیر سے ایک انفرادیت رکھتے تھے۔ مگر اب آپ فنِ فداکاری و جاں بازی کے ایک نئے استاذ کے سامنے بیٹھے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایسے استاذ...... کہ اگر آپ ان کی جائے شہادت کا تذکرہ سننے سے محروم رہ گئے تو آپ خیرِ کثیر و خیرِ عظیم سے محروم رہ جائیں گے۔

اے ہر قوم و ملک کے صاحبِ عقیدہ لوگو! ہماری طرف توجہ کرو۔

اے ہر وقت اور ہر جگہ بلندیوں سے عشق کرنے والو ہماری طرف دیکھو۔

اے غرور و تکبّر سے بوجھل دماغو! تم بھی توجہ کرو......! تم نے تو دیگر ادیان اور ایمان کے بارے میں بُرے تصورات قائم کر رکھے ہیں۔ تم اپنے دماغوں میں غرور تکبّر رکھو، لیکن ہماری بات بھی سنو۔

آؤ...... اور دیکھو کہ اللہ کا دین...... اسلام کس طرح کے انسان تیار کرتا ہے۔

مشرکین خبیبؓ بن عدی کے ایمان کا سودا کرنے لگے اور ان سے کہنے لگے کہ تم اللہ اور محمدؐ پر جو ایمان رکھتے ہو اگر اس سے انکار کردو گے تو ہم تجھے چھوڑ دیں گے۔ لیکن افسوس اِن عقل کے اندھوں پر......! ان کی کوشش تو اُس آدمی جیسی تھی جو سورج کو پتھر مارنے کی کوشش کر رہا ہو

آؤ...... اور دیکھو کہ اس دین کے ماننے والوں کے اندر کیسی عزتِ نفس، کیسی پختگی، کیسی ثابت قدمی، کیسی اطاعت شعاری اور کیسی فداکاری اور کیسی وفاداری موجود ہے۔ اگر ہم اس بات کو ایک جملہ میں بیان کرنا چاہیں تو کہیں گے کہ کیسی ماورائے عقل عظمت ہے جسے حق پر ایمان و یقین اپنے ماننے والے مخلصین پر پانی کی طرح بہاتا ہے!!

توجہ فرمائیے......!!

کیا آپ اس مصلوب نعش کو دیکھ رہے ہیں؟

اے بنی نوع انسان!...... آج ہمارے درس کا موضوع یہی ہے!

ہاں...... یہی مصلوب جسد ہمارا موضوعِ درس ہے۔

یہی درس اور یہی استاذ ہے۔

اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت اسمِ گرامی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے!

اسے یاد بھی کرلو اور گنگناتے بھی رہو کیونکہ یہ ساری انسانیت کا شرف ہے، وہ انسانیت جو کسی اور دین و مذہب سے وابستہ ہو یا کسی بھی دَور کی کسی بھی نسل سے تعلق رکھتی ہو۔

جی ہاں آبروئے ملت اور تحفظِ دین کی خاطر کٹ مرنے والوں کے لیے ابدی و دائمی درس ہے۔

حضرت خبیبؓ بن عدی مدینہ کے اوس انصاریوں میں سے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ کی طرف ہجرت فرما گئے تو آپؓ متعدد بار دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور اللہ ربّ العالمین پر ایمان لے آئے۔

آپؓ شیریں روح، پاکیزہ نفس، پختہ ایمان اور شاداب ضمیر کے مالک تھے۔

جب غزوۂ بدر میں اسلامی لشکر نے اپنے جھنڈے بلند کیے تو اس موقع پر حضرت خبیبؓ بن عدی ایک جرأت مند سپاہی اور پیش قدم جنگجو تھے۔ ابتدائے معرکہ میں وہ ان مشرکین کے حصار میں آگئے جو اِن کے راستے میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ حضرت خبیبؓ نے انھیں اپنی تلوار کے زور پر بھگا ڈالا اور حارث بن عامر بن نوفل کو زندگی سے محروم کردیا۔

اختتامِ جنگ کے بعد مشرکین کا شکست خوردہ بقیہ لشکر مکہ کی طرف لوٹا تو حارث کے بیٹوں نے اپنے باپ کے مقتل کو معلوم کیا اور اس مسلمان کا نام اچھی طرح ازبر کرلیا جس نے حارث کو میدانِ جنگ میں قتل کیا تھا یعنی خبیبؓ بن عدی کا نام ذہن نشین کرلیا۔

☆☆

مسلمان اپنے دلوں میں ایک نئے معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے ارمان لے کر بدر سے مدینہ کی طرف لوٹے۔ حضرت خبیبؓ ایک عابد و زاہد آدمی تھے۔ وہ صوفیوں جیسی طبیعت اور عابدوں جیسا شوقِ عبادت رکھتے تھے۔ وہ عشق سے لبریز روح کے ساتھ عبادت کی طرف مائل ہوگئے۔ رات کو قیام کرتے، دن کو روزہ رکھتے اور اللہ ربّ العالمین کی تحمید و تقدیس بیان کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے۔

ایک روز رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ قریش کی خفیہ سرگرمیوں کا کھوج لگایا جائے اور نئی جنگ کے لیے ان کی حرکات و سکنات اور تیاری کے بارے میں آگاہی حاصل کی جائے۔ اس مقصد کے لیے آپؐ نے اپنے صحابہ میں سے ۱۰ آدمیوں کا انتخاب کیا اور عاصمؓ بن ثابت کو ان کا امیر مقرر کیا۔ خبیبؓ بن عدی بھی ان میں شامل تھے۔

قافلہ اپنی منزل کی طرف چل پڑا یہاں تک کہ عسفان اور مکہ کے درمیان ایک جگہ پہنچ گیا۔ جس کی خبر ''ھذیل'' کے ایک محلّہ کو ہو گئی جسے ''بنولحیان'' کہا جاتا تھا۔ وہ فوراً اپنے ۱۰۰ ماہر تیراندازوں کے ساتھ اِن کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے اور اِن کا کھوج لگاتے ہوئے ان کے پیچھے چل پڑے۔

اگر بنولحیان کا ایک آدمی وہاں گری کھجور کی بعض گٹھلیاں نہ دیکھتا تو قریب تھا کہ وہ ۱۰ افراد کے اس قافلے کو نہ پاسکتے۔ ایک نے گٹھلی پکڑی اور اہلِ عرب کی سی عجیب قیافہ شناسی کے انداز میں قیافہ لگایا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے بآوازِ بلند یوں مخاطب ہوا ''یہ تو یثرب کی گٹھلی ہے۔ ہمیں ان گٹھلیوں کے ساتھ ساتھ چلتے جانا چاہیے یہاں تک کہ یہ ہمیں ان لوگوں تک پہنچادیں۔''

بنولحیان زمین پر گری ہوئی ان گٹھلیوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے دور سے اپنا گمشدہ شکار دیکھ لیا۔

مسلمانوں کے امیرِ قافلہ حضرت عاصم بن ثابتؓ نے سوچا کہ وہ ہمیں بھگا ماریں گے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے ساتھیوں کو پہاڑ کے اوپر بلند چوٹی پر چڑھ جانے کا حکم دیا۔ اُدھر بنولحیان کے یہ تیرانداز پہاڑ کے قریب پہنچ گئے اور مسلمان دستہ کو دامنِ کوہ میں گھیر لیا، ان کا محاصرہ سخت کردیا اور پیشکش کی کہ تمھیں کچھ نہیں کہا جائے گا لہٰذا اپنا آپ ہمارے حوالے کردو۔

دستہ کے افراد نے اپنے امیر جناب عاصم بن ثابت انصاریؓ کی طرف مشاورتی نظروں سے دیکھا اور اس انتظار میں رہے کہ وہ انھیں کیا حکم دیتے ہیں۔ اتنے میں حضرت عاصمؓ نے فرمایا ''جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، اللہ کی قسم میں تو کسی مشرک کی پناہ میں نہیں جاؤں گا۔ اے اللہ ہمارے بارے میں اپنے نبی کو خبر دے دے۔''

اُدھر بنولحیان کے تیراندازوں نے ان پر تیرو نیزے

قیامِ تعظیمی

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کی نظر میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی محبوب نظر نہ تھا۔ مگر اس فرطِ محبّت کے باوجود مسلمان جب حضور ﷺ کو دیکھتے تو تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوتے۔ ان کو معلوم تھا کہ حضورؐ کو اس قیامِ تعظیمی سے نفرت و کراہت ہے کیونکہ اہلِ عجم اس طرح ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں۔

(مخزنِ اخلاق)

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھینکنے شروع کر دیے۔ مسلمان دستہ کے امیر حضرت عاصمؓ بن ثابت زخمی ہوگئے اور شہادت کے اعزاز سے سرخرو ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے ۳/ساتھی بھی زخمی ہو کر جامِ شہادت نوش کر گئے۔ باقی بچ جانے والے ۳/ آدمیوں سے کافروں نے کہا کہ اگر وہ اپنا آپ ہمارے حوالے کردیں تو پختہ وعدہ ہے کہ انھیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

یہ تینوں آدمی پہاڑ سے نیچے اُتر آئے۔ کفار کے تیرانداز اور نیزہ باز حضرت خبیبؓ اور حضرت زید بن دثنہؓ کے قریب ہوئے اور اپنے ازار بند کھول کر انھیں باندھ لیا۔

تیسرے مسلمان نے اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کرنا اطاعت امیر کی خلاف ورزی سمجھا اور عزم کرلیا کہ وہ بھی موت کو ویسے ہی قبول کرے گا جس طرح عاصمؓ اور ان کے ساتھیوں نے ایمان قبول کیا ہے۔ پھر یہ صاحب بھی اپنی آرزو کے مطابق رتبۂ شہادت پر فائز ہوگئے اور اس طرح ایمان کے اعتبار سے عظیم ترین اور عہد کے اعتبار سے مضبوط ترین یہ آدمی ۸/ کی تعداد کو پہنچ گئے، جنھوں نے اللہ و رسول سے کیے ہوئے عہد کو زندگی کے آخری سانس تک نبھایا۔

حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ نے اپنے بندھن کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اس قدر مضبوط تھے کہ یہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے۔ پھر سرکش و جابر تیرانداز ان دونوں اصحاب کو لے کر مکہ چلے گئے جہاں انھیں مشرکین کے ہاتھوں فروخت کردیا۔

شہر میں ہونے والی نیلامی میں "خبیبؓ" نام پکارا گیا تو مقتولِ بدر حارث بن عامر کے بیٹوں کا ماتھا ٹھنکا۔ انھوں نے ذہن پر دباؤ ڈال کر اس نام کو پرکھا تو ان کے دلوں میں حسد و بغض کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ فوراً اس نام کے شخص کو خریدنے کے لیے بھاگے۔ ان کی اس انتقامی دوڑ میں مکہ کے وہ لوگ بھی شامل ہوگئے جو میدانِ بدر میں اپنے باپ اور سرداروں کو قتل کرا چکے تھے۔

بالآخر یہ سب اِن پر پل پڑے اور انھیں اس مقام کی طرف لے جانے لگے جہاں جا کر وہ ان کے، بلکہ تمام مسلمانوں کے خلاف اپنے حسد کی آگ ٹھنڈی کرنا چاہتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اپنے ہاتھ حضرت خبیبؓ کے ساتھی زید بن دثنہؓ پر ڈالے اور ان کو بھی تشدد سے دوچار کرنے لگے۔

حضرت خبیبؓ نے اپنا دل، اپنا معاملہ اور اپنا انجام، سب کچھ اللہ ربّ العالمین کے حوالے کردیا اور قلبی اطمینان اور نفسی جرأت کے ساتھ عبادت کی طرف متوجہ ہوئے تو ان پر اللہ تعالیٰ کی ایسی سکینت نازل ہوئی جو پتھر پر نازل ہوتی تو اسے پگھلا کر رکھ دیتی اور خوف و ہیبت پر اس کا نزول ہوتا تو اسے معدوم کر ڈالتی۔

دراصل اللہ ان کے ساتھ اور وہ اللہ کے ساتھ تھے۔ اللہ کا ہاتھ ان کے اوپر تھا۔ قریب تھا کہ وہ دستِ قدرت کی انگلیوں کی ٹھنڈک اپنے سینے میں محسوس کرنے لگتے۔

حضرت خبیبؓ، حارث کے گھر میں قید تھے۔ ایک روز حارث کی ایک بیٹی ان کے پاس آئی تو فوراً بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی اور لوگوں کو عجیب و غریب چیز دیکھنے کے لیے پکارنے اور کہنے لگی "اللہ کی قسم! میں نے اسے انگور کا ایک بہت بڑا گچھا پکڑے دیکھا ہے جس سے یہ انگور کھا رہا تھا جبکہ یہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور مکہ میں انگوروں کا موسم بھی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ رزق ہے جو اللہ نے خبیبؓ کو عطا کیا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

یقیناً...... یہ وہ رزق تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح بندے کو عنایت کیا، جس طرح اس سے قبل مریم بنتِ عمران کو عطا کیا تھا جسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

"زکریاؑ جب کبھی اس کے پاس محراب میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا، پوچھتا: مریم یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی "اللہ کے پاس سے آیا ہے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔" (ال عمران: ۳۷)

ایک روز ان مشرکوں نے حضرت خبیبؓ کو ان کے ساتھی حضرت زید بن دثنہؓ کی شہادت کی خبر سنائی۔ ان کا خیال تھا وہ یہ خبر سنا کر ان کے اعصاب شل کردیں گے اور اس طرح اسے دگنی سزا دیں گے لیکن انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ اللہ نے اپنے اس بندے کو اپنا مہمان بنالیا ہے اور اس کے اوپر اپنی رحمت و سکینت نازل فرمادی ہے۔

جب دشمنانِ حق اپنے اس منصوبے میں ناکام ہو کر ناامید اور مایوس ہوگئے تو وہ اس "بہادر" کو پھانسی گھاٹ کی طرف لے چلے۔ وہ انھیں اس مقام کی طرف لے جا رہے تھے جس کا نام "تنعیم" تھا اور یہی حضرت خبیبؓ کا مقتل قرار پایا۔

وہ حضرت خبیبؓ کو لے کر اس مقررہ جگہ پر پہنچے ہی تھے کہ آپؓ نے ان سے ۲/ رکعت نماز ادا کرنے کی مہلت مانگی۔ انھوں نے اس خیال سے اجازت دے دی کہ شاید وہ اس طرح اللہ و رسول اور دین سے کفر کے اعلان کرنے کے لیے کچھ سوچنا چاہتا ہو۔

حضرت خبیبؓ نے بڑے سکون اور خشوع سے باآواز خفی ۲/ رکعت نماز ادا کی۔ اس دوران ان کی روح میں حلاوتِ ایمان یوں مچل رہی تھی کہ ان کا جی چاہ رہا تھا وہ ان رکعات کو لمبا کریں اور پڑھتے ہی رہیں لیکن انھوں نے اپنے قاتلوں کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"اللہ کی قسم! اگر تم یہ گمان نہ کرلو کہ میں موت سے خائف ہوں تو میں ضرور اس نماز کو مزید طویل کرتا۔"

پھر انھوں نے آسمان کی طرف اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے بددعا کی "اے اللہ! ان کو ایک ایک کرکے گن لے اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے مار دے۔"

پھر بڑی جرأت اور اطمینان سے ان کی طرف متوجہ ہو کر یہ اشعار پڑھنے لگے:

"اور جب میں مسلمان کی حیثیت سے قتل ہو رہا ہوں تو مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ کس پہلو پر مجھے موت آتی ہے۔ میں جس پہلو پر بھی مارا جاؤں گا اللہ کی خاطر ہی جان دوں گا اور موت تو اللہ کی خاطر قبول کر رہا ہوں اگر وہ چاہے تو ان ٹکڑے ٹکڑے ہڈیوں میں بھی برکت ڈال دے گا۔"

☆☆

دشمنانِ حق نے کھجور کے تنوں سے ایک بہت بڑی صلیب تیار کی اور اس کے اوپر حضرت خبیبؓ کو باندھ دیا۔ ہر طرف سے مضبوطی کے ساتھ انھیں باندھا ہوا ہے اور مشرک دشمنی کا بدترین مظاہرہ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ نیزہ باز اٹھتے اور اپنے نیزے پھینکنے کے لیے نیزہ بدست کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سُولی پر لٹکے بہادر کے ساتھ بہیمیت کا یہ بدترین مظاہرہ بڑے سکون سے جاری ہونے والا ہے۔ اس کے باوجود یہ بہادر اپنی آنکھیں بند نہیں کرتا۔ ان کے چہرے پر عجیب نورانی سکینت نازل ہو رہی ہے۔ نیزے ان کے بدن میں پیوست ہونے اور تلواریں ان کی بوٹیاں اُڑانے کے لیے تیار ہیں۔

اس موقع پر قریش کا ایک سردار اِن کے قریب آتا ہے اور ان سے کہتا ہے "کیا تو چاہتا ہے کہ اس وقت محمدؐ تیری جگہ ہو اور تو صحیح سلامت اپنے اہلِ خانہ میں ہو؟"

حضرت خبیبؓ نے لمحہ بھر کا توقف کیے بغیر اپنے قاتلوں کو مخاطب کرکے باآواز بلند کہا:

"اللہ کی قسم! مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک کانٹا چبھے اور میں اپنے اہل و اولاد میں رہوں اور دنیا کی نعمت و سلامتی مجھے میسر ہو۔"

یہی وہ عظیم اور غضب ناک الفاظ ہیں جو حضرت خبیبؓ کے ساتھی حضرت زید بن دثنہؓ نے بھی اپنی شہادت کے موقع پر فرمائے تھے۔ کفر کے ایوانوں میں لرزہ طاری کر دینے والے یہ ہیبت ناک الفاظ کل حضرت زیدؓ نے کہے تھے اور آج حضرت خبیبؓ کہہ رہے تھے۔ ان الفاظ نے ابوسفیان کو یہ کہنے پر مجبور کردیا تھا ''اللہ کی قسم! میں نے کسی سے محبّت کرنے والا کوئی آدمی نہیں دیکھا جس طرح محمدؐ کے ساتھی محمدؐ سے محبّت کرتے ہیں۔''

حضرت خبیبؓ کے یہ الفاظ گویا نیزوں اور تلواروں کو اپنا کام کر دکھانے کی اجازت دینا تھا اور یہی ہوا کہ یہ نیزے اور تلواریں وحشیانہ انداز میں ان کے جسم پر برس پڑیں۔

اس مقتل کے قریب آسمان پر پرندے اُڑ رہے تھے۔ گویا وہ اس انتظار میں تھے کہ یہ قصاب اپنے کام سے فارغ ہوں تو ہم اپنا کام شروع کریں۔ لیکن یہ چیل اور گدھ چیختے اور ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں، اپنی چونچیں ایک دوسرے کے قریب کرتے ہیں گویا یہ آپس میں کوئی سرگوشی اور مشاورت کر رہے ہوں۔ پھر اچانک اُڑتے اور فضا میں بکھر کر دور دور چلے جاتے ہیں۔ شاید ان پرندوں نے صالح اور فرمانبردار آدمی کے جسم سے آنے والی خوشبو کو محسوس کرلیا تھا اور شرمندہ ہوگئے تھے کہ اس پاکیزہ جسد سے کوئی بوٹی نوچ کھائیں۔

پرندوں کا یہ غول حضرت خبیبؓ کے جسد کو چھوئے بغیر دور فضا میں جا چھپا اور مشرکین ظلم و شقاوت کا بدترین مظاہرہ کرنے کے بعد واپس مکہ میں اپنے حسد بھرے گھروں میں آگئے اور حضرت خبیبؓ کا جسدِ شہید اس حال میں وہیں چھوڑ آئے کہ نیزہ بازوں اور تلوارزنوں کی ایک جماعت اس کی نگرانی پر مامور تھی تاکہ مسلمان اس کو اتار کر لے نہ جائیں۔

جس وقت ان لوگوں نے حضرت خبیبؓ کو باندھ کر صلیب پر لٹکایا تھا تو حضرت خبیبؓ نے آسمان کی طرف رُخ کرکے گڑگڑا کر اپنے رب سے عرض کیا تھا:

''اے اللہ! ہم نے تو تیرے رسول ﷺ کا پیغام پہنچا دیا۔ اب تو بھی اپنے رسولؐ تک اس کی خبر پہنچا دے جو ہمارے ساتھ ہوا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے آپؓ کی دعا قبول فرمائی۔ رسولؐ اللہ مدینہ میں تشریف فرما تھے کہ آپؐ کے اندر یہ شدید احساس پیدا ہوا کہ آپؐ کے صحابہ مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آپؐ کو ان میں سے ایک صحابی کا جسد سُولی پر لٹکا ہوا بھی دکھایا گیا۔ آپؐ نے فوراً حضرت مقدادؓ بن عمرو اور زبیرؓ بن عوام کو بلایا اور ان آدمیوں کی خبر کے لیے روانہ کردیا۔ دونوں جوانمرد اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور نہایت تیز رفتاری سے چل پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیا اور انھوں نے اپنے ساتھی حضرت خبیبؓ کو صلیب سے نیچے اتار لیا۔ آج تک کسی کو معلوم نہیں کہ حضرت خبیبؓ کی قبر کہاں ہے۔ شاید یہی ان کے زیادہ شایانِ شان تھا کہ وہ تاریخ کے تذکرے اور زندگی کے ضمیر میں باقی رہیں تو انھیں ''تختۂ دار پر موجود جوانمردؓ'' کے طور پر ہی یاد کیا جائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔
درود وسلام ہو انبیاء کے سردار حضرت محمد ﷺ اور ان کی آل واصحاب پر

امابعد۔ میں تمھیں ایک خط لکھ رہا ہوں جس میں نہ تو ہدایت دینے میں کوئی کمی کروں گا اور نہ نصیحت کے معاملہ میں بخل کروں گا۔ خدائے قدوس کا شکر ادا کرتے ہوئے اور رسولؐ اللہ کی تعظیم کرتے ہوئے یہ کام انجام دوں گا۔ لہٰذا اس پر پوری عقل وخرد کے ساتھ غور کرنا۔ اپنی آنکھوں، کانوں، دل و دماغ کو پوری طرح متوجہ کرنا، بار بار قائل کرنا اور اپنے ذہن کو دوسری طرف مبذول نہ کرنا بلکہ اسے پوری طرح حاضر رکھنا کیونکہ دنیا میں اسی سے اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور آخرت میں بہترین اجر ملے گا۔

موت اور اس کے شدائد ومشکلات کو یاد رکھو اور جو کچھ قیامت کے دن پیش آنے والا ہے مثلاً خدا کے حضور پیشی، حساب وکتاب اور ہمیشہ کے لیے جنت یا دوزخ، اسے اپنے پیش نظر رکھو اور خدا کے حضور جانے سے پہلے ایسے اعمال سے مسلح ہوجاؤ جن سے ان مشکلات وشدائد سے نمٹا جاسکے اور امن میں آسانی پیدا کی جاسکے۔ اگر تم ان لوگوں کو دیکھو جن پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہوگی اور جو مختلف عذابوں میں مبتلا ہوں گے اور ان سے شدید انتقام لیا جارہا ہوگا اور دوزخ میں ان کی چیخ پکار کو سنو، ان کے مسخ شدہ چہروں، غموں کی طوالت اور منہ کے بل گھسیٹے جانے کو دیکھو، جب کہ وہ نہ تو دیکھ سکتے ہوں گے اور نہ سن سکتے ہوں گے اور بس ہلاکت، ہلاکت ہی پکار رہے ہوں گے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ خداوند کریم ان سے رخ موڑے رہے گا اور ان کی ہر قسم کی امیدیں ختم ہوجائیں گی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں کہا جائے:

چُپ رہو اور اس میں پڑے رہو۔ (المومنون: ۱۰۸)

تو دنیا کی کوئی چیز تمھیں معظم بالشان اور قابل قدر نظر نہ آئے۔ اگر فی الواقع تم ان تمام چیزوں سے نجات اور ان ہولناکیوں سے امن چاہتے ہو اور یہ کہ اگر تم ان چیزوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے دنیا ومافیہا بھی خرچ کرڈالو تو تمھیں یہ سودا سستا نظر آئے۔

اور ان کے مقابلہ میں اللہ کے فرماں بردار لوگوں کو، ان کی قدر ومنزلت کو دیکھو تو وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیر اور تمھاری نگاہ میں عظیم المرتبت ہیں تمھارے نزدیک کم درجہ کی ہوجائیں اور موت کے آنے سے پہلے اپنے نفس کا وقتاً فوقتاً محاسبہ کرتے رہو۔ قیامت قائم ہونے کے بعد تم اپنے آپ کو اس ہولناکی سے نہ بچا سکو گے۔ رات اور دن میں سے کچھ حصہ اپنی ذات کے لیے مخصوص کرو۔ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا ہے ”جو شخص دن میں ۱۲ر رکعت نوافل پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بنا دے گا۔“ اور رات کو ۸ر رکعتیں (تہجد) پڑھو اور ان میں قرآن کا کچھ حصہ ضرور پڑھو۔ رکوع وسجود طویل ہونا چاہیے اور ہر رکعت کا پورا پورا حق ادا کرو اور ہر ماہ کی ۱۳/۱۴/۱۵ر تاریخ کو روزہ رکھو کیونکہ رسولؐ اللہ نے فرمایا جس نے ہر ماہ ان ۳ر دنوں میں روزہ رکھا وہ ایسا ہے گویا وہ ہمیشہ روزے سے رہا اور سال گزرنے کے بعد اپنے مال کی خوشی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی صدقہ کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک اسے مستحقین یعنی فقراء، مساکین، زکوٰۃ جمع کرنے والے مولفۃ القلوب، غلام، مقروض، فی سبیل اللہ مسافر میں تقسیم نہیں کردیا جاتا۔ (التوبہ: ٦)

حلال مال سے حج کرو

اپنے پاک اور حلال مال میں سے حج کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ طیب اور حلال ہی کو پسند کرتا ہے اور ارشاد ہے:

ترجمہ: پھر جو کوئی جلدی کرکے دو ہی دن میں واپس ہوگیا تو کوئی حرج نہیں اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر پلٹا تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ (البقرۃ: ۲۰۳)

اللہ کی نافرمانی سے روکو

اللہ کی اطاعت کا حکم دو اور اس کی نافرمانی سے روکو۔

وہ قومیں ہلاک ہوئیں جنھوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ چھوڑ دیا اور خصوصاً پیروں اور مولویوں نے یہ کام چھوڑ دیا۔“ لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اس سے پہلے ادا کرو کہ تم پر وہ عذاب آجائے جو پہلی قوموں پر آیا ہے اور اس فریضہ کی ادائی سے نہ تو موت مؤخر ہوتی ہے اور نہ رزق میں کمی آتی ہے۔

اپنے تابع لوگوں سے حسن سلوک کرو

ان لوگوں کے ساتھ نہایت ہی حسن سلوک سے پیش آؤ جو تمھارے تابع اور تمھارے خادم ہیں اور جن پر اللہ نے تمھیں فضیلت دی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک موقع پر حضورؐ نے نماز سے فارغ ہوکر مقتدیوں کی طرف رخ پھیر کر فرمایا: ”آسمان چرچرا رہا ہے اور ایسے ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس لیے کہ ۴ر انگلیوں کے برابر بھی ایسی کوئی جگہ باقی نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ سجدہ ریز نہ ہو۔ پس جس آدمی کا کوئی غلام ہو تو اسے چاہیے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اور اگر اسے وہ ناپسند ہو تو بدل لے، بدسلوکی نہ کرے۔ اے لوگو! اللہ کی مخلوق کو تنگ نہ کرو۔“

اہل وعیال کی نگرانی سے لاپروائی

جن لوگوں کی تربیت اور نگرانی تمھارے ذمہ ہو اسے پورا کرو کیونکہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اپنے اہل وعیال کی نگرانی سے لاپروائی نہ برتو اور اللہ سے انھیں ڈراؤ۔

نوحؑ کے ۲ر احکام

لوگوں کے سامنے مت جھکو اور انھیں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی طرف راغب کرو۔ ان سے نرمی سے پیش آؤ کیونکہ حضورؐ نے فرمایا کہ تمھیں نوح علیہ السلام کی ایک وصیت بتاتا ہوں ”نوحؑ نے فرمایا کہ لوگو! میں تمھیں ۲ر چیزوں کا حکم دیتا اور ۲ر چیزوں سے روکتا ہوں۔ میں تمھیں ایک تو اس بات کا حکم دیتا ہوں کہ لا الہ الا اللہ پڑھا کرو کیونکہ اگر اسے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھو اور دوسرے یہ کہ تم سبحان اللہ وبحمدہٖ پڑھا کرو کیونکہ یہ عبادت ہے اور اسی سے رزق کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ دونوں کلمات اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں اپنے پڑھنے والے کی رسائی پیدا کردیتے ہیں اور میں تمھیں دو چیزوں سے روکتا ہوں۔ ایک شرک سے دوسرے تکبّر سے کیونکہ یہ دونوں برائیاں ان کے مرتکب کے درمیان اور اللہ سبحانہٗ کے درمیان حجابات قائم کردیتی ہیں۔“ اس پر نوح علیہ السلام سے کسی نے کہا کہ کیا بہترین سواری پر سوار ہونا، بہترین اور خوبصورت کپڑا پہننا اور لوگوں کو کھانا کھلانا تکبّر ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ نہیں، بلکہ تکبّر یہ ہے کہ تم حق کو مٹاؤ اور لوگوں کو ذلیل کرو۔

اپنی شان بیان کرنے سے بچو

تکبّر اور اپنی شان بیان کرنے سے بچو کیونکہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ناپسند کرتا ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ متکبّرین کو قیامت کے دن چیونٹیوں کی شکل میں اٹھایا جائے گا جنھیں لوگ اُن کے تکبّر کی وجہ سے روندیں گے۔ ان لوگوں پر اعتماد نہ کرو جو خدا کا خوف نہیں رکھتے کیونکہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دین کے معاملہ میں ان لوگوں سے مشورہ کرو جو خدا سے ڈرتے ہیں۔ برے ساتھی سے بچو کیونکہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ نبی ہو یا خلیفہ اس کے ۲ر قسم کے ساتھی ہوتے ہیں ایک وہ جو انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتے اور برے کاموں سے روکتے ہیں اور دوسرے وہ جو فساد وخرابی پیدا کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ جو شخص برے ساتھی اور برے خیالات سے بچ گیا گویا کہ وہ بچ گیا۔ نیک اور متقی لوگوں کے ساتھ دل سے محبت اور مہمان کی عزت کرو کیونکہ تم پر ان کی عزت کرنا فرض ہے اور پڑوسی کے حق کی نگہداشت کرو۔ اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور اسے تکلیف نہ دو کیونکہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور یومِ آخرت پر یقین رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اچھی بات کرے ورنہ خاموش رہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

فضول باتوں سے پرہیز کرو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا میں تمھیں فضول قسم کی باتوں سے ڈراتا ہوں۔ جو شخص تمھارے ساتھ دوستی رکھے اس کے ساتھ تم دوستی رکھو اور اس کا حق ادا کرو۔ اللہ کے حقوق کے ماسوا دوسرے معاملات میں غصہ نہ کرو۔ جب تم بھلائی کا حکم دو گے تو اس کے نتائج سامنے آجائیں گے اور جب تم بُرائی سے روکو گے تو اس کے نتائج بھی سامنے آجائیں گے۔ ان معاملات کو چھوڑ دو جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا ”آدمی کے حسن اسلام کی علامت یہ ہے کہ وہ بے فائدہ باتوں کو ترک کردے۔“

دنیا و آخرت کی افضل باتیں

جو تم سے کٹے اس سے جڑو۔ جو تم پر ظلم کرے اسے معاف کردو اور جو تمھیں محروم کرے اسے دو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ تینوں باتیں دنیا اور آخرت میں افضل ترین اخلاق کی علامت ہیں۔ زیادہ مت ہنسو کیونکہ زیادہ ہنسنا بے وقوفی کی علامت ہے اور حضور ﷺ تبسم فرمایا کرتے تھے۔ مزاح نہ کرو اس سے تم ذلیل ہو جاؤ گے۔ اس معاملہ میں حضور ﷺ نے فرمایا ”میں مزاح ضرور کرتا ہوں لیکن جھوٹ نہیں کہتا حق بات کہتا ہوں۔“

مختصر بولو

جس بات سے تم دوسروں کو روک رہے ہو اسے خود نہ کرو۔ جب بولو تو مختصر بات کرو کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ زبان کی وجہ سے لوگوں کو آگ میں اوندھا ڈالا جائے گا۔ تکبّر سے نہیں بلکہ نرمی اور خوشدلی سے پیش آؤ۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت وہ ہیں جو نہایت ہی نرم، خوش خلق سہل المزاج اور ملنسار ہوں۔ ایسے کاموں کو چھپ کر بھی نہ کرو جن کا اعلانیہ کرنا تمھارے لیے اچھا نہیں ہے۔

وہاں نہ جاؤ جہاں بدنامی کا ڈر ہو

ایسے کام کرنے سے پرہیز کرو جن کے معاملہ میں دین و دنیا میں تہمت کا اندیشہ ہو۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ ایسی جگہ

امام مالک

فقہی مسالک کے دوسرے امام مالکؒ ابن انس ابن مالک ابن امر ۹۳ھ میں ذی مروہ میں پیدا ہوئے۔ آپ تبع تابعین میں شامل ہیں۔ آپ طویل القامت، سرخ و سفید رنگت والے اور نہایت جسیم تھے۔ داڑھی بہت بڑی اور آنکھیں نیلی تھیں۔ عام طور پر خوبصورت سفید کپڑے زیب تن فرماتے۔

آپؒ اپنے زمانے کے کئی مشہور تابعی محدثین اور فقہا سے فیض یاب ہوئے۔ صرف ۱۷سال کی عمر میں اپنی ذہانت، کوشش، محنت، اور حصول علم کی سچی لگن کی وجہ سے آپ کے اساتذہ نے آپ کو فتویٰ دینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ آپ کے اساتذہ میں نافعؒ، عبدالرحمن ابنِ ہرمز، سفیان ابنِ سلیم، ابنِ شہاب زُہری، عامر ابنِ عبداللہ ابن زبیر کے علاوہ اس زمانے کے کئی جید علما شامل ہیں۔

آپ کا حلقۂ درس وسیع تھا۔ درس حدیث کے دوران میں آپؒ کی صاحبزادی فاطمہ جو موطا کی حافظہ تھی، دروازے کے پیچھے کھڑی رہتی۔ اگر کوئی طالب علم حدیث غلط پڑھتا تو وہ دروازے پر دستک دیتی، اور امام مالکؒ فوراً اس طالب علم کی تصحیح فرمادیتے۔ بیٹی فاطمہ کے علاوہ آپ کے ۲ر بیٹے، جن کے نام یحییٰ اور محمد تھے۔

آپ ۲۲ر دن تک صاحب فراش رہے۔ آپؒ نے ۱۴ر ربیع الاول ۱۷۹ھ کو اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔ ابن کنانہ اور ابنِ زبیر نے غسل دیا۔ امیر مدینہ عبدالعزیز ابن محمد نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

ترمذی، ذہبی اور دیگر کے مطابق حضورؐ نے فرمایا ”لوگ جلد ہی علم کی تلاش میں اونٹوں کی پیٹھوں کو پیٹتے ہوئے علم کی تلاش میں نکلیں گے اور ان کو مدینہ کے عالم کے علاوہ کوئی نہ ملے گا“۔ کئی علماء کی رائے میں وہ عالم امام مالک ہی ہیں۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ امام شافعیؒ جیسے عظیم عالم اور فقیہہ نے کہا کہ اللہ کے دین کے معاملے میں مجھ پر

نہ جائے جہاں بدنامی کا اندیشہ ہو۔ لوگوں کے پاس اپنی ضرورتیں بہت کم لے جاؤ کیونکہ اس میں ذلت و رسوائی ہے اور مجھے یہ معلوم ہوا ہے حضور ﷺ نے ایک آدمی سے فرمایا کہ لوگوں سے طلب حاجت میں گریز کرو کیونکہ ایسا کرنے سے سبکی ہوتی ہے اور یہ کہ تمھارا قیام گھر میں یا مسجد میں ہو اور فرمایا کہ مسجدیں پرہیزگاروں کے گھر ہیں۔ اپنے گھر سے بہت زیادہ ضروری کام کے لیے نکلو ورنہ گھر ہی میں رہو۔ کیونکہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ۶ر مقامات ہیں جہاں مسلمان اللہ تعالیٰ کی ضمانت میں ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں، اللہ کے گھر میں (مساجد میں)، بیمار پُرسی کی حالت میں، جمعہ یا جنازہ میں اور ایسے امام عادل کے پاس جس کا عزت و اکرام ہوتا ہو۔

خوش خلقی سے پیش آؤ

اپنے گھر والوں اور ان لوگوں کے ساتھ جو تمھاری عزت کرتے ہوں خوش خلقی سے پیش آؤ کیونکہ اسی طریقے میں رضائے الٰہی، اہلِ خانہ کے درمیان محبت، مال میں کثرت اور مرنے میں آسانی ہے۔ بعض اہل علم صحابہ کرامؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آؤ۔ ان کی گالیوں سے، غیبت سے بچو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ترجمہ: کہ کیا کوئی شخص یہ پسند کرے گا اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ (حجرات۔۱۲)

کمترین اور آوارہ سے دور رہو

مزید فرمایا کہ لوگوں کو گالیاں مت دو۔ کمترین، آوارہ اور فحش قسم کے لوگوں سے دُور رہو کیونکہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ”لوگوں کو ان کے دوستوں اور ہم نشینوں سے پہچانو کیونکہ آدمی اپنے جیسوں کے ساتھ دوستی رکھتا ہے۔ یتیم پر رحم کرو، شفقت اور مہربانی سے پیش آؤ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے رضائے الٰہی کے لیے یتیم کی کفالت کی جنت میں، میں اور وہ اس طرح ہوں گے جیسے ہاتھ کی یہ ۲ر انگلیاں ساتھ ساتھ ہیں (آپؐ نے اپنی ۲ر انگلیاں ملا کر ان کی جانب

امام مالکؒ سے زیادہ کسی کا احسان نہیں۔ مالکؒ راہنما ستارہ ہیں۔ عبداللہ ابنِ وہاب فرماتے ہیں کہ جس حافظ حدیث کا فقہ میں کوئی امام نہیں، وہ بھٹکا ہوا ہے اور اگر اللہ نے ہمیں امام مالکؒ اور اللیثؒ کی راہنمائی عطا نہ کی ہوتی تو میں بھٹکا ہوا ہوتا۔“

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس وقت تک فتویٰ نہیں دیا جب تک کہ ۷۰ علماء نے میری تصدیق و توثیق نہ کی۔ آپ نے ۸ر سال تک ابن ہرمزؒ کی خدمت میں صبح سے شام تک حاضری دی۔ فرمایا جب میں شیخ ہرمزؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ خدام کو دروازہ بند کرنے کا حکم دیتے۔ پھر وہ امت کے متعلق گفتگو کرتے اور اتنا روتے کہ ان کی ریشِ مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

آپؒ کے شاگردوں کی تعداد ۱۳۰۰ر سے زائد ہے۔ جن میں حضرت سفیان ثوریؒ، امام شافعیؒ، ابن قثیمؒ، ابو عاصمؒ، عبدالرحمن ابن مہدی کے علاوہ بہت سے یکتائے روزگار علما و فقہا اور محدثین شامل ہیں۔ آپ کے کئی اساتذہ بھی آپ کے درس حدیث میں شریک ہوتے تھے۔ قاضی عیاضؒ کے مطابق آپؒ نے ۹ر کتب تصنیف کیں جن میں الموطا کو اس زمانے میں قرآن کے بعد سب سے اہم کتاب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ خلیفہ ہارون الرشید نے حکم دیا تھا کہ موطا کی ایک جلد کعبہ میں رکھی جائے اور تمام قضاۃ کو حکم دیا کہ فقہی مسائل میں فیصلہ دینے سے قبل موطا کا مطالعہ کریں۔

آپ کے فقہی پیروؤں کی بڑی تعداد شمالی افریقہ، اندلس، مصر، شام، یمن، سوڈان، عراق اور خراسان میں آباد ہے۔ امام شافعیؒ کے بقول قرآن کے بعد دنیا میں سب سے معتبر کتاب موطا امام مالکؒ ہے۔ جسے امامؒ نے لکھنے کے بعد مدینہ کے ۷۰ فقہا کو دکھایا اور سب نے اس کی توثیق کی۔ (اس وقت تک صحیح بخاری تصنیف نہیں ہوئی تھی)

WWW.PAKSOCIETY.COM

اشارہ فرمایا۔) مسافر کے حق کو پہچانو اور اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی وصیت یاد کرو۔ مظلوم کی حتی الوسع امداد کرو اور ظالم کے ہاتھ پکڑو اور اسے ظلم کرنے سے روکو، کیونکہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص مظلوم کے ساتھ اس لیے چلتا ہے کہ اسے اس کا حق دلوائے، اللہ تعالیٰ اسے اس دن ثابت قدم رکھے گا جس دن قدم پھسلیں گے۔ خواہشات کے پیچھے چلنے سے بچو کیونکہ مجھے حضور ﷺ سے یہ بات پہنچی ہے کہ تم پر ۲/ چیزوں کا خطرہ محسوس کرتا ہوں۔ ایک خواہشات کے پیچھے چلنے کا اور دوسری لمبی امیدیں رکھنے کا۔

اپنی طرف سے لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لو اور ان پر زیادتی نہ کرو کیونکہ مجھے حضور ﷺ سے یہ بات پہنچی ہے کہ ۳/ عمل سب سے اچھے ہیں۔ ہر وقت خدا کو یاد کرنا، جائیداد اور مال سے بھائیوں کے ساتھ معاونت اور غم خواری کرنا، اپنی طرف سے عدل و انصاف کی کوشش کرنا۔

اللہ کی حرام کردہ بات سے آنکھیں بند رکھو

اللہ کی حرام کی ہوئی ہر بات سے اپنی آنکھیں بند رکھو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ محارم پر اگر ایک مرتبہ نظر پڑ جائے تو کوئی بات نہیں لیکن دوبارہ نظر نہیں پڑنی چاہیے۔ مضرت رساں اور ناپاک کھانے پینے اور لباس سے بچو کیونکہ ان کے اثرات کبھی زائل نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

جو کسی کا حق کھاتا ہے وہ آگ کھاتا ہے

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے حق میں سے جتنا کچھ کھاتا ہے اللہ تعالیٰ اتنی ہی اسے آگ کھلائے گا اور جو اپنے مسلمان بھائی کو دنیا میں بدنام کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے بدنام کرے گا اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے حصہ کا کوئی لباس پہنتا ہے اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن آگ کا لباس پہنائے گا۔ جو شخص تمہارے پاس کوئی عذر پیش کرے اس کا عذر قبول کرو کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان بھا دوسرے مسلمان بھائی کے پاس کوئی عذر لے کر جاتا اور وہ اسے قبول نہیں کرتا تو اس پر اتنا بوجھ ہوگا جتنا کہ ٹیکس وصول کرنے والے پر ہوتا ہے۔ ہر شریکِ کار کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے تمہارا ہاتھ اوپر ہونا چاہیے کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

نیک لوگوں کے ساتھ دوستی رکھو کیونکہ وہ اللہ کے معاملے میں تمہارے ساتھ تعاون کریں گے اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''جو بھی ۲/ آدمی اللہ کے لیے دوستی رکھتے ہیں تو ان میں زیادہ محبت رکھے گا وہ افضل ہوگا۔''

احسان کرو

''ایک آدمی آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ یارسول اللہ میرے رشتہ دار ہیں۔ میں معاف کرتا ہوں مگر وہ مجھ پر ظلم کرتے ہیں۔ میں جڑنے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہ قطع رحمی کرتے ہیں۔ میں احسان کرتا ہوں مگر وہ میرے ساتھ برائی کرتے ہیں۔ تو کیا جواباً میں بھی ایسا ہی کروں آپؐ نے جواب دیا کہ سب کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ ظلم کریں تو تم ان کے ساتھ احسان کرو کیونکہ اس طرح اللہ کی طرف سے تمھیں امداد ملتی رہے گی۔''

مجبور، مسکین اور محتاج مسافر پر رحم کرو اور جتنا ہو سکے ان کی امداد کرو۔ عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ ہر اچھا کام صدقہ ہے۔ سائل پر رحم کرو اور اسے اپنے دروازے سے اچھے طریقے سے لوٹاؤ یا کچھ دے کر یا پھر اچھے انداز میں معذرت کر کے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ سائل کی مذمت اپنے سے اس طرح دور کرو جس طرح پرندے سر کھانے میں سے نکال پھینکا جاتا ہے۔ بھلائی اس آدمی کے ساتھ بھی کرو جسے تم جانتے ہو اور اس کے ساتھ بھی جسے نہیں جانتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''بھلائی کے کام کرتے رہو چاہے یہ کام کسی پانی لینے والے کے برتن میں اپنے ڈول سے پانی ہی ڈال کر کیوں نہ ہو۔'' جو بھلائی کا کام بھی کرو اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرو۔

ریاء سے بچو کیونکہ اس آدمی کا عمل خدا کے ہاں مقبولیت نہیں رکھتا جس کی نیت دکھلاوے کی ہو۔ اگر تم یہ کر سکو کہ تمہارے نیک عمل کا علم صرف تمھیں اور تمہارے خدا کو ہو تو ایسا ضرور کرو۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش و خرم رکھے گا جس نے میری بات سنی اور اسے یاد رکھا اور دوسروں تک پہنچایا، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غیر حاضر، حاضرین سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں اور فقہی جزئیات کو جاننے والے بعض ایسے ہوتے ہیں جو فقیہہ نہیں ہوتے۔''

بدخلقی سے بچو کیونکہ بالآخر یہ خدا کی نافرمانی کی طرف لے جاتی ہے اور مجھے حضور ﷺ سے یہ بات پہنچی ہے کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو بہترین اخلاق کا مالک ہو۔ جب خلوت میں خدا کی عبادت کرو تو نہایت ہی خشوع و خضوع سے کرو کیونکہ حضور ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ آپؐ کے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہنے لگے کہ آپؐ کے رب نے آپ کو سلام کہا اور فرمایا ہے کہ اگر آپؐ چاہیں تو آپ کو فرشتہ نبی بنایا جائے اور اگر چاہیں تو انسان نبی بنایا جائے۔ جبریل علیہ السلام نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپؐ تواضع کو اپنا وطیرہ بنائیں چنانچہ زندگی بھر حضور ﷺ نے کبھی ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا۔

لوگوں پر ظلم نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے اوپر مسلط کرے گا اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ صحابہ کرام میں سے کسی نے کہا ہے کہ کسی شخص پر ظلم کرنا جس کی دادرسی کے لیے وہ اللہ تعالیٰ سے مدد کا طالب ہو جائے سب سے بڑھ کر اپنی ذات پر ظلم کرنا ہے۔ جھوٹ سے بچو، کیونکہ اس کی سزا بہت جلد ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضور ﷺ نے فرمایا جس بھلائی کا بدلہ بہت جلد ملتا ہے وہ صلہ رحمی ہے اور جس برائی کا بدلہ ملتا ہے وہ جھوٹی قسم ہے اور اس سے گھر برباد ہو جاتے ہیں۔

مسلمان آدمی کا دل ۳/ چیزوں سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لیے نیک اعمال کی لگن، عادل بادشاہ کی خیرخواہی اور عام مسلمانوں کی خیرخواہی کیونکہ یہی تینوں دعوت و تبلیغ کا مدار ہیں۔

غیراللہ کی قسم نہ کھاؤ، کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اپنے آباؤ اجداد کی قسم نہ کھاؤ۔ خدا کی قسم کھاؤ یا پھر خاموش رہو۔ اور ہر بات پر بھی قسم مت کھاؤ کیونکہ اللہ نے فرمایا:

ترجمہ: اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بنالو۔ (البقرۃ: ۲۲۴)

لوگوں پر رحم کرو، اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے گا۔ کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ تعالیٰ رحم نہیں کرتا۔ تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو پسند کرو۔ اللہ تعالیٰ تمھیں پسند کرے گا اور لوگوں کے نزدیک تمھیں محبوب بنا دے گا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا:

ترجمہ: لوگوں سے کہو کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت رکھتے ہو تو میری اطاعت کرو اللہ تعالیٰ تمھیں محبوب رکھے گا۔ (آل عمران: ۳۱)

نیز حضور ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے نماز کو میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنایا ہے۔'' بعض علماء نے کہا ہے کہ کوئی بھی شخص جب ایک اچھے راز کو راز رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے نیکیوں کی چادر اوڑھا دیتا ہے اور اسی طرح جب کوئی شخص برے راز کو راز نہیں رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے برائیوں کی چادر میں لپیٹ دیتا ہے۔ دورانِ گفتگو، مجلس میں بیٹھتے وقت اور سوار ہوتے وقت عزت و وقار کا خیال رکھو کیونکہ ایسے مواقع پر جب لوگ آپؐ پر جھکے جا رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا ''وقار اور سکون کے ساتھ!''

جب تم جانور پر سوار ہو تو اسے اس کا حق بھی دو

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

کیونکہ حضورﷺ نے اسی طرح فرمایا ہے۔ ناپسندیدہ باتوں سے چشم پوشی کرو اور بردباری سے کام لو اور اس شخص کا تعاقب نہ کرو جس سے تمھیں تکلیف پہنچے اور اس سے بدلہ بھی نہ لو کیونکہ اسی میں دنیا اور آخرت میں فضیلت ہے۔ اسی سلسلہ میں حضورﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ بردبار، پاک دامن اور حوصلہ مند آدمی کو پسند کرتا ہے۔"

برائی کو بہترین انداز میں دور کرو۔ حضورﷺ نے فرمایا "اے مسلمانو! نافرمانی اور قطع رحمی سے بچو کیونکہ یہ دنیا میں باعث عیب اور آخرت میں اللہ سے دوری کا باعث ہے۔" اور حضورؐ کا فرمان ہے کہ رشتہ داری اور قرابت نے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس آدمی کی شکایت کی جو اسے توڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے جواب دیا کہ کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ جو تیرے ساتھ جڑے، میں اس سے جڑوں اور جو تجھے توڑے، میں اس کے ساتھ قطع تعلق کروں؟

جب کسی معاملہ میں تمھیں غصہ آجائے تو اسے پی جانے پر اللہ نے جو ثواب مقرر کیا ہے اسے یاد کرو۔ مومنین کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا:

والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس (آل عمران:۱۳۴)

"وہ غصہ کو پی جاتے اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔"

اور مجھے حضورﷺ کی یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا "جو شخص بھرپور غصہ کو صرف اللہ کے لیے پی جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اپنی رضا سے بھر دے گا۔" یعنی جو وہ چاہے گا وہ اسے دے دیا جائے گا۔

جب تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کوئی وعدہ کرو تو اس کی خلاف ورزی نہ کرو اور جب تم ایسی بات کرو جس میں اللہ کی رضا ہو تو اسے پورا کرو اور اس پر مداومت بھی کرو۔ حضورﷺ نے فرمایا:

۶ / چیزوں کی ذمہ داری

جو شخص ۶ / چیزوں کی ذمہ داری اٹھائے میں اس کے لیے جنت کی ذمہ داری لیتا ہوں۔

☆ جھوٹ نہ بولے۔

☆ وعدہ کر کے خلاف ورزی نہ کرے۔

☆ امانت میں خیانت نہ کرے۔

☆ آنکھیں نیچی رکھے۔

☆ شرم گاہ کی حفاظت کرے۔

☆ اور ہاتھ کو (دوسروں کی ایذاء سے) روکے۔

اگر اللہ کے حکم کے خلاف کوئی منت مان لو تو اسے توڑ دو اور کفارہ ادا کرو کیونکہ رسول اللہﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کوئی منت نہیں اور جب تم ایک منت مانو اور اس کے خلاف دوسری چیز کو بہتر سمجھو تو بہتر ہی کو کرو اور قسم کا کفارہ ادا کرو کیونکہ رسول اللہﷺ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

جھوٹا حاکم، تروتازہ فقیر اور بوڑھا زانی

مبالغہ آمیزی اور جھوٹ سے بچو کیونکہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ۳ / آدمیوں کی جانب نظر نہیں فرمائے گا۔ جھوٹا حاکم، تروتازہ چہرے والا گداگر اور بوڑھا زانی۔

والدین کے ساتھ نیکی کرو اور ان کے لیے ہر نماز میں خصوصیت سے دعا کیا کرو اور دعا و استغفار کی ابتدا اپنے آپ سے کرو، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگتے وقت فرمایا اے اللہ مجھے اور میرے والدین کو بخش دے۔ اور حضورﷺ کی مجھے یہ بات پہنچی ہے انھوں نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عمر میں مہلت اور رزق میں برکت دے تو اسے چاہیئے کہ اللہ سے ڈرے اور صلہ رحمی اختیار کرے۔ لوگوں کے احسانات کا شکریہ ادا کرو اور اگر تمھیں استطاعت ہو تو بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دو کیونکہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ خدا کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتا۔

جب تم کسی جانور پر سوار ہونے کے لیے رکاب میں پاؤں رکھو تو بسم اللہ کہو اور جب اس کے اوپر اچھی طرح بیٹھ جاؤ تو کہو:

سبحان الذی سخرلنا هذا وما كنا له مقرنين (الزخرف:۱۳)

ترجمہ: پاک ذات ہے وہ جس نے ہمارے تابع کر دیا اس سواری کو اور ہم تو ایسے نہیں تھے کہ اس کو قابو میں کر لیتے اور ہم کو تو اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

کھانے پینے سے پہلے اللہ کا نام لو اور اگر ابتدا میں اللہ کا نام لینا بھول جاؤ تو جب یاد آئے اسی وقت لے لو کیونکہ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ اللہ کا نام لو جب

ہارون الرشید

پانچواں عباسی خلیفہ ہارون الرشید، فروری ۷۶۶ء میں رے میں پیدا ہوا اور ۲۴ مارچ ۸۰۹ء کو رفیع ابن لیث کی سرکردگی میں ایشیا میں شروع ہونیوالی بغاوت کو فرو کرنے کی مہم کے دوران مشرقی پرشیا میں طوس میں وفات پائی۔

ہارون ۱۴ / ستمبر ۷۸۶ء کو ۲۰ / سال کی عمر میں تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ وہ خلیفہ مہدی کا تیسرا بیٹا تھا۔ ماں کنیز تھی جس کا نام خیزران تھا۔ اسے ۱۶ / سال کی عمر میں اس کے بھائی موسیٰ الہادی کے بعد ولی عہد ثانی نامزد کیا گیا۔ اسے ۱۴ / سال کی عمر میں بازنطینی حکومت کے خلاف جنگ میں سپہ سالار بنایا گیا۔ بازنطینیوں کے خلاف کامیاب مہم جوئی کے نتیجے میں اسے افریقہ، (تیونس) مصر، شام اور آمینیا اور آزر بائیجان کا گورنر بنا کر الرشید کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اس کی ماں ملکہ خیزران نے اپنے انتہائی معتمد یحییٰ برمکی کو ہارون کا اتالیق مقرر کیا۔

مہدی کا ۷۸۵ء میں انتقال ہوا اور ہادی بھی پر اسرار طریقے سے وفات پا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مہدی کی موت خیزران کے ہاتھوں ہوئی۔ بہرحال ہارون ستمبر ۷۸۶ء میں تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اس نے یحییٰ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ جس سے برامکہ کے انتظامی دور کا آغاز ہوا۔ برامکہ (یحییٰ اور اس کے دو بیٹوں فضل اور جعفر) نے ہارون کی مملکت کا انتظام بڑے احسن طریقے سے سرانجام دیا۔ دور دراز کے علاقوں کے گورنروں کو ایک معقول زر سالانہ کے عوض نیم خود مختاری عطا کی۔ جس سے ہارون کی سلطنت کے مالی حالات بہت بہتر ہو گئے لیکن خلافت کے اثر و نفوذ میں کمی پیدا ہوئی۔ ۸۰۳ء تک برامکہ عباسی سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔ لیکن اچانک ۲۸ / جنوری ۸۰۳ء کو انھیں جیل میں ڈال دیا گیا اور ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اس عتاب کی بنیادی وجہ برامکہ کا انتہائی طاقتور ہو جانا تھا۔ برامکہ نے سلطنت کی بنیادیں مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا لیکن اس کے بعد سلطنت کا انتظام و انصرام ہارون نے کلی طور پر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

ہارون کا دور حکومت اسلامی تہذیب و ثقافت کا سنہری دور مانا جاتا ہے۔ اس کے دربار میں فلسفی، سائنسدان، اور فنون لطیفہ کے ماہرین شامل تھے۔ زراعت، فنون، تجارت، علم و ادب کو ترقی ملی۔ اس کے دربار سے بڑے بڑے علماء و فضلا منسلک تھے۔ بہت سی علمی و سائنسی کتب کے تراجم ہوئے۔

اس نے تحفے کے طور پر شارلیمین جو کہ فرینکس کا بادشاہ تھا، کو ایک کلاک بھیجا۔ اس میں استعمال کی گئی ٹیکنالوجی ناقابل فہم تھی اور شارلیمین اسے جادوئی شے سمجھتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمان دوسروں سے کتنا آگے تھے۔ اس کے دور میں یروشلم کی زیارت کے لیے آنے والے زائرین کی حفاظت کا پورا بندوبست کیا گیا۔

ہارون کے عہد میں امام موسیٰؒ اہل بیت کے علاوہ امام احمد بن حنبلؒ کو بھی سزاؤں اور جسمانی قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہارون الرشید نے اپنے دشمنوں کے ساتھ ساتھ برامکہ کو بھی نہ بخشا، جنھوں نے اس کی خلافت کو مضبوط بنانے کے لیے اس کے مخالفین پر ظلم ڈھائے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ برامکہ کو قید کرنے کے لیے ایک محل تعمیر کرایا گیا۔ پہلی بارش میں ہی محل زمین بوس ہو گیا اور کبھی لوگ جاں بحق ہو گئے۔ اس محل کی بنیادیں نمک پر اٹھائی گئی تھیں۔ ہارون الرشید نے سلطنت کو اپنے دونوں بیٹوں مامون اور امین میں تقسیم کر دیا۔ یہ فیصلہ دانش مندانہ نہ تھا۔ ہارون کی وفات کے بعد دونوں میں جنگ کا آغاز ہوا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

بھی یاد آئے۔ اس طرح تم اس بات سے بچ جاؤ گے کہ شیطان تمھارے ساتھ کھانا کھائے اور پھر قے کر دے۔ اور جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو کہو:

الحمد الله الذی اطعمنا وسقانا و جعلنا من المسلمین

ترجمہ: تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا پلایا اور ہمیں مسلمانوں میں سے بنایا۔

کیونکہ رسول اللہ ﷺ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد یہی ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جب دوسرے لوگ تمھارے ساتھ کھانا کھا رہے ہوں تو اپنے سامنے سے کھاؤ اور داہنے ہاتھ سے کھاؤ۔ نہ کھانا پلیٹ کے بیچ میں سے لو اور نہ کسی دوسرے کے سامنے سے کھاؤ کیونکہ ایک ایسے ہی شخص کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا "بسم اللہ پڑھو اور اپنے سامنے سے کھاؤ، داہنے ہاتھ سے کھاؤ، بائیں ہاتھ سے نہیں اور نہ بائیں ہاتھ سے پانی پیو۔" آپ نے مزید فرمایا "بائیں ہاتھ سے شیطان کھاتا ہے۔" اگر ممکن ہو تو جمعرات کے روز سفر پر جاؤ کیونکہ رسول اللہؐ جمعرات کے روز ہی سفر پر جانا پسند فرماتے تھے اور جب تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہو **یاحی یا قیوم برحمتک استغیث** کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا مصیبت کے وقت یہی طرز عمل تھا۔

چغل خور ملعون

چغل خور سے بچو کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے "وہ آدمی ملعون ہے جو ماں اور باپ پر لعنت بھیجتا ہے اور وہ آدمی بھی ملعون ہے جو زمین کی حدود کو تبدیل کرتا ہے اور وہ بھی ملعون ہے جو چغل خوری کرتا ہے۔"

اپنی چادر ٹخنوں سے نیچے مت لٹکاؤ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا "جو شخص تکبر وغرور کی وجہ سے اپنی چادر لٹکاتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔"

اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لوگوں کی نافرمانی ہو جائے تو کوئی بات نہیں لیکن لوگوں کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہونے پائے کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا "اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔" جب تمھیں کوئی غم، بیماری ذلت اور بھوک سے سابقہ پیش آئے تو ۳ بار یہ الفاظ پڑھو: **اللہ ربی لا اشرک به شیئا**۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ ایسی تکلیفوں کے وقت یہی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ دنیا کے مصائب و آلام پر صبر کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

انما یوفی الصابرون اجرہم بغیر حساب (الزمر: ۱۰)

ترجمہ: صبر کرنے والوں کا ثواب بغیر حساب کے دیا جائے گا۔ کسی سے جھگڑا نہ کرو اگرچہ تم حق پر ہی کیوں نہ ہو۔

حج میں فحش گوئی نہیں

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج (البقرۃ: ۱۹۷)

ترجمہ: حج میں فحش گوئی، فسق و فجور جائز نہیں۔

جب تم دنیا کے کاموں میں سے کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرو تو اس کا انجام سوچ لو کیونکہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو اس کے انجام پر ضرور غور کرو، اگر انجام اچھا ہو تو اس کام کو کر گزرو اور اگر انجام درست نہ ہو تو اس سے رک جاؤ۔"

خلوت میں بھی اللہ سے حیا کرو

خلوت میں ننگا ہونے سے بچو کیونکہ تمھیں خدا سے شرم کرنی چاہیے اور یہ کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں پسند نہیں کرتا کہ جو شخص خلوت میں خداوند کریم سے حیا نہیں کرتا اس سے میں دوستی رکھوں۔ حمام میں چادر باندھ کر جاؤ اور دوسرے لوگ بھی تمھارے ساتھ حمام میں چادر باندھ کر جائیں۔ اگر تم ایسا نہ کر سکو تو اپنی آنکھیں بند رکھو کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ حمام میں ننگا ہو جائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ میرا ڈیفنس سے پہلا رابطہ تھا، مسجد چوک سے پوچھنا شروع کیا تھا کہ پی بلاک کدھر ہے، خالی سڑکوں اور خالی پلاٹوں سے گھومتا، بالآخر اس گھر تک پہنچ گیا جہاں رضیہ بٹ رہتی تھیں۔ یہ ۱۹۸۸ء کا پہلا مہینا تھا اور مال روڈ لاہور پر واقع ''فیروز سنز'' جہاں میں نے بطور ایڈیٹر اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا، سے بطور خاص انھیں ملنے آیا تھا۔

وہ منتظر تھیں، پہلی ملاقات اور پہلی بات سے ہی وہ ہماری رضیہ آپا ہوگئیں۔ چائے آنے تک وزیر آباد سے پشاور تک کے حالات سُن چکا تھا۔ پاکستان بنا تو وہ پشاور میں تھیں جہاں اُن کے والد مقیم تھے۔ تب انھیں لکھتے ہوئے کچھ سال ہوگئے تھے۔

اگلے برسوں میں جب وہ حجاب امتیاز علی تاج، سلمیٰ کنول، حمیدہ جبیں، اے آر خاتون اور زبیدہ خاتون کے طاری کردہ سحر کو توڑ کر پڑھنے والوں کو اپنی تحریروں کا اسیر کر چکی تھیں، وہ لاہور سے دور وزیر آباد میں مقیم تھیں جہاں ان کے میاں بزنس کرتے تھے۔

میں نے انھیں بتایا کہ میرا تعارف ان سے ۱۹۷۴ء میں ہوا جب لاہور میں سربراہی کانفرنس ہوئی۔ تب میں گورنمنٹ ہائی سکول چشتیاں میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھا اور ہر جمعرات کو سکول کے لائبریرین حفیظ الرحمٰن صاحب سے فیروز سنز کی بچوں کی کتابوں کے ساتھ ساتھ رضیہ بٹ کے دو اور نسیم حجازی کا ایک ناول ایشو کرا کے اپنی چائنہ میڈ سائیکل کے پیچھے کیریئر پر باندھ کر آویاں کمہاراں کے قریب واقع اپنے گھر لے کر جاتا۔ جہاں میری بے جی اور بڑی بہن ان ناولوں کی منتظر ہوتیں۔ تب مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی کہ ان کے ایک ناول کا نام ''ناہید'' تھا جو میری باجی کا نام تھا۔

سکول کا کام کرنے کے بعد ہم بہن بھائی اپنی اپنی کہانیاں لے کر بیٹھ جاتے اور بے جی اور ناہید باجی، رضیہ بٹ کے ناول پڑھنے میں محو ہو جاتیں۔ نائیلہ، ریطہ، نمو، شبو، انیلہ، صائقہ، ثمینہ، ناجیہ، شائزہ، ہر ناول کسی لڑکی کے نام کے گرد گھومتا تھا۔ ایک دو بار پڑھنے کی کوشش کی تو بے جی نے کہا بیٹا تم اپنی کہانیاں پڑھا کرو۔ تب بچے اچھے تھے، خوشی اور آمادگی سے بڑوں کی بات مان لیتے

وہ خواتین ناول نگاروں میں قیامِ پاکستان کے بعد آج تک سب سے زیادہ شہرت پانے والی ناول نگار تھیں جو ایک زمانے تک رومانوی ناولوں کی ملکہ کہلائی رہیں۔ وہ پاکستانی معاشرے میں عورت کے کردار کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے اپنی کہانی سوچتیں اور کرداروں کی بنت کرلیتیں۔ شخصی طور پر بہت متوازن، خاموش طبع، متواضع اور خلیق واقع ہوئی تھیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے اعتبار سے بڑے بولڈ موضوعات پر لکھا۔ یہ یقین کرنا ہمیشہ مشکل رہا کہ ایک خانہ دار خاتون اتنی عمدگی سے ماڈرن عورت کی کردار نگاری کیسے کرسکتی ہے۔

بشریٰ رحمٰن کے بقول ادیب وقت کا نقیب ہوتا ہے۔ تو اپنے عہد کی ضرورتوں کو انھوں نے خوب پہچانا اور اظہار کیا۔ یہ سارا سفر اتنا آسان نہ تھا۔ انھوں نے نوجوان نسل کو صاف ستھرا، انسانی رشتوں اور رابطوں میں گندھا ہوا ادب مہیا کیا اور تسلسل سے لکھتی رہیں۔ ان کی تحریروں میں کہانی بے شک بہت عمدگی سے بنی ہوئی ہوتی تھی مگر یہ کہنا کہ وہ پڑھنے والوں کی کردار سازی کرنا چاہتی تھیں یا تحریر میں کوئی واضح مقصدیت تھی، ایک اضافی اور غیر حقیقی بات ہوگی۔ اس حوالے سے ان پر تنقید بھی ہوتی رہی ہے۔

اُن کے ناول دلچسپ، سادہ، رواں، توجہ طلب اور عام انسانوں کی زندگیوں میں پیش آنے والے رومانوی واقعات کا عکس ہوتے تھے۔ انھیں اپنے قاری کو رُلانے اور ہنسانے پر ملکہ حاصل تھا۔ اس لیے اس عہد کی ایک مقبول ناول نگار کے طور پر ان کا نام ہمیشہ لیا جاتا رہے گا۔ مجھے ذاتی طور پر ان سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملتا رہا جو عام طور پر کم لوگوں کو میسر آیا۔ کچھ باتیں، کچھ یادیں رضیہ آپا کی رخصتی پر کہ اب وہ بھرپور زندگی گزار کر تاریخ کا حصہ ٹھہریں۔

تھے۔ پورے دھیان سے ''عالی پر کیا گزری''، ''مجھ پر کیا گزری''، ''ٹارزن''، ''ٹارزن کی واپسی''، ''اُڑن تنگ زمین پر''، عمرو عیار کی پوری سیریز، امیر حمزہ کے کارنامے پڑھ ڈالے۔

رضیہ بٹ کا ایک ناول ان کے باقی سب ناولوں سے مختلف تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ ناول میں نے دو تین بار جگہ جگہ سے پڑھنے کی کوشش کی، ہیرو کی وحشت اور ہیروئن سے دست درازی کے واقعات کی تفصیل، جذباتی اور جسمانی توڑ پھوڑ اس عمر میں کہاں سمجھ آتی تھی۔ اتنا بہرحال یاد ہے کہ وحشی نام کے اس ناول کا خوبرو ہیرو بہت بُرا لگا تھا اور یہ سوچ بنی تھی کہ بندہ چاہے کتنا بڑا افسر اور خواہ فوجی ہی کیوں نہ لگا ہو۔ جب دوسروں کو دکھ دے، ان کی عزت کی حفاظت نہ کرے، الٹا حملہ کرے تو کبھی اچھا نہیں ہوسکتا۔ بے جی ناول کے مشکل الفاظ شام کو کھانے کے بعد ابو سے پوچھ لیا کرتی تھیں (اللہ دونوں سے راضی ہو، کمال ماں باپ تھے)۔ ابو بڑے اطمینان سے ان کو بتا دیتے۔ کاپی پر ان کے لکھے ہوئے جملوں کی اصلاح بھی کر دیتے۔ ہم لوگ تختی لکھتے تھے۔ بے جی ہمارے ساتھ بیٹھ کر تختی لکھتیں۔ میں اس پوری محبت بھری تعلیم کا گواہ ہوں کہ ہماری بے جی نے گھر میں ہی ابو کی مدد سے نہ صرف روانی سے پڑھنا بلکہ لکھنا بھی سیکھا۔ ہمیں پڑھایا ابو نے ہی مگر چیک بے جی کیا کرتی تھیں۔ رات کو گیس والا لیمپ جلا دیتیں اور سونے کے وقت تک ہمارا ساتھ دیتیں۔ ہاں رضیہ بٹ ان کے ساتھ بیٹھی ہوتیں۔

رضیہ بٹ اور نسیم حجازی ان دونوں کے نام ہمارے گھر میں بڑی عزت سے لیے جاتے۔ اے آر خاتون کے ناول بھی آئے مگر پذیرائی سے محروم رہے۔ حجاب امتیاز علی تاج کے ناولوں کی مخصوص ڈراؤنی اور مافوق الفطرت فضا کے باعث وہ عام خواتین کی کبھی بھی پسندیدہ ناول نگار نہیں بن سکیں۔ دو ایک بار ایسے ناول بھی آئے جو مردوں نے خواتین کے ناموں سے لکھے تھے۔ کوئی مینا ناز قسم کا نام تھا۔ ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ رضیہ بٹ کے

آپ خود سوچیں کہ ۷ بچوں کی موجودگی میں مسلسل لکھنے کے لیے کیسے وقت نکالتی ہوں گی

لائبریری میں موجود ناولوں کا اسٹاک مکمل ہوگیا تو ابو سے لاہور آتے جاتے فرمائش ہوتی کہ وہ ان کا کوئی تازہ ناول ضرور لے کر آئیں۔

ہمارے گھر میں فلم دیکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اس لیے یہ جاننے کے باوجود کہ رضیہ بٹ کے ناول نائیلہ پر فلم بنی ہے۔ کبھی دیکھنے کا نہ خیال پیدا ہوا نہ کوئی پروگرام بنا۔ بے جی کے ساتھ میں نے زندگی میں ۲ فلمیں دیکھیں، ایک ۱۹۷۴ء میں بہاولنگر میں جہاں ہمارے پھوپھا اشرف بینک میں مینیجر تھے۔ زندگی کی پہلی فلم ''پہلوان جی ان لندن''...... نغمہ اور حبیب اس کے ہیرو ہیروئن تھے۔ پہلی بار کسی اتنی خوبصورت خاتون کو بنے ٹھنے اور ناچتے گاتے دیکھا تھا۔ سوئی سال تک وہ نام اور چہرہ پسند کا حصہ بنا رہا۔

رضیہ بٹ کے ناول، جہاں تک مجھے یاد ہے کہ احسن برادرز چھاپا کرتے تھے۔ انہی کے پاس نسیم حجازی کے ناولوں کے حقوق تھے۔ طارق اسمٰعیل ساگر کے ناولوں کو شہرت بھی یہیں سے ملی۔ احسن صاحب کے بھائی محسن صاحب بہت کمال آدمی تھے۔ فیروز پور روڈ پر واقع کیمپ جیل کے بالکل ساتھ گندے نالے کے پار ان کا دفتر اور پریس تھا۔ نصابی کتابوں کا کام بہت زیادہ ان کے پاس ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ پبلشنگ کے کام سے ان کی دلچسپی کم ہوتی گئی۔ ان کے ادارے کے چھپے ہوئے ناول عام سائز سے چھوٹے ہوتے تھے اور قیمت بے حد

WWW.PAKSOCIETY.COM

مناسب۔ بلکہ یہ کہنے دیجیے کہ بے حد کم ہوتی تھی۔ ناولوں کے زیادہ فروخت ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔

فیروز سنز کی آفر

رضیہ آپا کے پاس میں یہ آفر لے کر آیا تھا کہ اپنے ناول ہمیں دے دیں۔ رائلٹی بھی ملے گی اور بہتر ڈسٹری بیوشن بھی ہو گی۔ انھیں یہ آفر بہت اچھی لگی۔ کہنے لگیں، میری بڑی خواہش تھی کہ میرے ناول فیروز سنز سے چھپیں۔ بڑا ادارہ ہے، نام ہی نہیں ڈسٹری بیوشن بھی اچھی ہے۔ بس بات کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ پھر میرے پبلشر نے کبھی تنگ بھی نہیں کیا۔ جو بھیجا، جیسا بھیجا چھاپ کر کتابیں بھجوا دیں۔ رائٹر کو اور کیا چاہیے۔"

یوں یہ پہلی ملاقات کامیاب رہی، ان سے ابتدائی طور پر ان کے مقبول ترین ۱۰/ناولوں کے حقوق اشاعت ۱۰/سال کے لیے لینا طے ہو گئے۔

واپس آ کر میں نے مینیجنگ ڈائریکٹر ظہیر سلام کو بتایا۔ وہ ان دنوں بہت پُر جوش تھے اور چاہتے تھے کہ فیروز سنز جیسا بڑا ادارہ مشہور اور معروف ادیبوں کی کتابوں کا پبلشر بنے۔ یہ ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی اور اس نے آنے والے برسوں میں تعلق، محبت اور علم کی ایک دنیا مجھ پر کھول دی۔ الطاف صاحب نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ انگریزی میں معاہدہ تیار ہوا۔ ۱۰/سال کے لیے انھیں یکمشت مجموعی (Lumpsum) ادائی کی جانی تھی۔ معاہدہ لے کر ان کے گھر پہنچا تو اب کے ان کے میاں بٹ صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ پتا چلا کہ تعمیرات کراتے ہیں۔ کنسٹرکشن کے ٹھیکے لیتے ہیں مگر چھوٹے پیمانے پر۔ بہرحال چائے کے بعد وہ تو کام پر چلے گئے۔

اتنے سال انٹرویو کیوں نہ دیا

میں نے کئی اہم باتیں رضیہ آپا سے پوچھ ڈالیں۔ آپ اتنے سال سے لکھ رہی ہیں۔ کسی کتاب پر، کسی اخبار میں کبھی آپ کی تصویر نہیں آئی۔ کبھی انٹرویو نہیں چھپا۔

ان کا جواب میری توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ کہنے لگیں "اختر بیٹا! میری ۷/بیٹیاں ہیں۔ میں نے طے کیا تھا کہ ان کو پڑھا لکھا کر ان کے بیاہ کرنے کے بعد ہی اخبارات والوں کو اپنے گھر کا راستہ دکھاؤں گی، اس سے پہلے نہیں۔ بطور والدہ اپنے بچوں کی اچھی تربیت اور ان کے لیے محفوظ اور آرام دہ زندگی کا انتخاب ہی میری پہلی اور آخری ترجیح رہی ہے۔ آپ سوچ لیں کہ اتنے بچوں کی مصروفیات میں سے بھی کس طرح لکھنے کے لیے وقت نکالتی رہی ہوں۔ میں نے اپنے گھر کو پریس سے متعلق مہمانوں سے ہمیشہ دور رکھا۔ پھر جب سب بچیوں کی شادیاں کر لیں۔ وہ اپنے گھروں کی ہو گئیں تو میں پہلی بار پی ٹی وی کے کسی پروگرام میں گئی۔"

ناولوں کے اتنے نام کہاں سے آتے تھے

اسی روز ان کے ناولوں کے ناموں، کرداروں پر بھی بات ہوئی۔ وہ ہنس دیں، کہنے لگیں "میری اپنی بیٹیوں کی نندیں، دیورانیاں، جٹھانیاں، سمدھیانے اتنے رشتے ہیں کہ انسان غور کرنا چاہے تو کہانیاں اور نام تو اپنے آپ آس پاس سے ابلتی آتی ہیں۔"

ان دنوں میرے پاس کاواساکی جی ٹی او ۱۲۵ تھی۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو کہنے لگیں۔ "بیٹا! زندگی قیمتی ہے۔ یہ باقی رہے تو شوق پورے ہوتے ہیں۔" میں فوراً ان کی بات کی تہ تک پہنچ گیا اور مسکرا کر کہا "یہ بائیک بے شک مجھے پسند ہے مگر میں پائلٹ بن کر اسے نہیں اڑاتا، بہرحال اور بھی محتاط رہوں گا۔

کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنی بڑی بیٹی اور دو نواسیوں کے ساتھ شوروم پر آئیں اور کتابوں کی پہلی قسط ہمارے حوالے کر دی۔ پنجاب یونیورسٹی کے سابق صدر سعید سلیمی صاحب نے روزنامہ جنگ کے بالکل سامنے ایک بلڈنگ میں پریس سینڈیکیٹ کے نام سے کمپوزنگ سنٹر بنایا تھا ان سے کمپوزنگ شروع کروائی۔ تب یہ سہولت صرف جنگ کے پاس تھی اور پرائیویٹ سطح پر ایک آدھ اور پارٹی کے پاس موجود تھی۔ کمپوزنگ کے بعد پرنٹ کاغذ پر نہیں بلکہ برومائیڈ پر نکلتا تھا اور اسی پر کاتب کھرچ کر غلطی لگاتا تھا۔ کاتبوں کا دور ختم ہو رہا تھا۔ مشینیں ان کی جگہ لے رہی تھیں۔ عبدالرؤف صاحب، سرور صاحب ہمارے کاتب ہوتے تھے۔ اب وہ سرخیاں، ٹائٹل لکھنے لگے تھے۔ پروف پڑھنے کی ذمہ داری ہمارے سب ایڈیٹر نعیم احمد (اب ایڈیٹر نظریہ پاکستان) کے ذمے تھی۔ وہ بڑی دل جمعی سے یہ کام کرتے۔ ساتھ ساتھ تبصرے کرتے جاتے۔ دو تین دن میں وہ ایک ناول "پھڑکا" دیتے، یعنی پڑھ ڈالتے۔

"بانو" میں اضافہ

رضیہ آپا کے باقی ناولوں کی نسبت ان کا ناول "بانو" ایک مختلف اور بھرپور ناول تھا۔ کردار تو اس کے بھی ان کے ہر ناول کی طرح بہت عمدگی سے بُنے گئے تھے۔ بانو کا موضوع نسیم حجازی کے ناول "گمشدہ قافلے"، "خاک اور خون" کی طرح قیام پاکستان کی مشکلات، آزمائشیں اور دکھ تھا۔ اسے پڑھنے کے بعد مجھے ایک آئیڈیا سوجھا، میں سیدھا ان کے گھر جا پہنچا اور پوچھا یہ ناول پہلی بار کب چھپا۔ بولیں ۳۰/سال تو ہو گئے ہوں گے!

میرا آئیڈیا یہ تھا کہ اس میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، تاکہ ہیرو اور ہیروئن کے لیے جو ہمدردی پڑھنے والے کے اندر جمع ہوا سے کوئی رُخ بھی ملے۔ انھوں نے خوشدلی سے بات مان لی۔ ایک بار بھی نہیں کہا کہ اس سے ناول کا فارمیٹ متاثر ہوگا۔ میری کہانی، میرا خیال وغیرہ وغیرہ جیسا کہ عام طور پر لکھنے والے تھوڑی سی شہرت ملنے کے بعد "اڑی" کرنے لگتے ہیں، "میں ہی میں" والی نرگسیت ان میں نہ تھی۔ انھیں میں نے ہمیشہ بہت نفیس، متواضع اور سلجھی ہوئی خاتون پایا، جیسے اپنی بے جی سے ملا ہوں۔ کسی بھی تعصب سے پاک، دوسرے لکھنے والوں پہ بے وجہ کے غصے سے مبرّا، ماؤں کی طرح مہربان اور مطمئن۔

انھوں نے باب کا عنوان باندھا ۳۰/سال بعد۔ ہیرو ہیروئن کو پاکستان لا کر بوڑھا کر کے کہانی کو بڑی خوبصورتی سے ایک خوشگوار موڑ دے ڈالا۔

انسان کچھ کرنا چاہے اور اُس کام میں اپنی بہترین صلاحیتیں اور مہارتیں لگا دے تو خدا بند راستوں اور بند دلوں کو کھولنے میں دیر نہیں کرتا

پاکستان کی پہلی رنگین ریسپی بک

انہی دنوں ظہیر صاحب جرمنی کے دورے پر گئے اور واپسی پر بتانے لگے کہ دنیا میں کھانا پکانے کی کتابیں بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ "وہ تو ہمارے پاس بھی ہیں۔" میں نے لقمہ دیا۔ وہ بولے وہ تو سادی سی ہیں۔ نفیس، بہت عمدہ، فور کلر تصاویر کے ساتھ، کھلی کھلی، ڈیزائن دار۔ کتنا اچھا ہو اگر ہم بھی اپنی کوئی ایسی کتاب اپنے کھانوں کے ساتھ تیار کر سکیں۔

اگلی ملاقات پر رضیہ آپا سے ذکر ہوا تو بتانے لگیں کہ میری بڑی بیٹی بہت عمدہ کھانے پکاتی ہے۔ اس کا گھر بھی قریب ہی ہے۔ شیخوپورہ روڈ پر ہنڈا فیکٹری میں، جہاں اس کا میاں مینیجر ہے۔ تفصیلات طے ہو گئیں۔ پرنٹو سکین کے مالک شاہ جہاں صاحب جو اب شاہ جہاں گرافکس (اردو بازار لاہور) کے نام سے کام کرتے ہیں۔ بڑے کمال فوٹوگرافر تھے۔ وہ ایس صفدر علی کے شاگرد رہے اور ۹/سال تک ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتے رہے۔ ۲، ۳/سال لندن رہ کر فوٹوگرافی اور سکیننگ کا کام سیکھ کر آئے تھے۔ پاکستان میں ڈیجیٹل سکیننگ کے وہ بانی مانے جاتے ہیں۔ خوش مزاج اور پروفیشنل ہونا،

WWW.PAKSOCIETY.COM

رضیہ بٹ کو کبھی ادیبوں اور دانشوروں کی کمیونٹی کی باقاعدہ ممبرشپ نہیں ملی۔ پاپولر ناول نگار کا اعزاز ہمیشہ ان کے ساتھ رہا مگر بانو قدسیہ، بشریٰ رحمٰن، جمیلہ ہاشمی اور الطاف فاطمہ کی طرح ادیبوں میں ان کا شمار نہیں ہوا۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں مگر عام فہم اور طویل ناول لکھنے والے ناول نگار چاہے وہ تاریخی ہوں، رومانوی ہوں، سماجی ہوں یا جاسوسی وہ سکہ بند ادیبوں کی صف میں کبھی بھی جگہ نہیں پا سکے۔ مختصر کہانی، افسانہ لکھنے والے رائٹر نے چاہے ایک کتاب ہی لکھی ہو اور اس کو پڑھنے والے بھی محدود ہی دستیاب ہوئے ہوں ادیب کہلاتے ہیں۔ اس پر جتنی چاہے بحث کی جائے، دہائیوں سے مسئلہ حل نہیں ہوسکا۔ اسی طرح چلا آرہا ہے۔

دونوں خوبیاں کم ہی کسی ایک شخص میں اکٹھی ملتی ہیں۔ یہ ۸۸ء کا آٹھواں مہینا تھا، پیر کا دن، ہم دونوں صبح صبح لاہور سے کوٹ عبدالمالک روانہ ہوئے جہاں ہنڈا فیکٹری تھی۔ رضیہ آپا نے بہت محبت سے کوارڈینیٹ کیا تھا۔ ان کی بیٹی کے ہاں پہنچے تو بہت ہی نفاست سے سجا ڈرائنگ روم کھانوں سے بھرا ہوا تھا۔ شاہ جہاں صاحب نے اپنے کیمرے اور لینز نکالے اور پاکستان کی پہلی کلرڈ ریسپی بک کی تصاویر بنانے کی تیاری کرنے لگے۔ طے ہوا کہ تصویر تب تک نہیں بنے گی جب تک کیمرے سے پہلے زبان اس کی عمدگی اور خوش ذائقہ ہونے کی گواہی نہ دے دے۔ کہنے کو ہم نے کہہ تو دیا لیکن اگلے ہی لمحے ڈائننگ ٹیبل پر گرما گرم کھانے سج گئے اور حسنِ اتفاق یہ کہ ہر کھانا پہلے سے بڑھ کر، خوش ذائقہ بھی اور خوش اسلوبی سے سجا ہوا بھی۔ رات گئے تک ٹرانسپیرنسیر بنتی رہیں۔ کام زیادہ تھا مگر اگلے روز دوبارہ آنا ہم دونوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے کھاتے اور تصاویر بناتے رہے۔ رضیہ آپا کا اس دوران ۲ر بار فون بھی آیا۔ اپنی بیٹی کی مہارت کی تو وہ قائل تھیں ہی، ہماری گواہی ملنے پر اور بھی خوش ہوئیں۔ یوں پاکستان کی وہ پہلی رنگین اور خوبصورت ریسپی بک طبع ہوئی جس نے مارکیٹ میں دھوم مچا دی۔ اس کے بعد ہی کوکب خواجہ کی کتاب چھپی جس نے انھیں پاکستانی کھانوں کی ایکسپرٹ بنا ڈالا۔ وہ اپنے میاں کے ساتھ چین سے واپسی پر ہمارے لیے اپنے سفرنامے ''نی ہاؤ'' کا مسودہ لے کر آئی تھیں۔ اس کی اشاعت کے بعد وہ کھانے پکانے کی کتابوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔ وہ بھی خوب نفیس خاتون ہیں، عمدہ کھانے بنانے والی۔ جلد ہی ٹی وی پر آنے کے بعد وہ ملک کی معروف ترین کوکنگ ایکسپرٹ بن گئیں۔ ان کی کتابیں ٹوٹکوں، مشوروں اور کھانوں کی تھیں مگر اس کتاب سے بہت مختلف تھیں۔

مقبول ناول نگار سکہ بند ادیب کیوں بنیں

فیروز سنز کے بعد میں نے جون ۱۹۹۰ء میں نوائے وقت جوائن کرلیا اور نئی نسل کے لیے بے حد خوبصورت رسالے ''پھول'' کا اجراء کیا۔ جس نے پہلے سال قارئین کے دل جیتے اور دوسرے سال ایوارڈز۔

وہاں میرے ساتھ والا کمرا نوائے وقت جمعہ میگزین کا تھا جس میں رضیہ بٹ کے افسانے شائع ہونے لگے۔ عام طور پر ہم بہت سے ناموں اور تحریروں کو نوٹ نہیں کرتے۔ ہاں جان پہچان ہو تو وہ چیز رجسٹرڈ ہونے لگتی ہے۔ میگزین میں ان کی کہانیاں اور افسانے چھپتے تھے۔ کچھ میں نے بھی پڑھے۔ یہاں بھی ان کے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ موجود تھا۔ بے شک وہ بہت بڑا نہیں تھا۔ وہ ۳۰۰ر سے زائد کہانیاں لکھ کر بھی بطور افسانہ نگار یا کہانی کار Establish نہیں ہوئیں۔

نقاد ہی نہیں اخبار نویسوں کا تعصب اور پسند ناپسند بھی اس کی ایک بڑی وجہ ہے۔ نقاد اول تو مقبول ناول نگاروں کو پڑھتے ہی نہیں کہ ان کی رائے بن یا بدل سکے۔ اخبار نویس اپنے ایڈیشن یا رسالے کے لیے انٹرویو لینے پہنچ جائیں گے مگر کہیں نہ کہیں اپنے تعصب اور رائے کا بھی اظہار کر کے ادب کے نام پر مقبول اور غیر مقبول کا ٹیگ لگا دیں گے۔

آج کے ایک مشہور کالم نگار کبھی ''دھنک'' اور ''پلک'' قسم کی مقبول اور کھڑکی توڑ قسم کی صحافت کیا کرتے تھے۔ ''زنجیر'' تک آتے آتے وہ رضیہ بٹ کو مقبول ناول نگار تسلیم کرنے لگے۔ انٹرویو کرنے وزیرآباد بھی جا پہنچے مگر نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری ان کو اب بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ اٹھتے بیٹھتے اس کا طعنہ یوں دیتے ہیں جیسے حجازی صاحب سے پوری نسل کی ذہنی آبیاری کر کے

اُن کے ناول ''وحشی'' پر ۲ر فلمیں کیوں بن گئیں؟

گناہ سرزد ہوگیا ہو، حالانکہ حقیقت یہ کہ حجازی صاحب کے جانے کے کئی عشروں کے بعد بھی کوئی لکھنے والا نہ ان کی جگہ لے سکا، نہ اس قدر محنت کر کے تاریخ سے نئی کہانیاں اور نئے ہیرو لا سکا۔ خالی نعرے لگانے، جملے کسنے اور اخباری کالم لکھنے سے نہ تو ادب تخلیق ہوسکتا اور نہ کسی کی جگہ لی جاسکتی ہے۔

رضیہ بٹ کی زندگی کا واحد تنازعہ / کنٹروورسی

علی سفیان آفاقی صاحب کا تو اوڑھنا اور بچھونا ہی فلمیں رہا۔ ۹۰ر کی دہائی میں جب ہم دونوں ۱۲، ۱۳ر سال اکٹھے نوائے وقت میں رہے تو انہی سے نائیلہ کے علاوہ شبو اور صائقہ کے بھی قصے سنے جو رضیہ بٹ کے ناولوں سے ماخوذ تھیں۔

''وحشی'' کے نام کی وحشت بعد کے برسوں میں ایک اور طرح سے سامنے آئی تھی۔ تفصیل جاننے کے لیے میں نے ہفت روزہ فیملی کے ہفت رنگ ایڈیٹر علی سفیان آفاقی سے تفصیل جاننا چاہی۔ وہ بتانے لگے کہ ''وحشی'' پڑھا تو مجھے لگا کہ اس پر فلم بن سکتی ہے۔ کئی ڈائریکٹروں سے بات ہوئی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اس ناول کا ہیرو آخر میں ولن بن جاتا ہے۔ لوگوں کی ہمدردیوں سے محروم ہیرو کیسے چلے گا۔ میری طبیعت خراب تھی پھر بھی اس پر کام کیا۔ لئیق اختر کو ڈائریکٹر لیا اور ہم رضیہ بٹ کے گھر چلے گئے۔ تب وہ کینٹ میں رہتی تھیں۔ میں نے فلم بنانے کی بات کی اور کہا کہ کہانی کا آئیڈیا لیں گے۔ کردار سازی ساری نئی کرنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑے گی۔ آپ کو بہرحال ہم معاوضہ ۵/ہزار دیں گے۔ انھوں نے آمادگی کا اظہار کردیا۔ بات طے ہوگئی اور ہم واپس آگئے۔ اس سے پہلے آغا جی اے گل نے ۶۶ء میں نائیلہ پر پاکستان کی پہلی مکمل رنگین فلم بنائی تھی۔ ماسٹر عنایت حسین کی موسیقی تھی، قتیل شفائی کے گانے اور درپن ہیرو تھا۔ پھر شمیم آراء نے صاعقہ بنائی۔ شبو ناول پر ایس سلمان نے کام کیا مگر وہ سکرپٹ سے مطمئن نہ تھے۔ پھر ''محبت'' کے نام سے اس کا سارا سکرپٹ میں نے لکھا۔ ''زمان'' بنائی محمد علی اور زیبا کو لے کر۔ ''وحشی'' پر ''آس'' کے نام سے میں نے سکرپٹ مکمل کرلیا تو ایک روز اوریگا سینما کے مالک شیخ رشید میرے پاس آگئے کہ یہ بلینک چیک لے لیں اور سکرپٹ دے دیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں تو سال بھر پہلے شبنم محمد علی کی تاریخیں بھی لے چکا ہوں، آپ کو اپنا پراجیکٹ کیسے دے دوں۔ انھوں نے ایک معاہدہ نکال کر دکھایا جس کے مطابق رضیہ بٹ نے وحشی کے حقوق ۱۰/ہزار میں ان کو دے دیے تھے۔ مجھے بہت بُرا لگا اور افسوس بھی ہوا۔ انڈسٹری میں بہت ہاہا کار مچی۔ انھوں نے حسن طارق کو ڈائریکٹر لے کر رانی اور شاہد کے ساتھ ''پیاسا'' کے نام سے فلم بنائی۔ مجھے بہت ڈیپریشن ہوئی۔ رشید جاوید میرے دوست تھے۔ انھوں نے کہا تم پریشان نہ ہو۔ تم رائٹر ہو، کہانی بدل کر بنا لو۔ بہرحال تنازعہ مشہور ہوگیا تھا۔ میری فلم کو ڈائریکٹ کرنے والے کو مارکیٹ میں دِقت ہونی تھی اس لیے میں نے ''آس'' خود ڈائریکٹ کی۔ وہ ''پیاسا'' کے ۲/ماہ بعد لگی اور خوب چلی۔ ''پیاسا'' بری طرح فلاپ ہوئی۔ فرق یہ تھا کہ انھوں نے وحشی کے کرداروں کی خرابیوں کو دور نہیں کیا۔ میں نے ان کو نئے سرے سے سوچا اور بنایا، اس میں جو فطری تعلق اور حسن ہونا چاہیے تھا، وہ پیدا کیا۔ فلم تو خوب چلی لیکن اس تنازع نے مجھے بیمار کردیا۔

شخصی وقار کے ساتھ زمانے سے فاصلہ

آج چینلو کی بھری برسات میں خواتین رائٹرز کی جس بڑی تعداد کے نام اور تحریریں آپ دیکھ رہے ہیں کسی کو پسند آئے یا نہ آئے، سو کمزوریوں کے باوجود ان کی طرف سے کسی نہ کسی انسانی پہلو پر توجہ دلانے کا عمل جاری ہے۔ ان سب نے کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی طور رضیہ بٹ سے ضرور اثر لیا۔ آج کی ان لکھنے والیوں سے کل کا نقاد کیا سلوک کرتا ہے اسے کل پر چھوڑتے ہیں۔ فی الحال تو اتنا جانیے کہ ۱۹/مئی ۱۹۲۴ء کو راولپنڈی میں پیدا ہونے والی رضیہ بٹ جیسی سادہ، دھیمی اور مقبول ناول نگار اپنی عمر عزیز کے ۸۸/سال مکمل کر کے ۴/اکتوبر ۲۰۱۲ء کو لاہور میں اپنی ۷/بیٹیوں ہی نہیں، بے شمار نواسے نواسیوں کی خوشیاں دیکھ کر اپنے لفظوں اور ناولوں کے عروج کا مزہ اور اعزاز لے کر اس عالم میں رخصت ہوئیں۔ اُنھیں جاننے والے لاکھوں قارئین کے علاوہ ۵۰/ناول اور ۳۵۰/کہانیاں ان کے نام اور کام کو کبھی بھولنے نہ دیں گی۔ انھوں نے گھر میں رہتے ہوئے اپنی خاندانی اقدار اور شخصی وقار کے ساتھ زمانے سے ایک فاصلہ رکھتے ہوئے بہت احسن انداز میں وہ کر دکھایا جس کا عام طور پر ادبی اور سماجی گروہ بندیوں سے دور رہنے والی ایک خاتون نہیں کر پاتی۔ انسان کچھ کرنا چاہے اور اس کام میں اپنی بہتر صلاحیتوں اور مہارتوں کو لگا دے تو ربِ مہربان بند راستوں اور بند دلوں کو کھولنے میں دیر نہیں کرتا۔ ہم نے تو رضیہ آپا کے معاملے میں بھی یہی دیکھا ہے۔

اس قدر مقبولیت کے باوجود
تکبّر اُن کو چھو کر نہ گیا تھا
•
ان کے ساتھ ہی مقبول
ناولوں کا ایک طویل عہد
اپنے اختتام کو پہنچا

لاہور میں سہ روزہ

قومی اَدبی و ثقافتی کانفرنس

لاہور کے سامعین نے دل جیت لیے

- کشور ناہید کے مشورے پر شور مچ گیا
- ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا کا خطبہ عمدہ، بروقت اور برموقع تھا
- ڈاکٹر انوار احمد نے جذبات میں آکر کافی سخت بات کہہ دی
- ناشتے پر وزیر اعلیٰ نے سنانے سے زیادہ مہمانوں کی باتیں سنیں
- منٹو کے بارے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی تحقیق نے حیران کردیا

اختر عباس

WWW.PAKSOCIETY.COM

”بہت

ہی سودمند اور بھرپور“ یہ تھا پہلا تاثر کراچی سے آنے والے مہمان مقرر اور مندوب پیرزادہ قاسم کا۔ وہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ آج کل ضیاء الدین یونیورسٹی کراچی کے سربراہ ہیں۔

الحمرا آرٹس کونسل لاہور کے زیرِاہتمام ۱۲ر تا ۱۴ر اکتوبر کو ہونے والی قومی ادبی اور ثقافتی کانفرنس میں وہ تینوں دن شریک تھے۔ میں نے کانفرنس کے اختتام کے ایک روز بعد انھیں کراچی فون کیا۔

”ڈاکٹر صاحب سب سے اچھا کیا لگا؟ کانفرنس کی کس بات نے زیادہ متاثر کیا؟“

ان کا جواب تھا ”ہر سیشن میں سامعین کی شرکت اور سنجیدگی نے بہت متاثر کیا۔ سچ کہوں تو مجھے تعجب بھی ہوا۔ ایک تو تھیم میں قومی، ادبی اور ثقافتی ۳ر چیزیں شامل تھیں۔ ان میں ہم رشتگی تو ہے مگر ان کو نبھانا آسان نہیں تھا۔ اچھی بات یہ کہ ہر کہنے والے نے دل کی بات کہہ ڈالی۔ کسی کو یہ نہیں کہا گیا کہ فلاں بات کہنی ہے۔ فلاں نہیں۔ ہاں ایک کمی بھی تھی، مقرر زیادہ تھے اور سوالات کا موقع نہیں تھا۔

میں نے لمحہ بھر کو سوچا ڈاکٹر صاحب دانشور اور شاعر آدمی ہیں۔ عطاالحق قاسمی کے پرانے دوست بھی۔ کیا اس رائے میں دوست پروری کا شائبہ موجود ہے؟ یا وہ اعتراف حقیقت ہے جو تب کافی مشکل ہوتا ہے جب تعریف کسی ہم عصر کی ہو۔ عطاالحق قاسمی اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان سے محبت کرنے والے بھی کافی ہیں اور ان کے کام کے اثرات اور حسنِ انتظام کو سراہنے والے بھی ہر سو موجود ہیں۔ اس کانفرنس میں چاروں صوبوں سے آنے والے بیشتر مہمان کانفرنس کے موضوع سے لے کر انتظامات کی وسعت کو سراہتے رہے۔

مجھے تو کانفرنس کا نام، مقام اور اہتمام اس لیے اچھے لگے تھے کہ الحمرا آرٹس کونسل نے شہر لاہور کا فرض کفایہ بحسن و خوبی ادا کر دیا تھا۔ عطاالحق قاسمی جب سے الحمرا کے چیئرمین ہوئے ہیں۔ یہاں کے دن اور راتیں ہی بدل گئی ہیں۔ الحمرا ۳ر ادبی پروگراموں کے لیے بن مول ملنے لگا ہے۔ ادیبوں، دانشوروں کو ایک ”ٹھار“ میسر آ گئی ہے۔

قاسمی صاحب جس کام پر لگ جائیں اسے ٹیم بنا کر بڑی عمدگی اور Conviction کے ساتھ مکمل کرتے ہیں جبھی تو انھوں نے پروگرام کی تکمیل پر اپنے پی اے صبح صادق سے لے کر ایگزیکٹو ڈائریکٹر محمد علی بلوچ اور ادیب دوست اور ساتھی اصغر ندیم سید سے لے کر ڈاکٹر یونس جاوید بھی کی دل کھول کر تعریف کی جنھوں نے کانفرنس کے بروشرز لکھنے میں اپنی صلاحیتوں کا خوب اظہار کیا۔

نورالہدیٰ شاہ کا نام ڈرامے کے حوالے سے بہت معتبر ہے۔ ان دنوں جیو انٹرٹینمنٹ سے وابستہ ہیں۔ ان سے بات ہوئی تو میں نے انھیں بتایا کہ مجھے کم سے کم ۳ر لوگوں نے یہ کہا ہے کہ نورالہدیٰ شاہ کی گفتگو کانفرنس کا حاصل تھی۔ ہنس دیں۔ ”میرا تو یہ خیال نہیں تھا۔ میں تو کچھ لکھ بھی نہیں سکی تھی، زبانی ہی بولی تھی۔“ انھوں نے خوشدلی سے جواب دیا۔ ”سب سے یادگار چیز کیا تھی اس کانفرنس کی؟“ میں نے دوبارہ سوال کیا۔

”لاہور کے سامعین نے دل جیت لیے۔ کسی کنٹروورسی میں نہیں پڑے۔ سکون سے بات سنتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے مزاج کے خلاف بھی۔ اس قدر کھلے دل اور کشادہ مزاج کے لوگ ہیں کہ تعریف بنا رہا نہیں جاتا۔ ان کی گرم جوشی آخری لمحے تک موجود رہی۔ اس کانفرنس نے ہم لکھنے والوں کو باہم جوڑ دیا۔ کتنوں کے نام سن رکھے تھے۔ کبھی ملے نہیں تھے۔ کانفرنس کی بدولت سب سے مل لیا۔ ہر علاقائی زبان کے ادیب موجود تھے۔ ایسا پلیٹ فارم بہت ضروری اور اہم ہے۔ قاسمی صاحب کو ایسی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔“

فاروق عادل بحریہ یونیورسٹی کراچی میں پروفیسر اور نئی بات کے کالم نگار ہیں۔ کبھی تکبیر میں ان کا نام جگمگایا کرتا تھا۔ وہ بھی تینوں دن شریک رہے۔ انھیں فون کیا۔ کانفرنس کا حاصل کیا رہا۔ بولے نورالہدیٰ شاہ کی تقریر۔ کیوں کیا کہا انھوں نے؟ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ بولے بہت دل سے بلکہ دل سوزی سے بولیں کہ ہم اہلِ زبان ہو گئے مگر ۶۰ر سالوں میں ”ہم زبان“ نہیں ہو سکے۔

وہ افسانے کی محفل تھی۔ عنوان تھا ”پاکستان میں کہانی کا عروج و زوال۔“ بلوچستان کے ادیب منیر بادینی صدارت کر رہے تھے اور نورالہدیٰ شاہ مہمانِ خصوصی تھیں۔

نورالہدیٰ شاہ

منو بھائی — کشور ناہید — انتظار حسین — پیرزادہ قاسم — عبداللہ حسین — عطاء الحق قاسمی

مسعود اشعر، ڈاکٹر شاہ محمد، ڈاکٹر تحسین فراقی، آصف فرخی، ڈاکٹر سعادت سعید، شکیل عادل زادہ، ڈاکٹر مرحب واسی، رئیس فاطمہ سبھی بولے مگر نورالہدیٰ شاہ کی بات انوکھی تھی۔

کہنے لگیں ”پاکستان میں کہانی کے نشیب و فراز پر عالمانہ اور فاضلانہ گفتگو بہت ہو سکتی ہے۔ مگر ہم تو پریشان اس بات پر ہیں کہ سوات میں ملالہ پر حملہ کیوں ہوا۔ بلوچستان کے حالات اس قدر دِگرگوں کیوں ہیں۔ ٹھیک ہے اہلِ دل اور اہلِ فکر کا پریشان ہونا بنتا ہے لیکن کیا بطور کہانی کار ہم نے کبھی سوچا کہ جو قاتل ہے وہ قتل کیوں کرتا ہے اور جو ظالم ہے وہ بندوق کیوں اٹھاتا ہے۔ یہ باتیں میری سمجھ میں کبھی نہیں آتی تھیں۔ جتنا غور کرتی گئی اتنا الجھتی گئی۔ پھر ایک دن بانو قدسیہ مدد کو آئیں اور سمجھایا کہ ”بی بی! تم قاتل اور مقتول دونوں کی ماں بن کر سوچو۔ سارا مسئلہ تمھاری سمجھ میں آ جائے گا۔“

نور کا کہنا تھا ہم نے مقتول کا دکھ جاننے کی کوشش تو کی مگر قاتل کے دُکھ سے لاتعلق ہو گئے۔ اس کے بعد سے نہ تو فاٹا اور نہ ہی بلوچستان ہمارے قابو میں آ رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا سندھ کی کیفیات بھی ایسی ہی تھیں اور ہم سوچتے تھے پنجاب کے اہلِ قلم کو ہمارا درد کیوں محسوس نہیں ہوتا۔

کہانی کار کا تو دل بھی ایک، درد بھی ایک، آنسو بھی ایک تو پھر ہماری جدوجہد بھی ایک کیوں نہیں؟

پہلے دن کی پہلی نشست کا افتتاح وزیرِاعلیٰ پنجاب نے کیا۔ خیرِمقدم کے لیے سیکرٹری اطلاعات و ثقافت محی الدین احمد وانی موجود تھے۔ عطاالحق قاسمی کے دلچسپ کلمات پر خوب تالیاں بجیں۔ سٹیج پر عبداللہ حسین بھی موجود تھے۔

دوسرے روز سعادت حسن منٹو، خصوصی مطالعہ، عالمی سطح پر پاکستانی مصوری کا مقام اور پاکستان میں موسیقی کا حال و مستقبل کے موضوعات کا احاطہ ہوا۔

تیسرے دن ”ادب و معاشرہ پر میڈیا کے اثرات“ کی صدارت منو بھائی نے کی۔ اظہارِ خیال کرنے والوں میں کراچی سے محمود شام، اسلام آباد سے عرفان صدیقی۔ لاہور سے مجیب الرحمن شامی، یاسر پیرزادہ غازی صلاح الدین، آفتاب اقبال، خاور نعیم ہاشمی، افتخار احمد، سہیل وڑائچ، جاوید چوہدری، اوریا مقبول جان، سجاد میر، سلیم صافی شامل تھے۔ اس سیشن میں میڈیا کے لوگوں نے ادب کا ذکر تو آٹے میں نمک کے برابر ہی کیا ہوگا۔ اکثر تو صفائیاں پیش کرتے رہے، کچھ نے اہم سوال بھی اٹھائے مگر نشست کا موضوع گفتگو کا محور نہ بن سکا مگر نشست بہت بھرپور اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہنگامہ خیز رہی۔

یاسر پیرزادہ کا کہنا تھا میڈیا نے ایسے ترقی کی ہے جیسے لڑکا جوان ہوتا ہے، کیل مہاسے نکل آتے ہیں۔ قد ایک دم سے بڑھ جاتا اور آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ میڈیا کے ساتھ بالکل یہی ہوا ہے، آواز میں رعب آیا تو ڈانٹنے بھی لگا ہے اور یہی لوگوں کو زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

غازی صلاح الدین نے کہا میں یہاں مہمان اداکار ہوں۔ عنوان تبدیل ہونا چاہیے تھا۔ میڈیا پر ادب کے اثرات کا عنوان ہونا چاہیے تھا۔ (ایک ستم ظریف نے کہا قسم لے لیں جو میڈیا نے ادب سے اثر لیا ہو۔ مجال ہے کسی کو غالب، اقبال، فیض کا شعر آتا ہو۔ گانے جتنے مرضی سُن لیں۔ حد تو یہ ہے کہ سب سے بڑے ٹی وی چینل والے تو خبروں میں بھی گانے لے آئے ہیں۔)

آفتاب اقبال نے کہا میڈیا نے ۹۵/فیصد خواتین اور ۱۰۵/فیصد مردوں کو ایجوکیٹ کر دیا ہے اور ہر خاص و عام کو تو کالم نگار بنا ڈالا ہے اور میڈیا کیا کرے۔ ون ویلنگ اور پرس چھیننے میں میڈیا کا قصور ہے یا کسی اور کا، اس پر بات ہونی چاہیے۔ اینکرز کی شان میں آفتاب اقبال نے یہ کہہ کر کافی گستاخیاں کیں کہ اینکر جادو کا گولا ہیں۔ ان کا علم وجدانی ہے۔ تمام علوم میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ سے لے کر فنونِ حرب تک میں بچپن سے ہی طاق ہوتے ہیں۔ اینکر ایک ہی وقت میں حکیم، ڈاکٹر، انجینئر، موٹر سائیکل مکینک، ریڑھی بان غرضیکہ ہر چیز ہر شعبے کا ماہر ہوتا ہے۔ اس غریب کو ادب سے کیا لینا دینا۔

خاور نعیم ہاشمی نے کہا میڈیا عوام کی حمایت بھی کرتا ہے اور حکمرانوں کو عوام پر مسلط رکھنے کے حربے بھی اختیار کرتا ہے۔ پاکستان کا میڈیا اب بھی آمریت کے زیرِ اثر ہے۔ یہ میڈیا نہ قومی ہے نہ نظریاتی، صرف کمرشل میڈیا ہے۔ کبھی اخبار میں ادبی صفحات ہوا کرتے تھے، اب وہ بھی کم ہو گئے ہیں۔

آج کا میڈیا نان ایشو کو ایشو بنانے کا فن رکھتا ہے اور اس پر قادر ہے۔

سہیل وڑائچ نے گفتگو سے معذرت کر لی۔

افتخار احمد نے کہا ملالہ کے ساتھ زخمی ہونے والی بچیوں کی طرف توجہ نہیں تھی۔ میڈیا نے ہی متوجہ کیا۔ ان کا خیال تھا ملالہ مصنوعی ایشو نہیں ہے۔ ان کی گفتگو کے دوران بڑھتے بڑھتے بچی۔ عطاالحق قاسمی صاحب کو خود آ کر راضی کرنا پڑا۔ مبشر لقمان کے سکینڈل کے بعد بھی دو جگہ نوکری ملنے پر افتخار احمد کا خیال تھا یہ سوال مالکوں سے پوچھیں، ہم سے نہیں۔

جاوید چودھری نے کہا میں تسلیم کرتا ہوں میڈیا اوور پلے کرتے ہیں۔ اینکرز اپنی پسند کے سیاست دانوں کو سپورٹ کرتے ہیں۔ لوگوں کو بھی تو لگتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے ایجنٹ ہیں۔ تو کیا ڈرون حملوں کی بار بار خبر دینے والے، لال مسجد پر حملے اور مظالم کی رپورٹ کرنے والے، نوجوانوں کو ہمت دلانے والے پاکستان کے فعال میڈیا کے لوگ نہیں تھے۔ یہ یہود کے ایجنٹ ہیں؟

اوریا مقبول جان نے کہا کہ چار پانچ لوگوں کے ہاتھ میں سارے میڈیا کی ڈور ہے۔ وہی فیصلے کرتے اور فائدے لیتے ہیں۔

سلیم صافی نے کہا میڈیا خبریں دیتا ہے۔ آپ کے گھر میں پڑے کوڑے دان کو آپ تو کھول نہیں سکے۔ میڈیا نے اس کا ڈھکن کھول دیا ہے۔ جہاں پر آپ نہیں جا سکتے وہاں میڈیا والے چلے جاتے ہیں۔ سلیم صافی نے کہا ملالہ ایک نہیں تین مر چکی ہیں۔ دو افغانستان میں تھیں۔ ایک کا تو شعر بڑا خوب صورت ہے جو اس نے اپنے منگیتر کو لکھا کہ اگر تم وطن کی حرمت پر قربان نہ ہوئے تو میں تمھیں نہیں مل سکوں گی۔

محمود شام سے بعد میں کراچی بات ہوئی تو انھوں نے کہا اس کانفرنس نے یہ متھ توڑ دی ہے کہ لوگ ادبی پروگراموں کو توجہ نہیں دیتے۔ ہر سیشن جیم پیک تھا۔ موضوعات پر مقررین اور سامعین کا سنجیدہ رویہ امید کی بڑی کرن ہیں۔ بلوچستان کے حوالے سے بہت اہم باتیں سامنے آئی ہیں۔

میاں شہباز شریف کے ساتھ ماڈل ٹاؤن والے گھر میں ناشتے کی نشست کی بھی خوب دھوم رہی۔ یہ قاسمی صاحب کے پُراعتماد اور باہمی تعلقات کی خوب صورتی اور مضبوطی کا مظہر تھا، ورنہ عام طور پر اس طرح کے مواقع کہاں آتے ہیں۔ سب مہمانوں کے لیے حیران کن بات یہ بھی تھی کہ پنجاب کے وزیراعلیٰ سنانے سے زیادہ سننے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ خود انھوں نے مختصر سا تذکرہ کیا۔ جرمنی، جاپان اور چین کا اور بتایا کہ یہ قومیں فی الحقیقت اپنی قوم کی سربلندی کے خیالوں اور خوابوں سے کس قدر سرشار ہیں۔ اپنے ملک کے حالات بدلنے کے لیے عزم اور ارادے کا اظہار اس پر تھا۔

قاسمی صاحب نے یہاں ناشتا کرنے والے مہمانوں کو خیالات کے اظہار کا موقع دیا تو بعض نے لحاظ کیا اور بعض نے لمبی تقریروں کا شوق پورا فرمایا۔ سٹیج پر تقریر کا موقع ملے یا کسی نشست اور نجی محفل میں، بولنے والے اپنا غصہ نکالتے اور دوسرے منتظر اور مضطرب مقررین کے لیے باقاعدہ آزمائش کھڑی کر دیتے ہیں۔ کراچی سے آئے غازی صلاح الدین کا خیال تھا کہ پاکستانیوں کی اپنے ملک پذیرائی کم ہو رہی ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں عسکریت پسندی کے خلاف ادیبوں اور دانشوروں کی مزاحمت پر زور دیا۔ کسی نے لقمہ دیا "پہلے ہی کم ہیں جواب ادیبوں اور شاعروں کے جنازے بھی اٹھائیں گے۔"

اسلام آباد سے آئے مہمان ڈاکٹر انوار احمد خود اچھے خاصے سرکاری افسر ہیں۔ ملتان یونیورسٹی میں اپنی زندگی کے بہترین دن گزارنے والے ڈاکٹر صاحب کو اب بھی لوگ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین کے طور پر کم اور علمی ادبی طور پر متحرک ہونے کے باعث زیادہ جانتے ہیں۔ (ڈاکٹر فتح محمد ملک بھی اسی قبیلے سے تھے)۔ ڈاکٹر انوار احمد نے جوشِ خطابت میں کہہ ڈالا کہ ہم دنیا کو پاکستان کا ملائم (Soft) چہرہ کیسے دِکھا سکتے ہیں۔ ہمارے عوام کو چھوڑیں حکمران تک غصے سے تقریریں کرتے ہیں۔ چہروں پر خشونت طاری ہوتی ہے اور جذبات میں مائیک اچھال دیتے ہیں۔ غصے سے زیادہ پریشانی میں بولنے والے لیڈر تو زیادہ اسلام آباد میں پائے جاتے ہیں۔ میاں صاحب البتہ مائیک گرانے میں خاص مہارت رکھتے ہیں اور کوئی موقع جانے نہیں دیتے۔ خدا جانے یہ اتفاق ہے یا سوچی سمجھی صفتِ شہبازی۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب یہ جملے کہہ کر خود ہی ٹھٹھکے اور بولے سنا یہی ہے مگر کانفرنس کے دوران آپ کو ہم نے پُرسکون اور مسکراتے دیکھا ہے۔ بہتر ہے آپ عطاالحق قاسمی جیسے شگفتہ مزاج شخص کو زیادہ ہمراہ رکھا کریں۔

حکومتِ پنجاب کے ادبی ادارے "مجلسِ ترقی ادب"

فتح علی خان | افضال احمد | ظفر اقبال | سعید اختر | اصغر ندیم سید | سلیم صافی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی سربراہی احمد ندیم قاسمی کے بعد شہزاد احمد کو ملی۔ ان کی وفات کے بعد اب تک یہاں نیا سربراہ نہیں آیا۔ ڈاکٹر انوار نے کسی اہل علم کو اس کا سربراہ بنانے کا مشورہ دیا۔ قاسمی صاحب نے تائید ہی نہیں کی بلکہ ڈاکٹر خورشید رضوی کا نام بھی تجویز کردیا جو عربی، فارسی، اردو کے سکالر بھی ہیں اور استاد بھی۔ کچھ عرصہ قبل عربی ادب پر ان کی کتاب بھی خوب زیرِ بحث رہی ہے۔ لگتا یہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ ذمے داری مل جائے گی۔ اس دوران اگر کوئی قانونی یا بیوروکریٹک رکاوٹ نہ آن پڑی تو......!

بہاولپور سے آئے ڈاکٹر نجیب جمال نے لاہور کی طرح باقی ملک کو بھی پھولوں اور روشنیوں کے شہر بنانے کا مشورہ دیا البتہ یہ نہیں بتایا کہ ان کا اپنا شہر اب کس قدر خوبصورت اور بہتر ہوگیا ہے کہ آٹھ دس سال بعد جانے والا اسے پہچان بھی نہیں پاتا۔

اس کانفرنس میں جہاں نورالہدیٰ شاہ کی باتوں کافی داد سمیٹی وہاں بلوچستان سے آئے ۲ مہمانوں کافی رش لیا۔ وہاں کے سیکرٹری تعلیم منیر احمد بادینی ۴ ۴ بلوچی ناولوں کا بہت تذکرہ ہوا۔ یہ بات سننے جس قدر خوشگوار ہے ماننے میں ذرا مشکل کا بھی شکار کہ اتنے ناول چند ماہ میں کیسے لکھے گئے اور بلوچی پڑھنے والے پڑھے لکھے قاری ہیں کتنے؟ ہم نے تو سن رکھا ہے کہ بلوچی زبان میں کچھ عرصہ پہلے تک چھپنے ناولوں کی تعداد ۱۰ ابھی نہیں تھی۔

دوسرے بلوچی مہمان شاہ محمد مری نے کافی باتیں کیں۔ سخت اس لیے لگیں کہ ہمارے ہاں مہمانوں کی آمد کم ہے۔ وہاں سے لوگ آتے رہے مکالمہ ہی نہیں تبادلہ خیال بھی ہوتا رہے۔ اختر مینگل اسلام آباد آئے تو اتنی پذیرائی انھیں تب نہیں ملی تھی جب یا ان کے والد وہاں کے وزیراعلیٰ تھے۔ شاہ محمد مری نے نوجوان باغی بلوچوں سے رابطے کا کہا۔ ان کا کہنا تھا بگٹی اور مینگل غیر متعلق ہو چکے ہیں۔ مذاکرات ان سے نہیں خیر بخش مری، ہربیار مری اور براہمداغ بگٹی سے کریں۔ ہمیں تو یہ ان کی ذاتی رائے لگی۔ سیاسی معاملات میں ہر کوئی رائے ضرور رکھتا ہے۔ اسے قولِ فیصل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کانفرنس میں بھی شاہ محمد مری کی تقریریں اور گفتگو اسی رخ کو اجاگر کرتی رہیں۔ انھوں نے ایک دلچسپ بات کہی کہ اب معاملہ فوج سے نہیں، پنجاب سے طے ہوگا۔ مذاکرات بھی پنجاب سے ہوں گے۔ فوج تو خود پارٹی ہے۔ مذاکرات میں گارنٹر بٹھانا پڑے گا۔ میاں نواز شریف کی آواز بڑی توانا ہے۔ وہ بول بھی رہے ہیں مگر مطلوبہ اثرات پیدا نہیں ہو رہے۔

کانفرنس کے بروشرز پر اقبال کے ساتھ منٹو کی تصویر بھی تھی اور ایک تصویر ہی کیا پورا سیشن اُن کے لیے وقف تھا۔ ممتاز ناول نگار عبداللہ حسین نے اس سیشن کی صدارت کی۔ ہم تو انھیں لندن کا رہائشی اور باسی ہی سمجھتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ کئی سال سے یہاں لاہور میں ہیں۔ لاہور کی عمومی ادبی و سماجی تقریبات سے وہ دور ہی رہے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنی بیماری کے باوجود آئے بھی اور بولے بھی۔ ان دنوں وہ محمد علی کلے والی بیماری پارکنسن (رعشہ) کا شکار ہیں۔ ہم نے فون کرکے خیریت معلوم کی تو پتا چلا کہ اردو کے یہ معروف نقاد اور استاد کہ کتابیں ہی جن کا اوڑھنا بچھونا تھیں، آج کل مطالعۂ کتب کی باقاعدہ لذت سے محروم ہیں۔ مچھلی پانی کے بنا جی نہیں سکتی۔ ایسے ہی نقاد اور اچھا استاد بھی اپنی زندگی کے محور و مرکز پانیوں کے بغیر جینے کا تصور نہیں کرسکتا۔ یقین نہیں آتا تو ڈاکٹر انور سدید کو دیکھ لیجیے۔ شدید پیرانہ سالہ کے باوجود ہر

جھلکیاں

★ الحمرا کا مین گیٹ کراس کیا تو دیواروں پر شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور فنکاروں کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں حسن اتفاق سے سب سے پہلی تصویر ہمارے ایڈیٹر صاحب کی تھی۔
★ عطاالحق قاسمی صاحب نے افتتاحی پروگرام میں کہا کہ وزیراعلیٰ پنجاب شہباز شریف کا الحمرا آرٹس کونسل سے بہت ہی پیار اقبال، فیض اور جالب شہباز شریف کو بہت پسند ہیں۔ ویسے وہ جس جلسے میں بھی جاتے ہیں میری غزل ضرور پڑھتے ہیں اب آپ اُن کی الحمرا سے اور مجھ سے محبت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔
★ عبداللہ حسین صاحب نے کہا کہ میں نے گزشتہ ۳۰ سال تک کسی بھی حکومت سے باوجود اصرار کے کوئی بھی انعام نہیں لیا اس سے میرے کام، میرے لفظوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ گزشتہ سال پنجاب حکومت کی طرف سے دیا گیا انعام میں نے لیا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حکومت اس قابل ہے اور اس نے ادب کے لیے کچھ کیا ہے اور انھوں نے شہباز شریف کو اپنی کہانیوں کی کتاب تحفے میں دی اور انھوں نے کہا کہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی کوئی کتاب حکومتی سربراہ کو دی ہے۔
★ پیرزادہ قاسم نے کہا کہ ہم میں Intellectual Deficiency (فکری کمزوری) زیادہ ہے۔ اس لیے Knowledge Based علمی ادارے زیادہ ہونے چاہئیں۔
★ افضال احمد کو شہباز شریف صاحب نے خود چل کر ان کی ویل چیئر پر جا کر انعام دیا۔
★ انتظار حسین نے کہا کہ زبان کا زندہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہ قوم زندہ ہے۔ لیکن اب World Literature کا زمانہ آگیا ہے کہ انگلش میں ادب کو تخلیق کیا جائے۔
★ قاسمی صاحب نے لائف ٹائم اچیومنٹ الحمرا ایوارڈ کا سلسلہ شروع کیا تو ساتھ میں ۲ لاکھ انعام کی رقم بھی دی جاتی تھی۔ تقریب میں شہباز شریف صاحب نے اسے بڑھا کر ۵ لاکھ کرکے خوب داد سمیٹی۔ ادب، مصوری، موسیقی، تھیٹر ہر شعبہ انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس سال ادب میں ظفر اقبال، مصوری میں سعید اختر، موسیقی میں استاد فتح علی خاں اور تھیٹر میں افضال ایوارڈ دیے گئے۔
★ عطاالحق قاسمی صاحب نے ۳ روز تک متواتر گہرے اور نمایاں رنگ کے کپڑے پہنے اور اس حوالے سے بھی نمایاں رہے۔
★ شہباز شریف نے کہا کہ قائد نے پاکستان بنایا تھا مگر اس کی پیروی کرنے والے کمزور ثابت ہوئے، مگر میں پُرامید ہوں قوم میں جان (Potential) ہے۔ وہ دن دور نہیں جب قوم اچھی لیڈرشپ سامنے لائے اور قائد اور اقبال کا پاکستان بنائے۔
★ ڈاکٹر اعجاز انور نے کہا کہ ہر ذی روح اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاعری، مصوری، نثر، غزل اور ناٹک یہ سب اظہارِ جذبات کی مختلف اصناف ہیں۔
★ ڈاکٹر اعجاز الحسن نے کہا کہ ہمارے میوزیم میں مغل دور کی ایک بھی تصویر نہیں ہے۔ ہم نے اتنا بھی نہیں کیا کہ چندہ کرکے انگلینڈ سے مغل شہنشاہوں کی تصویر لے آئیں۔
★ شفقت علی خاں نے کہا کہ حیرت کی بات ہے کلچر کے لوگ ایگری کلچر میں آگئے اور ایگری کلچر کے لوگ کلچر میں چلے گئے۔ میرے والد صاحب کہتے تھے کہ کلاسیکل موسیقی یا تو بادشاہ سنتے ہیں یا پھر فقیر۔ اب دونوں ہی نہیں رہے۔
★ محمد علی شہکی نے کہا کہ موسیقی آپ کو تب تک غلط راستہ نہیں دکھاتی جب تک اُس کے ساتھ غلط نہ کیا جائے۔
★ استاد فتح علی خاں نے کہا کہ بھارت کی طرف سے ہمیں آفر ہوئی کہ یہاں رہ جائیں مگر ہم اپنے وطن پاکستان آئے۔ ہم ۲ بھائی بس کی چھت پر بیٹھ کر پاکستان آئے۔ ناروے میں میں پروگرام کرنے گیا۔ سٹیج پر بینر لگا تھا کہ اُستاد فتح علی خاں آف پٹیالہ، مگر میں نے اُن سے کہا کہ میں پاکستانی ہوں، لہٰذا یہ بینر اُتار دیں ورنہ میں نہیں گاؤں گا۔ جب تک انھوں نے وہ بینر نہ اُتارا میں نے نہیں گایا۔
★ اختر عباس نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہیں حکومت بچوں کے ایک وزارت کے مطالبے کے جواب میں مرکز اور صوبے میں، اُن کو، جو اکثر نہایت ہی بچگانہ باتیں کرتے ہیں، بچوں کا وزیر نہ بنا دے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ بچوں کے ادب سے بے اعتنائی کا مسئلہ بڑے ادیب سال میں ۲ کہانیاں لکھ کر، کالم نگار مہینے میں بچوں پر ایک کالم لکھ کر اور معروف ناول نگار سال میں ایک ناول لکھ کر حل کرسکتے ہیں۔
★ ان کا کہنا تھا گزشتہ ۲۵ سال سے یہ مسئلہ جوں کا توں ہے اور آیندہ بھی ایسے ہی رہنے کی توقع ہے۔ تاوقتیکہ حکومت بچوں کے لکھنے والوں کو بھی عزت دے اور تمغا حسن کارکردگی میں شامل کرے۔
★ ان کا مشورہ تھا کہ بچوں کا ادب لکھنے والوں کو خود بھی اچھے ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مطالعے کی وسعت کے بغیر انھیں یتیم کی آہوں، مسکین کے آنسوؤں، کتے کی وفاداری اور دوست کی بے وفائی کے علاوہ کوئی موضوع نہیں سوجھتا۔
★ بروشرز، مہمانوں کے کارڈز اور گزشتہ سال کے مقالہ جات کی کتاب بہت متاثر کن تھی۔ البتہ مہمانوں کے لیے ہینڈ بیگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔
★ ایک مختصر بک فیئر بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ کانفرنس کے بڑے بڑے فلیکس لگا ایک فلوٹ سڑکوں پر دیکھا جاتا رہا۔
★ وقفوں میں چائے اور کھانے کا بڑا عمدہ انتظام تھا۔

(غلام سجاد)

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

نئی آنے والی کتاب پڑھے بنا نہیں رہتے۔ ان کا کالم اور کتابوں پر اخباری تبصروں کا ناغہ بھی نہیں ہوتا۔ یہی عشق اور جنون ہی انسانوں کو زندہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر یونس جاوید اس کانفرنس میں خوب سرگرم رہے۔ سنا ہے بروشر کی خوبصورتی اور جامعیت میں ان کا کافی ہاتھ ہے۔ ہاتھ تو وہ جہاں بھی ڈالتے ہیں، اپنے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ چاہے ڈرامے کا میدان ہو، مجلس ترقی ادب میں گزرے سال ہوں یا پھر سکرپٹ سکھانے پڑھانے کا شوق اور ذمے داری۔ البتہ ہم ان کے نئے افسانوں سے عرصے سے محروم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! ساری مصروفیات اپنی جگہ پر، آپ کی پہچان ڈراما اور افسانہ ہی ہے۔ ان پر گرد پڑنی تو نہیں چاہیے۔ یونس جاوید حلقہ ارباب ذوق کے پرانے رجسٹروں سے منٹو کی ادبی زندگی پر خاصی تحقیق کر کے لائے تھے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے منٹو کی خاکہ نگاری میں اسلام اور پاکستان سے اس کے تعلق اور محبت کو ڈھونڈ نکالا۔ حیرت تو ہوئی مگر حوالے مضبوط تھے۔ کالی کملی والے اور بابو راؤ پٹیل کے خاکوں میں اس نے اسلام اور پاکستان کو ابدی محققین قرار دیا ہے۔ ''میرا صاحب'' میں قائداعظم سے عقیدت کا بڑا بامعنی اظہار اور اقرار ہے۔ نہرو کے نام خط کا وہ جملہ بھی خاصے کی چیز تھا جس میں منٹو نے نہرو کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ''آپ نے ہمارے دریاؤں کا پانی بند کر دیا۔ آپ کی دیکھا دیکھی آپ کی راج دھانی کے پبلشرز نے میری رائیلٹی بند کر دی اور مجھ سے پوچھے بنا دھڑا دھڑ میری کتابیں خود ہی چھاپے جا رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے۔''

کشور ناہید کانفرنس کے تمام سیشن میں بڑی ہمت اور باقاعدگی سے آتی رہیں۔ یہ عمر بھر کے مزاج کا حصہ ہے یا کالے بالوں کی برکت، مزاج کا بانکپن نہیں گیا۔ منٹو پہ بات کرتے ہوئے پہلے تو انھوں نے اصرار کیا کہ منٹو کی تحریروں میں فحاشی ہے ہی نہیں۔ پھر انھوں نے اپنے ہی منفرد مشورے پر اصرار کر ڈالا کہ ہمارے ادب میں کچھ فحاشی کا عنصر ضرور ہونا چاہیے۔ اس انقلابی مشورے پر حاضرین و ناظرین میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔ بظاہر تو ردعمل شدید منفی تاثرات اور تبصروں پر مبنی تھا۔ کسی کے دل میں کلیاں کھلی ہوں تو اس کی ہمیں خبر نہیں۔

اصغر ندیم سید گورنمنٹ کالج لاہور سے ریٹائرمنٹ کے بعد بیکن ہاؤس یونیورسٹی کے ہو گئے ہیں۔ وہی تو آواز اور وہی آواز کی مٹھاس جس میں سرائیکی وسیب سے تعلق کی چاشنی شامل ہوتی ہے۔ انھوں نے ''بچوں کے ادب سے بے اعتنائی کا مسئلہ'' والے اہم سیشن کی میزبانی کی۔ عطاالحق قاسمی صاحب کے کہنے کے باوجود کہ ان کا شکریہ نہ ادا کیا جائے اکثر مقررین نے اپنی تقاریر میں ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ اس سیشن میں اہم مقالہ نگار الصبار عبدالعلی، اختر عباس، ڈاکٹر مرجب قاسمی، رئیس فاطمہ، ڈاکٹر شفیق، ڈاکٹر انور محمود خالد، ڈاکٹر فخرالحق نوری، شعیب مرزا، مظفر محسن شامل تھے۔ یہ بڑا صبر آزما سیشن تھا۔ اصغر ندیم سید کے کہنے، سمجھانے اور اشارے کرنے کے باوجود مقررین اپنے طویل پیپرز پڑھنے سے باز نہیں آئے۔ ایک دو نے تو یہاں تک کمال کیا کہ آتے ہی مقالہ میزبان کو تھماتے ہوئے خود صرف اہم نکتے بیان کرنے کا اعلان کیا۔ جلد ہی نکتے نکات میں بدل گئے۔ کثیر تعداد میں بے زبان حاضرین کی موجودگی نے اس لذت کو اور بڑھا دیا اور انھوں نے چپکے سے ڈائریوں سے مقالے کی دوسری فوٹو کاپی نکال کر پڑھنی شروع کر دی۔ ہم چونکہ اصغر ندیم سید اور الصبار عبدالعلی کے درمیان میں بیٹھے تھے، سو دونوں کے دلچسپ تبصرے سننے کو ملتے رہے۔ سب سے مزید تبصرہ یہ ہے ''دوسروں کو بولنا، پڑھنا سکھاتے ہیں خود دیتے ہوئے اعلانیہ وقت کا بھی لحاظ نہیں کر پاتے۔''

سچی بات یہ ہے کہ تقریر تو ہمیں بھی بڑی آتی تھی مگر لحاظ کر گئے اور منہ زبانی نکات پر ہی اکتفا کیا۔ مقالہ بعد میں کتابی صورت میں چھپنے کے لیے اٹھا رکھا۔ جب بولے تو اس وقت حاضرین اور مقررین تازہ دم تھے۔ اس لیے بظاہر خیر ہی خیر رہی۔ سنا ہے اپنی تصویر اور تقریر تو سب کو اچھی لگتی ہے۔ ہم اس سے اتفاق کرتے ہوئے بھی یہ خیال رکھتے ہیں کہ آپ کے اچھے برے خیالات و احساسات پر بات دوسروں کو کرنی چاہیے۔ خود اپنی بات پر تبصرہ کرنا پڑے تو خاموش رہنا بہتر ہے۔ بہرحال اس سیشن کا حاصل گفتگو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا صدارتی خطبہ تھا۔ کیا عمدہ، بروقت، برموقع اور مختصر، ایک دانشور استاد کو اتنی ہی خوبصورتی سے بولنا اور کہنا چاہیے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

تالیفی خُلیے

گزشتہ سال امریکی ماہرینِ حیاتیات ڈی این اے کا اتنا بڑا ٹکڑا بنانے میں کامیاب رہے کہ ایک مکمل لونی مادہ (Genome) وجود میں آگیا۔ اب ان کی سعی ہے کہ ایک مکمل مصنوعی یا تالیفی (Synthetic) لونی مادہ کے ذریعے اولین زندہ مخلوق تخلیق کر لی جائے۔

ہوا یہ کہ امریکی سائنسی ادارے، کریگ وینٹر انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ماہرِ حیاتیات، ڈینئل گبسن نے ساتھیوں کے ساتھ، مشین سے بنے ڈی این اے کے ہزارہا ننھے منے ٹکڑے خمیر کے خلیوں سے جوڑے، پھر بڑے ٹکڑے ایک جگہ اکٹھے کیے اور یہ عمل اتنی بار دہرایا کہ لونی مادہ مکمل ہوگیا۔ یہ لونی مادہ پھر جراثیم میں داخل کر دیا گیا۔ چنانچہ آج کریگ وینٹر انسٹی ٹیوٹ میں ایسے جراثیم کی کھیپ جنم لے چکی ہے جن کے تمام (Jenes) کمپیوٹر میں مدون ہوئے اور پھر مشینوں نے انھیں تیار (یا اسمبل) کیا۔

گزشتہ ایک برس میں گبسن نے ایسا طریقہ دریافت کرلیا کہ اس کی مدد سے بوتل میں خمیری خلیوں کے بغیر ڈی این اے کے ٹکڑے تخلیق کیے جاسکیں۔ گبسن کو یقین ہے کہ مستقبل میں جب ماہرین مصنوعی خلیے بڑی تعداد میں بنائیں گے، تو ممکن ہو جائے گا کہ نباتی ایندھن (بائیوفیول)، ادویہ اور دیگر صنعتی مصنوعات وسیع پیمانے پر تیار ہوسکیں۔ یوں کئی شعبوں میں ترقی کا دروازہ کھل جائے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مانیٹرنگ کا جدید طریقِ کار

قاعدہ یہ ہے کہ جب آپ کسی بھی ویب سائٹ کو کھولیں، تو وہ آپ کی پسند کی گئی چیزیں (Preferences) محفوظ کر لیتی ہے۔ یوں جب بھی آپ دوبارہ اس ویب سائٹ پر جائیں تو وہ آپ کی مخصوص پسند مدنظر رکھ کر تجاویز پیش کرتی ہے۔ اب کمپیوٹر ماہرین جائزے کے اس عمل کو مزید جدید بنانا چاہتے ہیں۔

آج کل فیس بک کا چیف ٹیکنالوجی افسر، بریٹ ٹیلر یہی جدت پسند جائزہ (مانیٹرنگ) عمل اپنی ٹیم کے ساتھ ایجاد کرنے پر لگا ہوا ہے۔ اسے انھوں نے ''معاشرتی اشاریہ'' (Social Indexing) کا نام دیا۔ اس عمل کا طریق کار کچھ یوں ہے کہ اب تقریباً ہر ویب سائٹ پر ''لائک'' (Like) یعنی پسند کے بٹن موجود ہیں۔ ان لائک بٹنوں سے حاصل کردہ ڈیٹا کے ذریعے وہ معلوم کرے گا کہ دنیائے انٹرنیٹ میں کن ویب سائٹس کو سب سے زیادہ لوگ کھولتے ہیں۔

Like

اس ''معاشرتی اشاریہ'' کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک ویب سائٹ پر جتنا بھی مواد دستیاب ہے، اس میں سے بہترین اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ کیونکہ مرد و زن بہترین مواد ہی کو زیادہ ''لائک'' کرتے ہیں۔ چنانچہ انسان ایک ویب سائٹ پر پہنچ کر معیاری مواد ڈھونڈنے کی دقت و کوفت سے بچ جاتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سمارٹ ٹرانسفارمرز

آج کل دنیا کے کئی ممالک میں بجلی کا بحران ہے۔ پاکستانی تو اس مسئلہ سے خوب واقف ہیں کہ گزشتہ ۴/۵ برس سے لوڈشیڈنگ کے عذاب نے ان کی جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کئی ممالک میں ہزاروں شہری انفرادی طور پر چھوٹے بجلی گھر قائم کر رہے ہیں۔ یہ بجلی گھر پانی، شمسی توانائی یا ہوائی طاقت سے کام کرتے اور بجلی بناتے ہیں۔

ان چھوٹے بجلی گھروں کے ساتھ بھی ایک مسئلہ وابستہ ہے وہ یہ کہ ان میں بنی فاضل بجلی عموماً ضائع چلی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ چھوٹے بجلی گھروں میں بنی بجلی کو قومی گرڈ میں داخل کرنے کا کوئی آسان اور فوری طریق کار اب تک وضع نہیں ہوا۔ یہ نظام وضع کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ روایتی ٹرانسفارمر ہے۔

سڑکوں اور بازاروں میں جابجا نظر آنے والے روایتی ٹرانسفارمر صرف اے سی (AC) یعنی آلٹرنیٹنگ کرنٹ پر ہی کام کرتے ہیں۔ ڈی سی (DC) یعنی ڈائریکٹ کرنٹ کے سلسلہ میں وہ بالکل بیکار ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ بیشتر چھوٹے بجلی گھروں میں بجلی کی ڈی سی قسم جنم لیتی ہے۔ لہٰذا روایتی ٹرانسفارمروں کے ذریعے اُسے قومی گرڈ میں شامل کرنا بڑا پیچیدہ اور مہنگا نظام چاہتا ہے مگر یوں بہت سی بجلی ضائع ہو جاتی ہے۔

یہی مسئلہ مدنظر رکھ کر امریکی نارتھ کیلی فورنیا یونیورسٹی کا محقق، پروفیسر ایلکس ہوانگ ایسا ٹرانسفارمر ایجاد کر رہا ہے جو اے سی اور ڈی سی بجلی کی دونوں اقسام پر کام کرے گا۔ اس کی تکمیل کے بعد چھوٹے بجلی گھر میں بنی بجلی کو قومی گرڈ میں شامل کرنا یوں سہل ہو جائے گا جیسے ہم بہ سہولت ڈیجیٹل کیمرا کمپیوٹر سے منسلک کرتے ہیں۔ پروفیسر ایلکس کا ٹرانسفارمر جب بھی ایجاد ہوا، یقیناً شعبہ توانائی میں انقلاب لے آئے گا۔ تب حکومتیں اس قابل ہوں گی کہ عام افراد سے بھی بجلی خرید سکیں۔ یوں عوام کو لوڈشیڈنگ سے نجات مل جائے گی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اشاروں سے کام کرنے والا انٹرفیس

تل ابیب کی ایک کمپنی، پرائم سینس کے محقق، الیگزنڈر شپنٹ نے ایسا حیرت انگیز تھری ڈی ویژن (Vision) تجرباتی طور پر ایجاد کرلیا ہے جس کی مدد سے محض اشاروں کے ذریعے کمپیوٹر چلتا ہے۔ گویا یہ ایجاد عام ہونے کے بعد مستقبل میں انسان محض ہاتھوں کی حرکات سے کمپیوٹر چلایا کریں گے۔ اس تھری ڈی ویژن ایجاد میں کمپیوٹر پر ۳ر کیمرے نصب ہوتے ہیں۔ انہی کیمروں نے کمپیوٹر کو یہ صلاحیت عطا کر دی کہ وہ انسان کی طرح عمدہ نظر رکھ سکے۔ چنانچہ کمپیوٹر نہ صرف کمرے کے فرنیچر اور بازو میں تمیز کرتا، بلکہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ ہاتھوں کی حرکات کا مشاہدہ کرسکے۔

واضح رہے کہ مائیکروسافٹ کارپوریشن بھی ایسا کمپیوٹر انٹرفیس ایجاد کرنے کی کوششوں میں ہے جو اشاروں کے ذریعے کام کرے گا۔ کمپنی نے الیگزنڈر شپنٹ سے رابطہ کیا ہے تاکہ اس کی صلاحیتوں سے بھی استفادہ کیا جاسکے۔

سرطان کی ماہیت

ایک انسان اس وقت سرطان کا نشانہ بنتا ہے جب سرطانی خلیے مختلف جینیاتی وطبی خرابیوں سے شہ پا کر اتنے طاقتور ہوجاتے ہیں کہ صحت مند خلیوں سے زیادہ تیزی سے نشوونما پائیں اور جلد دوگنے تگنے ہوجائیں۔اب اگر ڈاکٹر یا سائنس دان یہ جان لیں کہ ایک مریض میں کن جینیاتی وطبی خرابیوں کے باعث سرطان پیدا ہوا، تو انھیں ایسی ادویہ منتخب کرنے میں آسانی رہے گی جو نہ صرف اس موذی مرض کا مقابلہ کریں بلکہ اسے جڑ سے بھی اُکھاڑ پھینکیں۔

یہی چشم کشا حقیقت مدنظر رکھ کر واشنگٹن یونیورسٹی کے جینوم انسٹیٹیوٹ میں ایک زبردست تحقیق جاری ہے۔ وہاں حال ہی میں ایسی مشین نصب ہوئی ہے، جو دیگر مشینوں کے مقابلہ میں زیادہ تیزرفتاری کے ساتھ ڈی این اے پڑھ سکتی ہے۔ چنانچہ انسٹیٹیوٹ میں سرطان کے مختلف مریضوں سے حاصل کردہ بافتیں جمع کی جارہی ہیں۔

مدعا یہ ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں میں جتنی بھی جینیاتی وطبی خرابیوں کے باعث سرطان جنم لیتا ہے، انھیں شناخت کرلیا جائے۔ ایک اندازے کے مطابق ان خرابیوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ جب بھی یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا، سرطان کا علاج کرنے والا نیا طریق کار دریافت ہوجائے گا۔تب دنیا میں کہیں کوئی انسان سرطان کا شکار ہوا، تو مرض کی تمام خرابیاں جان کر ڈاکٹر علاج کریں گے۔ یوں سرطان جیسی بیماری کا مقابلہ کرنا آسان ہوجائے گا جو ہر سال لاکھوں انسانوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے۔

کلاؤڈ کمپیوٹنگ میں رازداری

آج کل افراد سے لے کر کمپنیاں تک اپنا بہت سا کمپیوٹری ڈیٹا کلاؤڈ ہارڈ ڈسک میں رکھنے لگے ہیں۔ یہ ہارڈ ڈسک دراصل دُنیائے انٹرنیٹ میں موجود ہیں۔ ان کی سہولت ایم ایس این، گوگل، یاہو اور دیگر بڑی نیٹ کمپنیاں فراہم کرتی ہیں۔ عام لوگ خاص حد (مثلاً ۱۰۰ ایم بی) تک کا اپنا ڈیٹا مفت بھی رکھ سکتے ہیں۔ یہ عمل اصطلاحاً ''کلاؤڈ کمپیوٹنگ'' کہلاتا ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ کلاؤڈ ہارڈ ڈسک میں محفوظ ڈیٹا کو خفیہ رکھنا ممکن نہیں۔ چنانچہ جن کمپنیوں اور افراد کا مخفی ڈیٹا ان ڈسک میں رکھا ہو، وہ مسلسل اس خوف کا شکار رہتے ہیں کہ کوئی اُسے چرا نہ لے۔ اسی لیے کلاؤڈ کمپیوٹنگ مفت فراہم کرنے کے باوجود زیادہ مقبول نہیں ہو پائی۔ پھر لوگوں کو یہ ڈر بھی دامن گیر رہتا ہے کہ اگر کلاؤڈ ہارڈ ڈسک خراب ہوگئی، تو ان کے قیمتی ڈیٹا کا کیا بنے گا؟

یہی مسائل مدنظر رکھ کر امریکی کمپنی، آئی بی ایم کا محقق، کریگ گینٹری ایک طریق کار ''ہم صورتی انکرپشن (Homomorphic Encryption) ایجاد کرنے میں جتا ہوا ہے۔ اس طریق کار میں پیچیدہ ریاضیاتی اصولوں کے ذریعہ ڈیٹا خفیہ بنا کر کلاؤڈ ہارڈ ڈسک میں رکھا جائے گا۔ فی الوقت یہ طریقہ خاصا سست اور اُسے عملی طور پر اپنانا بھی کٹھن مرحلہ ہے، تاہم کریگ اُسے تیز رفتار اور بہتر بنانے پر لگا ہوا ہے۔ اُسے اُمید ہے کہ اگلے ۳ / تا ۵ / برس میں ہم صورتی انکرپشن کی بدولت کلاؤڈ ہارڈ ڈسک میں ڈیٹا کو خفیہ رکھنا ممکن ہو جائے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹھوس حالت والی بیٹریاں

شاید آپ نہ جانتے ہوں، بجلی چلنے والی کار میں سب سے ... پرزہ بیٹری ہے۔ جی ہاں، ا... میں لگنے والی بیٹریوں کی ... تقریباً ایک لاکھ ڈالر (۹۶... روپے) تک ہوتی ہے۔ مہنگی بیٹریوں کے باعث ہی بجلی کی کاریں کروڑ روپے سے اوپر میں آتی ہیں اور عام نہیں ہو ...
مہنگی بیٹریوں کا مسئلہ سامنے رکھ کر ہی ایک امریکی کمپنی، ساکتی ۳ (Sakti 3) ایسی بیٹری بنانے کے لیے تجربہ ... تحقیق کر رہی ہے جو قیمت اور جسامت میں موجودہ بیٹریوں سے آدھی ہوگی۔ اس بیٹری کو کمپنی نے ٹھوس حالت والی (Solid-State Battery) کا نام دیا ہے۔

فی الوقت برقی کاروں میں لیتھیم آئن بیٹریاں لگتی ہیں۔ ان میں لگے مائع برق پاشیدے (Electrolytes) بہت ... آگ پکڑ لیتے ہیں۔ ان میں نصب، منفی برقیرے (Cathodes) بھی تیزاب میں گھل جانے کا رجحان رکھتے ہیں۔ ... بیٹری کے دونوں اہم ترین حصوں کی حفاظت کے لیے خاص حفاظتی اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔

مثال کے طور پر بیٹری ٹھنڈا رکھنے کے لیے خاص نظام لگایا جاتا ہے۔ یوں نہ صرف برق پاشیدوں کی عمر بڑھتی ... بیٹری بھی جدت سے محفوظ رہتی ہے۔ مزید برآں ایک اور نظام بیٹری کو مکمل چارج نہیں ہونے دیتا، نیز ڈسچارجنگ سے ... بچاتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ سبھی اقدامات کرنے سے نہ صرف بیٹری کی لاگت بڑھتی بلکہ اُسے رکھنے کے لیے جگہ بھی ... درکار ہوتی ہے۔

ساکتی ۳ کی ٹھوس حالت بیٹریاں میں مائع برق پاشیدوں کے بجائے ایسے مواد (میٹریل) کی باریک تہہ لگے ... شدید حرارت میں بھی نہیں جلتا۔ یہ بیٹریاں لچکدار ہوں گی اور اس قابل کہ بلند درجہ حرارت بھی برداشت کر سکیں۔ گو... میں ایسا مواد استعمال کرنا ممکن ہوگا کہ اس میں دگنی تگنی توانائی سما سکے۔ یہ ٹھوس حالت والی بیٹریاں چند سال بعد مارکیٹ ... آئیں گی، لیکن ان کے آتے ہی بجلی کی کاروں کے شعبہ میں انقلاب آجائے گا۔ تب یقیناً ان کاروں کی قیمتیں گریں ... متوسط طبقہ بھی انھیں خرید سکے گا۔

کمپیوٹر کریش ہونے کا خاتمہ

ہمارا کمپیوٹر چلتے چلتے جام یا کریش ہو جائے، تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ دنیا اندھیر ہو گئی لیکن ذرا سوچیے، زندگی بچاؤ طبی آلات چلانے والے کمپیوٹر نظام اگر جام یا کریش ہو جائیں، تو کتنی بڑی جانی تباہی جنم لے سکتی ہے۔

اسی خرابی کو مدنظر رکھ کر آسٹریلیا کے قومی تحقیقی مرکز برائے آئی ٹی (NCITA) میں ماہرین نے ایسا طریق کار دریافت کیا ہے جو طبی اور دیگر اہم آلات چلانے والے کمپیوٹر نظاموں کو کبھی کریش نہیں ہونے دے گا۔ ان کی ٹیم کا سربراہ جون اینڈرونک ہے۔

یہ محقق آپریٹنگ سسٹم کے سب سے اہم حصے، بنیاد (Core) یا کرنیل (Kernel) کو اس طرح ڈیزائن کر رہے ہیں کہ کمپیوٹر کریش ہونے کا امکان ہی ختم ہو جائے۔ فی الوقت کمپیوٹر ماہرین عمل "تجربات و غلطیوں" کے ذریعے مستند اور جامع سافٹ ویئر تیار کرتے ہیں۔ اس دوران ماہرین ہر ایسی ممکنہ حالت سوچتے ہیں، جس میں کہ سافٹ ویئر خراب ہو سکے۔ پھر وہ خرابی کا سدباب کرنے کی خاطر سافٹ ویئر میں مطلوبہ تبدیلیاں کرتے اور اُسے مزید مضبوط بناتے ہیں۔

اس کے برعکس آسٹریلوی قومی تحقیقی مرکز برائے آئی ٹی کے ماہرین عمل "رسمی تصدیق" (Formal Verification) کے ذریعے اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ عام کمپیوٹر ماہرین اسے مؤثر نہیں سمجھتے لیکن اینڈرونک اور اس کی ٹیم نے اسی عمل کے ذریعے وہ کوڈ قابل شناخت بنا ڈالا جو آپریٹنگ سسٹم کے کرنیل کی جان ہوتا ہے۔ اس کوڈ کی خاص بات یہ ہے کہ تمام پروگراموں کی ہدایت اسی سے گزر کر کمپیوٹر کے ہارڈ ویئر تک پہنچتی ہے تاکہ انھیں انجام دیا جائے۔ لہٰذا اس کوڈ کو انتہائی مضبوط بنانے سے آپریٹنگ سسٹم کریش ہونے کا امکان تقریباً ختم ہو جائے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

تحریکِ آزادی (بھارت) کے راہنما

باپو گاندھی جی کا آشرم

گاندھی اور ان کے آشرم کا آنکھوں دیکھا حال

جہاں ایک سر منڈھی گوری خاتون ان کی خدمت گزار تھی
گاندھی جی نے میری ۱۲ سونے کی چوڑیاں اتروانے کی پوری کوشش کرڈالی
معروف ادیب اختر حسین رائے پوری کی اہلیہ حمیدہ اختر حسین کی زبانی

رضی الدین سید

قائداعظم

اور گاندھی اتفاق سے دونوں ہی کامیاب وکیل تھے اور دونوں ہی انگریز آقاؤں سے ملک کی نجات کے شدید ترین خواہاں تھے لیکن دونوں ہستیوں میں کردار اور مزاج کے اعتبار سے بہت تفاوت تھا۔

قائداعظم تحریکِ آزادیٔ ہند کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کے بھی وکیل تھے۔یعنی ایک طرف گاندھی اگر محض "ہندوستان چھوڑ دو" (QUIT INDIA) کی تحریک چلا رہے تھے تو دوسری طرف قائداعظم "تقسیم کرو اور ہندوستان چھوڑ دو" (DIVIDE AND QUIT INDIA) کی تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔قائداعظم قول وفعل اور کردار کے سچے، پکے اور کھرے لیڈر تھے جبکہ گاندھی سیاست کا لبادہ اوڑھے تھے۔قائداعظم گاندھی جی کی ننگ دھڑنگ رہنے کی ادا سے بیزار جبکہ خود ہر وقت ایک مہذب اور جدید لباس میں جلوہ گر رہتے تھے۔ گاندھی جی اپنی سیاسی زندگی میں بار بار ڈرامے رچانے کے عادی تھے۔کبھی ہندو مسلم بھائی بھائی کا ڈراما اور کبھی مرن برت کا ڈراما لیکن قائداعظم اپنے مسلم عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس قسم کے کسی بھی ڈرامے کے قائل نہیں تھے۔ جو رکھ رکھاؤ اور قول وقرار ان کا ابتدائی دور میں رہا، وہی رکھ رکھاؤ اور قول وقرار ان کا آخری دور میں بھی رہا۔پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ قائدِ اعظمؒ کا کردار عورتوں کے اسکینڈل سے ہمیشہ مبرا رہا جبکہ بھارتی قائد جواہر لال نہرو کا لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ معاشقہ سب کے سامنے عیاں ہو چکا ہے اور گاندھی جی پر بھی انگلیاں اٹھتی رہتی ہیں۔

پاکستان کے معروف ادیب مرحوم اختر حسین رائے پوری کی اہلیہ محترمہ حمیدہ اختر حسین راوی ہیں کہ تقسیم سے پہلے متحدہ ہندوستان میں ان کی ملاقاتیں گاندھی اور سروجنی نائیڈو سے بھی ہوتی رہی تھیں۔گاندھی کے ساتھ ایک ایسی ہی ملاقات کے بعد محترمہ نے گاندھی اور ان کے مشہورِ زمانہ آشرم (دربار) کا احوال بیان کیا ہے۔اپنی کتاب "ہم سفر" (شوہر کی سوانح حیات) شائع شدہ مکتبۂ دانیال کراچی میں وہ لکھتی ہیں۔(واضح رہے کہ گاندھی جی کی اردو کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اُنھوں نے خود گاندھی جی کی اپنی زبان میں بیان کیے ہیں جس سے عبارت کا لطف دوچند ہو جاتا ہے۔)

گاندھی جی کا آشرم

صبح تڑکے اُنھوں نے مجھے اٹھایا کہ جھٹ پٹ منہ ہاتھ دھو کر باہر چلو، بعد میں ناشتا کرنے چلیں گے۔باہر آکر تماشا دیکھا کہ ہر طرف اِدھر اُدھر لوگ جھاڑو لگا رہے ہیں، کچھ خواتین بھی۔ پیچھے کی طرف لڑکے لڑکیاں تھیں جو بڑی پھرتی سے جھاڑو لگانے، گوبر اُٹھانے میں مصروف تھیں۔بتایا یہ لڑکے لڑکیاں یہاں (گاندھی) کے آشرم ہی میں رہتے ہیں۔یہ کہہ کر نیچے اتریں، برآمدے کے نیچے رکھی جھاڑو اٹھا کر گز دو گز اِدھر اُدھر دو چار ہاتھ مار کر ہنستی ہوئی اوپر پھر برآمدے میں آگئیں۔دور کی طرف اشارہ کیا۔وہ دیکھو، سیٹھ برلا جھاڑو لگا رہے ہیں۔

"توبہ توبہ، یہ سب کیا ڈھونگ ہے؟" میں نے کہا۔" تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ یہ برابری کا درس ہے۔دیکھو میں تمھیں باپو کے پاس ایک شرط پر لے جاؤں گی کہ ہرگز ایسی اوٹ پٹانگ باتیں نہیں کروگی۔دوسرے یہ کہ ان کو گاندھی جی نہیں بلکہ باپو جی کہو گی"۔"بہت بہتر"۔

ناشتے میں ایک اسٹیل کے گلاس میں دودھ اور ایک پھلکا ملا۔وہ تو نہانے چلی گئیں۔میں کھڑکی سے لگ کر باہر کا تماشا دیکھنے لگی۔کچھ لڑکیاں لڑکے بالٹی اور گگریاں لیے پانی بھرنے کنوئیں پر جا رہے تھے، کچھ پانی بھر کر لوٹ رہے تھے۔کسی نے ایک بالٹی پانی کی ہمارے برآمدے میں بھی بھر کر رکھ دی۔مسز نائیڈو تیار ہو کر باہر آئیں تو کہا پانی کی بالٹی غسل خانے میں لے جاؤ اور تیار ہو کر آؤ۔میں اِتنے میں ذرا اخبار پڑھ لوں۔

میں نکلی تو وہ مجھے لے کر جو بیچ میں ہٹ بنی ہوئی ہے، اس طرف کو چلیں۔اپنا سر پلّو سے ڈھانک کر کہا۔

"تم بھی سر ڈھانپ لو"۔ باہر برآمدے میں 'اپنی پینیسنٹ' ایک انگریز خاتون کھڑی ملیں۔بے بلاؤز کی ساری کا پلّو کس کر سر پر سے ہوتا ہوا کمر پر کھونس رکھا تھا۔ ذرا سا پلّو سر پر سے کھسکا تو نظر آیا کہ سر منڈا ہوا ہے۔یہ عرصے سے گاندھی جی کی چیلی بنی ہوئی ان کی سیوا اور ٹہل خدمت کے کام انجام دے رہی تھیں۔ان کے ہاتھ میں ایک تھال تھا جس میں ایک کٹوری میں کدوکش کی ہوئی گاجر، ایک میں چقندر تھا اور ایک طرف کچھ پتے مولی کے۔سروجنی نائیڈو نے ان سے اندر جانے کی اجازت لی اور مجھے لے کر اندر آئیں اور جھک کر نمسکار کر کے گاندھی جی کے پاؤں ہاتھ لگا کر چھوئے اور انکا آشیرباد لے کر مجھے بھی اشارہ کیا کہ میں بھی ایسا کچھ کروں۔میں نے تو صرف جھک کر آداب کیا۔مجھے ملایا کہ یہ حمیدہ، اختر حسین رائے پوری کی بیوی ہیں۔آپ کا شکریہ ادا کرنے یہاں آئی ہیں۔"بیٹھیے بیٹھیے آپ دونوں۔" کمرے کے لپے پتے فرش پر ایک بڑی سی چٹائی بچھی ہوئی تھی، پیچھے گاؤ تکیہ اور سامنے ایک منّے سے ڈیسک نما نیچی سی میز پر قلم اور کاغذ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھدر کی دھوتی اس انداز میں بندھی ہوئی تھی کہ پتلی سوکھی ٹانگیں ران تک ننگی تھیں۔ نہ بنیان نہ کُرتا۔ ایک ایک پسلی اِتنی نمایاں کہ آسانی سے گن لو

رکھے تھے۔ اب میں نے ان کی طرف ہمت کر کے دیکھا۔ موٹے کھدر کی دھوتی اس انداز سے بندھی ہوئی تھی کہ پتلی سوکھی ٹانگیں ران تک ننگی۔ نہ بنیان نہ کرتا۔ ایک ایک پسلی یوں نمایاں کہ بڑی آسانی سے ہڈیاں گن لو۔ لمبا سا جینیو گلے میں پڑا ہوا۔ ماتھے پر تلک، سر کے بال برائے نام، اُبھرتا ہوا بے حد چوڑا ماتھا، پتلے پتلے ہونٹ ایک دوسرے سے بھینچے ہوئے، ناک موٹی سی اور موٹی موٹی بھنویں، عجیب قسم کی آنکھیں، نہ تو بہت بڑی نہ چھوٹی، مگر ان میں برقی روشنی سی، جیسے مقابل والے کا ایکسرے لے رہی ہوں۔ دھنسے ہوئے کلے، جبڑے کی ہڈیاں اُبھار لیے ہوئے، گندمی رنگ اور سامنے کے ۴/۳ دانت غائب، مٹھی بھر وزن، مگر جانے ان میں کون سی طاقت تھی۔ مجھے یوں لگا کہ اُنھوں نے مجھے اندر تک پڑھ لیا ہے۔ ان کے آگے یا تو انسان کی آنکھیں جھکی کی جھکی رہ جائیں یا اگر ان کی طرف دیکھ لے تو نگاہیں ٹکی کی ٹکی رہ جائیں۔ سروجنی نائیڈو سر ڈھانکے بڑی مؤدب بیٹھی تھیں، نظریں نیچی کیے ہوئے اور میں گاندھی جی کی طرف دیکھے ہی جا رہی تھی۔ مسکرا کر بولے ”آپ کو ہم یہ کہے ہے کہ بڑا ’کسمت‘ والی ہے کہ پتی اکتر حسین رائے پوری ملا ہے۔ اگر ایسا لوگ اور بھی ذرا ہو تو کھوب اچھا ہو۔ وہ کابل بہت سا ہے اور بہت سا نڈر، بے باک ہے۔ ناگپور کانفرنس میں زبان کے بارے میں بولا تو ہم سمجھ لیا کہ اس کو ہلا سکتا نہیں۔ ہندوستان کو ایسا ہی لوگ کا ضرورت ہے جو ہندی اردو ایک موافق سا جانے۔ جب یہاں آیا تو اس وکت پاسپورٹ کا بات کچھ کسی سے نہیں بولا۔“ میں نے کہا ”وہ بہت خوددار ہیں۔ اپنے لیے کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ میں آپ کی شکرگزار ہوں کہ وائسرائے کو تار بھیجا۔“

”نہیں، شکریہ کا بات نہیں بی بی۔ سوچو اگر آپ بھی ان کے ساتھ جاتا ہے، پڑھائی آدھی نہ ہو جائے۔ ایسا بھی تو آپ کر سکتا۔ یہاں آشرم میں رہ کر کچھ سیکھے۔ کوئی بڑا آدمی جو ملک کا سیوا کرے، اس کا پتنی میں بھی حوصلہ، ہمت اور دیس کی سیوا دکا سوک اگر ہوگا تو پھر پتی دل لگا کر دیس کی سیوا کرتا ہے۔ بولے آپ کہ اس آشرم میں اگر رہ جائے تو کیسا لگے؟“ ”باپو جی مجھے اپنے شوہر سے دُور رہنا ذرا اچھا نہ لگے اور پھر یہاں کی بہت سی باتیں پسند نہیں۔“ سروجنی نائیڈو نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔

”کون سا بات؟“

”جی یہ بات ٹھیک ہے، مگر یہ سب بچے تو نہیں ہیں۔ بڑے لوگ تو عقل سمجھ والے ہوتے ہیں۔ ان کو تو آپ کی بات فوراً مان لینا چاہیے۔“ اینی بیسنیٹ نے آ کر کہا ”فلاں صاحب کی ملاقات کا وقت ہو گیا“ تو گاندھی جی نے کہا ”کہہ دیں ابھی ان کے پاس ملاقات کا وکت نہیں۔“ سروجنی نائیڈو تو اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ میں نے اٹھنا چاہا تو حکماً کہا۔ ”ابھی آپ بیٹھیے۔“ میں پھر بیٹھ گئی۔

آپ بولے ”جب ہم سارا ہندوستانی لوگ ایکم ہی دھرتی ماتا کا رہنے والا ہے، پھر ہندو اور مسلمان الگ الگ کیسا ہو سکتا ہے۔ مل جل کر کیوں نہیں رہنے سکتا؟ ملک کی آزادی کے لیے ایک موافق کام کیوں نہیں کرنے سکتا؟“

”میں خود آپ سے یہ بات پوچھنے کو تھی کہ اگر آپ یہ بات دل سے چاہتے ہیں تو اگر ایک مسلمان کسی ہندو لڑکی سے شادی کر لے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ آپ کی نظر میں جب ہندو اور مسلمان ایک ہے تو آپ کو سب سے بڑھ کر اعتراض کیوں ہو؟ بیچاری لکشمی پنڈت نے جب سید حسین صاحب سے شادی کر لی تو آپ ہی نے بہانے سے سید صاحب کو ولایت بھیج کر لکشمی جی کو کئی ماہ نظر بند رکھا، جب تک کہ ان کے پھیرے نہ ڈلوا لیے۔ میں ٹھیک بات کہہ رہی ہوں نا؟ اس کا کیا جواب ہے آپ کے پاس؟“ (واضح رہے کہ نہرو کی بہن وجے لکشمی پنڈت نے مذکورہ مسلمان سید حسین سے پسند کی شادی کی تھی جسے گاندھی جی نے بعد میں زبردستی ختم کرایا تھا بلکہ تاریخی حقیقت تو یہ ہے کہ پورا نہرو خاندان ہی، انگریز اور مسلمان مردوں اور عورتوں کے ساتھ رومانی پینگوں میں مبتلا رہا کرتا تھا۔ پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جواہر لال نہرو پر موہن چند گاندھی جی کا بہت گہرا اثر تھا)۔ ذرا عینک کو اور نیچا ناک پر کر کے ذرا تھم کر بولے۔ ”بات یہ ہے کہ مسلمان اور ہندو بہن بھائی تو پھر بہن بھائی کی شادی کیسے ہونا؟“ اس جواب پر مجھے ہنسی تو بڑے زور سے آئی۔ مشکل سے ضبط کر کے کہا ”ہندو بھی تو آپس میں بہن بھائی ہوتے ہیں۔ پھر تو کوئی شادی مت ہونے دیں۔ کتنی اچھی طرح بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ یہ سن کر وہ ہنسے تو سامنے کے ۲/۳ دانت نمایاں ہو گئے۔ مجھے کھڑکی کا خیال آیا۔ اب اُنھوں نے بات کا رُخ بڑی ہوشیاری سے یوں موڑا ”آپ سامنے وہ بکسے کو دیکھتا ہے، اس پر کیا لکھا ہے؟“ ہندی میں ’کانگریس فنڈ‘ لکھا ہوا تھا۔ تھوڑی ہندی شادی سے پہلے شدبد تک جان گئی تھی۔ میرے بتانے پر کہ فنڈ لکھا ہوا ہے، خوش ہو کر بولے ”کھوب خوب، آپ ہندی پڑھ لیتا ہے۔ یہاں جو بھی عورت آتی ہے وہ اپنا زیور اتار کر اس میں ڈال دیتی ہے۔ مرد لوگ جیب کا روپیہ ڈال دیتا ہے۔ تب کانگریس کا کام چلتا ہے۔ آپ ۱۲/ سونے کا چوڑیاں پہنے ہیں۔ ان کو ڈبے میں ڈال دیں۔ جس ملک میں آدمی لوگ کے پاس بدن ڈھانپنے کو کپڑا نہ ہو، پیٹ بھرنے کو کھانا نہ مل سکے، وہاں پر سونا پہننا شرم کی بات ہے نا؟“

”بات تو آپ ٹھیک فرما رہے ہیں مگر یہ چوڑیاں میری اماں نے مجھے تحفے میں دی تھیں اور میرے ہاتھوں میں پہناتے وقت یہ کہہ کر دی تھیں، خدا تمھارے سہاگ کو ہمیشہ قائم رکھے۔ ایک تو یہ ماں کا تحفہ اور سب سے بڑی دعا، جو کسی بیٹی کے لیے ہو سکتی ہے وہ ان چوڑیوں کے ساتھ شامل ہے۔ پھر آپ ہی بتائیں کہ کیا میں ایسا تحفہ اُتار سکتی ہوں؟ ہاں جب ان شاء اللہ اختر کی کمائی والی چوڑیاں پہن کر آپ کے درشن کرنے آؤں گی تو اندر قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کروں گی کہ ان کو پہلے فنڈ کے ڈبے میں ڈال دوں گی۔“

”آپ تو ہماری کوئی بات بھی نہیں مانتا۔ اچھا ایسا ہونا چاہیے کہ جانے سے پہلے سروجنی جی کو یہ بتا کر جانا کہ آشرم میں رہے گا اور مولانا عبدالحق صاحب کو میرا سلام دینا۔ وہ تو ہم سے بہت بگڑ گیا ہے۔ اردو اور ہندی دونوں زبان ان کا بھی ہمارا بھی۔ پھر وہ بس اردو اردو کیوں کہتا ہیں؟“

اِتنے میں ’اینی بیسینٹ‘ ایک بکری کو رسی کے ٹکڑے سے پکڑے ہوئے چٹائی پر آئیں تو میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بڑی پھرتی سے بکری کے تھنوں کو اس طرح دبا رہی تھیں کہ گاندھی جی کے کھلے ہوئے منہ میں دودھ کی دھاریں سیدھی جاتیں اور وہ غٹ غٹ کر کے پی رہے ہیں۔ جھک کر آداب کیا اور وہاں سے نکل کر برآمدے میں

وہ بڑی پھرتی سے بکری کے تھنوں کو اس طرح دبا رہی تھی کہ گاندھی کے کھلے منہ میں دودھ کی دھاریں سیدھی جاتیں اور وہ غٹ غٹ کر کے پی رہے تھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گاندھی بولے:

’’مسلمان اور ہندو بہن بھائی تو پھر بہن بھائی کی شادی کیسے ہوتا؟‘‘

میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا:

’’پھر ہندو تو آپس میں بہن بھائی، ان کی کوئی شادی باہم نہ ہونے دیں‘‘

آئی تو دیکھا کہ سروجنی جی کھڑی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ بڑے روکھے انداز سے بولیں ’’حمیدہ، تم بھی خوب ہو۔ بھلا کبھی باپو جی سے کسی نے ایسی باتیں کی ہوں گی؟‘‘ ’’تو وہ مجھ سے آخر یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ میں آشرم میں رہ جاؤں اور اختر چلے جائیں ولایت؟‘‘ ’’یہ تو میں نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر وہ آشرم میں رہنے کو خود کہیں گے تو شاید تم مان لوگی تاکہ اختر کی پڑھائی مکمل ہوسکے۔ یوں میں مدراس میں جو ’’برلا ٹرسٹ‘‘ ہے، اسکالرشپ دلانے کی پوری کوشش کروں گی۔‘‘

’’اگر مل جائے تو کیا ہی کہنے۔ اور نہ ملے تو آپ ذرا فکر نہ کریں۔ اللہ اختر کے قلم کو سلامت رکھے۔ ہم دونوں آسانی سے گزر کرلیں گے۔ اور پھر میری پاکٹ منی بھی تو ہے۔‘‘ وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ کر چپ ہوگئیں۔

۹/ بجے رات کو حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئی۔ اس خیال سے بے حد مگن کہ اسٹیشن پر مولوی صاحب اور اختر کھڑے ملیں گے۔ گاڑی رکی تو دیکھا کہ صرف مولوی (عبدالحق۔سید) صاحب ہیں۔ جب میں نے انھیں گاندھی جی سے ملاقات کی ساری باتیں بتائیں۔ خوش ہو کر بولے ’’تم نے اچھا کیا سید حسین اور لکشمی پنڈت والی بات کا ذکر کیا۔ دیکھو بڈھا کیسا چالاک ہے، بالکل لومڑی جیسا۔ بکری کے تھن سے تازہ دودھ پینے کے طریقے کو سن کر کہا ’’میں تمھاری جگہ ہوتا تو اپنا منہ تھی کھول کر بیٹھ جاتا اور یوں شاید اپنے حصے میں بھی کچھ آجاتا۔‘‘

باپو گاندھی جی کے کردار کی یہ نقشہ گری ایک ایسی خاتون کے قلم سے ہے، جن کے شوہر اختر حسین رائے پوری کوئی بہت زیادہ مذہبی نہیں تھے کہ ہم کہہ سکیں کہ خاتون نے مذہبی جوش میں ان کے خلاف باتیں لکھ دی ہیں۔ بلکہ در حقیقت گاندھی جی کے ساتھ ان کی یہ ایک دوبدو ملاقات تھی اور اُنھوں نے گاندھی جی کو جیسا دیکھا ویسا ہی بیان کیا۔ چنانچہ ان کے اس بیانیے کا پس پردہ مطلب یہی نکلتا ہے کہ گاندھی اپنے طرزِ عمل سے قوم کو بیوقوف بنا رہے تھے۔ جس آشرم میں بھلا لاتعداد نوجوان لڑکیاں اور عورتیں اَن گنت مردوں کے ساتھ گھر بار چھوڑ کر دن رات گاندھی جی کی خدمت کے لیے رہتی ہوں، وہاں بہت سے ’’غیر معمولی واقعات‘‘ کے ہوجانے کا تصور کوئی بھی فرد کرسکتا ہے۔

گاندھی جی کی یہ عجیب و غریب تصویر آپ نے ملاحظہ کی۔ اس کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا بھی کردار کچھ ایسا ہی تھا؟ کیا ہندوستان میں وہ بھی اس قسم کے کسی آشرم کے بانی تھے؟ کیا ان کے ساتھ بھی کبھی کسی عورت کا کوئی اسکینڈل سامنے آیا ہے؟

محمد علی جناح ایک ایسے صاف ستھرے اور شریف النفس شخص تھے۔ جو نہ تو کبھی ننگ دھڑنگ رہے اور نہ اُنھوں نے کبھی کوئی معمولی سا بھی غیر مہذبانہ لباس پہنا۔ ایک طرف اگر وہ لباس کے معاملے میں اُجلے تھے تو دوسری طرف دل و زبان کے معاملے میں بھی بالکل اُجلے تھے۔ تو پھر کیسے کوئی مقابلہ کرسکتا ہے پاکستان کے قائد اور بھارت کے قائد باپو موہن داس کرم چند گاندھی کا؟ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ گاندھی کو دنیا بھر میں مشہور کرانے، قابل قبول بنوانے میں ان کے ڈرامائی اعلانات اور کاموں کا خوب دخل ہے۔

آیئے......اقبال سے ملتے ہیں

نومبر تو اصل میں اقبال کا ہی مہینا ہے۔ بڑے ناموں اور کاموں سے جڑنے والے دن، مہینے اور جگہیں اپنے آپ بڑی اور اہم ہو جاتی ہیں۔

’’میں نے رومی کی طرح حرم میں آذاں دی اور اسی سے اسرارِ جان سیکھے۔ دورِ کہن میں رومی تھا اور اور عصرِ رواں میں، میں ہوں۔ (ہم دونوں کو ایک ہی جیسے حالات کا سامنا ہے)

۹/ نومبر کو دنیا میں لاکھوں لوگ پیدا ہوئے ہوں گے مگر ان میں سیالکوٹ کے محلہ چودھری وہاب (موجودہ اقبال سٹریٹ) میں شیخ نور محمد ولد شیخ محمد رفیق کے ہاں پیدا ہونے والا محمد اقبال کے ہی اقبال ایسے بلند ہوئے کہ شمس العلماء مولوی سید میر حسن جیسے استاد سے واسطہ پڑا کہ جس کے بارے میں خود اقبال نے کہا:

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کر نکلے ہیں

والدین اور اساتذہ کی اچھی تعلیم و تربیت کے بغیر مثالی انسان پیدا نہیں ہو سکتے۔ اقبال کی والدہ نے بیٹے میں قرآن پاک کی تلاوت کا شوق پیدا کیا۔ والد نے سمجھایا قران پاک یوں پڑھو جیسے تم پر ہی نازل ہو رہا ہے۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

سید میر حسن نے شاگردِ عزیز کو شاعری کی طرف یوں مائل کیا کہ اقبال سکول کے دنوں میں ہی شعر کہنے لگا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے فلسفہ کے دوران انہیں فلسفہ کے اس سکالر ’’پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کی راہنمائی مل گئی کہ سر سید اور شبلی نعمانی بھی جس کی علمی مہارت اور قابلیت کے قدر دان تھے۔ آرنلڈ جیسا محقق اور خلیق استاد ہی کہہ سکتا تھا ’’اقبال ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق تر بنا دیتا ہے۔‘‘

اقبال ہمارے اپنے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ کتابوں میں بند ہمارے دِلوں سے دُور۔ اس برس بہت جی چاہا کہ آپ سے کہوں کہ انھیں کتابوں سے نکالیے، اُن سے ملیے، اُن کو جانیے، یوں بہت سی مشکلوں سے رہائی ملے گی۔

’’اسرار و رموز‘‘ میں اقبال نے ایک نوجوان کی حکایت بیان کی ہے جو دشمنوں کے خوف سے نجات کا خواہاں ہے۔

فرمایا ’’اے رازِ حیات سے ناواقف نوجواں!

تُو زندگی کے آغاز اور انجام سے غافل ہے۔ تُو دشمنوں کا خوف دل سے نکال دے۔ تیرے اندر ایک قوت خوابیدہ موجود ہے۔ اسے بیدار کر جب پتھر اپنے آپ کو شیشہ سمجھنے لگتا ہے تو شیشہ بن جاتا اور شیشے کی طرح ٹوٹنے لگتا ہے۔ جب مسافر اپنے آپ کو کمزور سمجھتا ہے تو اپنی جان کی نقدی بھی راہزن کے سپرد کر دیتا ہے۔ تو اپنے آپ کو کب تک پانی اور مٹی کا پتلا سمجھتا رہے گا۔ تجھے چاہیے اپنے اندر شعلۂ طور پیدا کر، یوسف کی طرح خود شناس ہو، تاکہ اسیری سے شہنشاہی تک پہنچے۔‘‘

اس نومبر میں اقبال پر بات کرتے ہوئے ۲/ کتابوں کا تذکرہ بھی ضروری لگتا ہے۔ ایک دل آویز کتاب ’’روح دین کا شناسا اقبال‘‘ سید علی گیلانی نے لکھی ہے۔ اسے منشورات، منصورہ لاہور نے چھاپا ہے اور دوسری کتاب ’’زندہ اقبال‘‘ قیوم نظامی نے لکھی ہے۔ اسے جہانگیر بک ڈپو ریواز گارڈن نے چھاپا ہے۔ دونوں مرشد کی کیا خوب یاد تازہ کرتی ہیں۔ (مدیر)

WWW.PAKSOCIETY.COM

اِقبالؒ تیرے عشق نے سب بَلؒ دیے نِکالؒ

ماہ نور فیصل

جسٹس ایم آر کیانی کا نام عشروں بعد بھی تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہے لفظ ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے ہیں اور وہ جس خوبی سے اُن کا استعمال کرتے ہیں وہ کمال سب کو عطا نہیں ہوتا

شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کی یاد میں منعقدہ ایک پروگرام میں ان کا دیا گیا خطبہ فکر انگیز ہی نہیں مسکراہٹ انگیز بھی ہے

میں سوچ رہا تھا کہ یہ تقریر کیسے شروع کروں سوائے اس کے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور پھر کئی صدیاں چھوڑ کر اقبال اور قائداعظم پر نگاہ ٹھہرتی ہے اور پھر اس جلسے کے منتظمین میری تعریف کریں گے اور میں کسرِ نفسی کروں گا بلکہ یہ کہوں گا کہ اگر بات صرف ان حضرات کے اختیار کی ہوتی تو میں کب کا بزرگ بن گیا ہوتا اور بکری کا دودھ اور دو کاغذی لیموں میری غذا ہوتے لیکن بکری کا دودھ پی کر آپ بھینسے کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور دنیا کی سیاست پر اس وقت بھینسا حاوی ہے۔ اس لیے مجھے بھی کچھ دن بھینس کا دودھ پی لینے دیجیے۔ اپنے متعلق تعریف کا لفظ شاید میں نے غلط استعمال کیا ہے۔ مجھے تعارف کہنا چاہیے تھا کیونکہ جو حضرات مجھے یہاں لائے ہیں، اُن کا مقصد یہ تھا کہ اس محفل کے ذریعے ادب سے مجھے متعارف کرائیں اور ضمنی طور پر اہلِ ادب سے میرا تعارف بھی کرادیں۔ اب چونکہ میری گستاخیاں مشہور ہوگئی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ادب کے میدان میں بھی بے ادبی پر اُکسائیں۔ بہرحال تعریف اور تعارف کے معاملے میں زیادہ الجھنا نہیں چاہیے کیونکہ سنا ہے کہ جب ایک نیک مسلمان سے کسی نے پوچھا آپ کی تعریف؟ تو اُس نے سادگی سے جواب دیا ''بھائی! ہماری کیا تعریف ہوسکتی ہے، تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔'' غرض تعارف ایسا ہونا چاہیے کہ لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا نہ کرے۔ مثلاً میں اگر فارسی یا اردو ادب کا پروفیسر ہوتا تو آپ توقع رکھ سکتے تھے کہ اقبال کے متعلق کوئی ایسی بات کروں گا جو طالب علموں کے بھی سمجھ میں نہ آسکے، مگر یہ صاحبان جو مجھے یہاں لائے ہیں خود جانتے ہیں کہ میرا سرمایۂ ادب کس قدر محدود ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فارسی جاننے کے سبب اگر میں دو چار شعر فارسی کے پڑھ دوں تو یہی اس موقع کے لیے کافی ہوگا۔

حضرات! اسی لیے میں اپنا تعارف خود کرانا مناسب سمجھتا ہوں۔ میں اس دنیا میں نو وارد ہوں۔ صرف پچاس ساٹھ برس ہوئے کہ یہاں آیا ہوں۔ (اگر آپ نے برنارڈ شا کا کھیل BACK TO METHUSELAH پڑھا ہو تو آپ میرے نووارد ہونے پر متعجب نہیں ہوں گے) اور اس عرصے میں اقبال کے ۳ر شعر بھی میں نے یاد کرلیے ہیں۔ اگر یاد رہا تو آپ کو سناؤں گا۔ اس وقت تو مجھے ایک سردار صاحب کے تین راگ یاد آرہے ہیں۔ سردار جی کے دوستوں میں علمِ موسیقی سے ان کی واقفیت کا بہت چرچا تھا۔ ایک دوست نے پوچھا کہ سردار جی پکے راگ کتنے ہیں؟ جواب دیا کہ تین، ایک تو ہے مالکونس، ایک کوئی اور ہے اور تیسرے کا نام میں بھول گیا ہوں۔ کتنے اچھے لوگ تھے خود چلے گئے اور قصے چھوڑ گئے بلکہ بعض قصے پٹھانوں کے سپرد کر گئے۔ مگر اس ڈر سے کہ کہیں سردار جی کے تین راگوں کا قصہ یہاں نہ دہرایا جائے، میں نے تینوں شعر نئے سرے سے یاد کرلیے ہیں۔ سناؤں گا بعد میں اگر یاد رہا اور وہ شعر بھی یاد رہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ میں شروع ہی سے اقبال جرم کر رہا ہوں۔ اور یہ جرم اقبال کی شاعری کے متعلق ہو تو بڑا جرم ہے اور اقبال جرم کرنے والا بھی زود لاور ہوگا اس لیے یہی تعریف کی۔

اور یہ ۳ر شعر بھی مجھے جس طرح ملے وہ بھی ایک حسن اتفاق ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک کتابوں کی نمائش کے افتتاح کے موقع پر میں نے مذاقاً یہ کہا تھا کہ اگر کتابیں کسی کو تحفتاً دی جائیں تو اُن کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اب اگر کوئی مذاق کے ذریعے اپنا مدعا پورا کرلے تو اسے شاعری کے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ حسنِ طلب کے لیے شعر ضروری نہیں۔ مجھے سوال کا یہ طریقہ پسند ہے کہ مطلب بھی حاصل ہوجائے اور خودی بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے، وہ خودی جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے خودی جو خود کی مؤنث ہے گھر میں رہتی ہے اور شاید اسی لیے اس پردہ نشین کی حفاظت اور بھی ضروری ہے۔ القصہ نمائش میں کتابوں کو دیکھتے ہوئے جس کتاب پر نظر پڑی اس کا نام تھا، 'ترجمانِ اسرار' اور جو 'اسرارِ خودی' کا منظوم ترجمہ ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بات صرف ان حضرات کے اختیار کی ہوتی تو میں کب کا بزرگ بن گیا ہوتا اور بکری کا دودھ اور دو کاغذی لیموں میری غذا ہوتے لیکن بکری کا دودھ پی کر آپ بھینسے کا مقابلہ نہیں کر سکتے

اور جس کے مترجم ہیں ڈاکٹر جسٹس شیخ عبدِ رحمٰن، جنھوں نے رحمٰن کا بندہ بننے سے پہلے یہ ۳رہفت خوان سر کیے ہیں۔(یہاں آپ ۳ر اور ہفت کے تضاد سے پریشان نہ ہوں) وہ ہزار ہا سال سے میرے دوست ہیں مگر اُن سے مجھے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ چوری سے کام کرتے ہیں۔اُنھوں نے کبھی اشارتاً بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ اتنا بڑا کام کر رہے ہیں اور سچ کہتا ہوں کہ اس دوران میں میں نے ان کے چہرے پر خوش اخلاقی کی لاتعداد مسکراہٹوں کے باوجود ایسا کوئی تبسّم نہیں دیکھا جس میں اقبال کی جھلک ہوتی۔ ورنہ میں خود اُن کے پاس جاتا اور اُن ۳ر اشعار میں سے جو میں نے یاد کیے ہیں ایک آدھ پڑھ کر اُن کی علمیت میں اضافہ کرتا اور ان کو موقع دیتا کہ میرے متعلق بھی کچھ لکھیں۔ مگر ان صاحبان کو سوائے لطیفے اور برگساں کے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ میں جا کر لارڈ ڈینگی نظر آنے لگتا ہے (لارڈ ڈینگی کا قصہ پھر سناؤں گا) خیر خدا ہر ایک کو اپنی نیت

سے ٹکرائے۔ میں تو ترجمانِ اسرار کو دیکھ کر دم بخود ہو گیا بلکہ میری ساری خودی کافور ہو گئی۔ لیکن شاید وہ کیفیت میری خودی کا ایک مظاہرہ تھی کیونکہ اسی کتاب میں میں نے پڑھا کہ جب خودی عشق و محبت سے مضبوط ہوتی ہے نظامِ عالم کی ظاہر اور پوشیدہ قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس کتاب کے عشق و محبت میں اپنی خودی اس درجہ استوار کیا کہ مکتبہ کارواں کے منتظمین مسخر ہو کر کتاب مجھے تحفتاً دینے پر مجبور ہو گئے اور میں اس خیال سے کہ ان کی خودی کو ٹھیس نہ لگے کتاب لینے پر مجبور ہو گیا۔ اب اگر آپ کو خودی کے کچھ پہلو نظر آنے لگے ہوں تو میں آگے چلوں۔ میری کمزوری یہ ہے کہ اگر کتاب میں کچھ پڑھ لیتا ہوں تو اسے سچے مسلمان کی طرح صحیح مان لیتا ہوں۔ میں نے اقبال کی ایک نظم کرم کتابی پڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کتابیں پڑھنا ہی چھوڑ دیں۔ کرم کتابی اُس کیڑے کو کہتے ہیں جو کتابوں میں پیدا ہوتا اور اُن کے اوراق کو چاٹ جاتا ہے۔ استعارے میں اُس پڑھنے والے کو بھی کرمِ کتابی کہتے ہیں جو کتابیں ہی پڑھتا اور زندگی کی حرارت سے اور دنیا کے سوز و ساز سے نا آشنا رہے۔ ۵رشعر کی نظم ہے آپ بھی سُن لیجیے:

شنیدم شبے در کتب خانۂ من
بہ پروانہ می گفت کرمِ کتابی

ایک رات میری لائبریری میں ایک کتابوں کا کیڑا پروانے سے شکایت کر رہا تھا۔

بہ اوراقِ سینا نشیمن گرفتم میں نے
بسے دیدم از نسخۂ فاریابی
ہمہ تیرہ روزم زبے آفتابی

میں نے (ابنِ) سینا کے اوراق میں نشیمن بنایا، مگر زندگی کی حقیقت کچھ سمجھ میں نہ آئی اور تاریکی بدستور قائم رہی۔ پروانے نے کیا اچھا جواب دیا۔

نکو گفت پروانہ نیم سوزے
کہ ایں نکتہ را در کتابے نیابی

اس نیم سوختہ پروانے نے اچھی (بات) کہی۔ یہ کہ نکتہ تجھے کسی کتاب میں ملے گا۔

تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را

زندگی جس چیز سے زندہ رہتی ہے وہ تپش ہے، تپش ہی زندگی کو بال و پر عطا کرتی ہے۔

پروانے کی یہ نصیحت سُن کر میں نے بھی کتابیں پڑھنا چھوڑ دیں مگر اس کتاب سے (یعنی ترجمانِ اسرار سے) میں نے بہت کچھ سیکھا۔ خصوصاً جسٹس رحمٰن کے سرِ آغاز سے اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے مقدمے سے اور سب سے بڑی بات یہ سیکھی کہ خودی یہ نہیں ہے کہ کتابیں نہ پڑھوں اور دوسروں کے علم سے بے بہرہ رہ کر اپنے ذاتی عرفان ہی میں مست رہوں اوروں کی خودی سے اپنی خودی کا مقابلہ کرنا ضروری ہے ورنہ خودی نمرود کی خدائی بن جاتی ہے اور سرِ آغاز میں جس خواب سے جسٹس رحمٰن نے آغاز کیا ہے اس نے تو مجھے بے خود کر دیا۔ خواب یہ تھا کہ علامہ اقبالؒ اپنے بے تکلفانہ انداز سے محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ احباب جمع ہیں کہ اتنے میں جسٹس رحمٰن پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر پہنچنے سے وہ نہیں چوکتے اور نشست بھی اچھی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تو علامہ اقبالؒ نے خود ان کو پاس بٹھالیا۔ خواب کے بعد خیال کی باری تھی۔ وہ حمید نظامی کو آیا۔ انھوں نے کچھ دن بعد جسٹس رحمٰن کو خط لکھا جس میں اسرارِ خودی کے منظوم ترجمے کی ضرورت پر اصرار تھا۔ حمید نظامی کی اس خدمت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ خواب کی تعبیر کا باعث بنے، ورنہ جسٹس رحمٰن اب تک خواب ہی دیکھا کرتے۔

میں نے سوچا شاید میں بھی کوئی خواب دیکھوں مگر نہیں دیکھا۔ میں خواب دیکھتا بھی ہوں تو اور چیزوں کے۔ بہت سال ہوئے جب ہندوستان میں جنگِ آزادی جاری تھی تو کسی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آزادی آرہی ہے، گھوڑے پر سوار۔ یاد نہیں کہ اس نے گھوڑے کہا تھا یا بھیڑیا۔ بعد میں بھیڑیے بھی کافی تعداد میں آئے۔ بہر حال خواب دیکھا کہ آزادی آرہی ہے اور انگریز اپنے بستر گول کر رہے ہیں۔ اس

میری کمزوری یہ ہے کہ اگر کتاب میں کچھ پڑھ لیتا ہوں تو اسے سچے مسلمان کی طرح صحیح مان لیتا ہوں۔ میں نے اقبال کی ایک نظم کرم کتابی پڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کتابیں پڑھنا ہی چھوڑ دیں

تقریر کے نتیجے میں پولیس نے اس پر مقدمہ چلایا کہ یہ حکومت کے خلاف نفرت پھیلاتا ہے۔ مجسٹریٹ نے قید کی سزا دی۔ میں نے بطور سیشن جج اپیل سنی۔ بستر گول کرنے پر مجھے ہنسی آئی۔ مجھے ہنسی بھی آتی ہے مگر زیادہ تر رونا آتا ہے۔ میں نے کہا کیا کسی کو یہ بھی اجازت نہیں کہ آزادی کے خواب ہی دیکھ سکے۔ غرض میں نے اسے چھوڑ دیا۔ خوابوں کا مجھ پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اسی لیے میں کچہری میں آدھا وقت سوچتا رہتا ہوں۔ جسٹس رحمٰن کا یہ خواب اتنا غدارانہ نہ تھا مگر اُنھوں نے یہ غداری ضرور کی کہ اقبال سے وعدہ لے لیا کہ آئندہ کسی جج کے خواب میں نہ آئیں۔ چنانچہ میں نے کبھی خواب نہیں دیکھا۔ اس وقت مجھے فیضی کا قصہ یاد آرہا ہے جو بے محل ہونے کے باوجود سنائے دیتا ہوں تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ اگر آپ نے کسی اور طرح سے سنا ہو تو وہ بھی ٹھیک ہے۔ فیضی نے سُنا تھا کہ جب سعدی نے یہ شعر کہا:

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

"سبز درختوں کا ہر پتا خدا کی معرفت کا دفتر ہے۔"
جب سعدیؒ نے یہ شعر کہا تو آسمان سے فرشتے اس کے لیے خلعت لے کر اُترے۔ یہ تو یاد نہیں کہ ایک فرشتہ تھا یا دو۔ عموماً دو دو پھرتے ہیں اور یہ بھی یاد نہیں کہ انھوں نے پر لگائے تھے یا حضرت ابراہیمؑ کے مہمانوں کی طرح بازوؤں کے بغیر تھے مگر شعر معرفت کا تھا اور وہ خلعت لانے پر مجبور ہو گئے۔ ویسے آپ کو یاد ہوگا کہ فرشتے ایسے موقعوں پر ہمیشہ مخالفت کرتے اور خُدا سے یہی کہتے رہے ہیں کہ یہ لوگ دنیا میں فساد کرتے ہیں اور خلافت تو ایک طرف کسی آئین پر بھی نہیں چل سکتے۔ اور "بعضکم لبعض عدوا" "ایک کا ایک دشمن ہے اور 'فی الارض مستقر' ان کے گھر بھی ہیں اور گلبرگ میں بڑے بڑے بنگلے ہیں جو بنا کر بیچتے رہتے ہیں اور وہ بھی نفع پر خصوصاً کراچی میں (یہ کراچی کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ میں اپنی طرف سے کہتا ہوں مگر خاکم بدہن بعض باتوں کا خدا نے ذکر نہیں کیا ہے۔) اچھا 'فی الارض مستقر' مکان تو ہیں 'متاع الی حین' وہ ٹھہرتے تھوڑے وقت کے لیے ہیں۔ یہ تقسیم ہند کے فوراً بعد کے واقعات ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہے۔

صاحبان! میں بے ربط باتوں کا شکار ہو رہا ہوں۔ میں فیضی کا ذکر کر رہا تھا۔ اُس نے سنا تھا کہ فرشتے سعدیؒ کے ایک شعر کے صلے میں خلعت لائے تھے۔ اس نے بھی شعر کہا:

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وحدہ لاشریک لہ گوید

"گھاس کا ہر سرا جو زمین سے نکلتا ہے خدا کے ایک ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔" یہ شعر کہہ کر وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جھوم جھوم کر شعر پڑھا اور فرشتوں کا انتظار کرتا رہا، فرشتہ تو کوئی نہ آیا۔ ایک پرندہ اُدھر [سے] گزرا، آخر وہ بھی پَر والی مخلوق ہے، پرندہ زیادہ نزدیک نہ آیا، اوپر سے پیغام دے کر چلا گیا۔ پیغام بیٹ کی صورت میں تھا جو فیضی کی ڈاڑھی پر گری۔ فیضی نے آہ سرد کھینچی حسرت سے کہا۔ "قدر دانی عالم بالا معلوم شد" میں [یہ نہیں] کہتا کہ آپ اس قصے کو سچ سمجھیں۔ ممکن ہے یہ قصہ [فیضی] کے کسی مخالف نے گھڑا ہو کیونکہ مخالفین اکثر ایسی باتیں گھڑتے رہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب میں نے نہ خواب دیکھا [نہ] خلعت کا اعزاز پایا۔ نہ فیضی کی طرح اپنے آپ کو خلعت کا مستحق سمجھا تو پھر کس حیثیت سے اس پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں۔ نہیں حضرات یہ مجھے پسند نہیں کہ آپ کسی شخص [کو] اُس کے عہدے کے لحاظ سے یہاں کھڑا کریں۔ [یہ] ہم دونوں کی خودی کے منافی ہے۔ آپ اُس چیز کی قدر کریں جو کسی کو یہاں خطاب کرنے کا اہل بناتی ہے۔ [ایک] رسالہ کے مدیر نے ایک بار مجھ سے ملاقات کی خواہش کی۔ اس نے لکھا کہ وہ مختلف مسائل کے متعلق میرے خیالات معلوم کر کے اپنے رسالہ میں شائع کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے لکھا کہ تھوڑے عرصے تک میں [اپنی] میعادِ ملازمت ختم کر کے اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ گاؤں میں ایک چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کر گلابوں میں پیوند [کیا] کروں گا۔ اگر اُس وقت بھی مدیر صاحب مجھے اس [قابل] سمجھیں کہ دنیا کے اہم مسائل کے متعلق میری رائے پوچھیں تو مجھے لطف آئے گا۔ اس وقت تو میری رائے سرکاری ہوگی۔ مدیر صاحب نے پھر نہیں پوچھا اور نہ گاؤں میں پوچھیں گے مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ [کیا] عہدے کے اعزاز کے بغیر کوئی انسان نہیں رہتا؟ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پلیٹ فارم کا درجہ اتنا بڑھا دیں کہ چیف جسٹس خود اس کی طرف دوڑتے ہوئے آئیں۔
شاید کسی ایسے ہی مقام پر اقبالؒ نے کہا ہوگا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کہنے کو تو اچھی بات ہے مگر خودی کو بلند کیسے کریں اور کیا خدا بندے سے سچ مچ اس طرح کا سوال کرتا ہے۔ اقبال میں یہی تو خوبی ہے کہ اُس کی بات سُن کر آپ ناممکن کو بھی ممکن سمجھنے لگتے ہیں۔ دل خوش ہوتا ہے، اپنی ہستی پر اعتبار آنے لگتا ہے ہم توانا ہیں، ہم اولوالعزم ہیں، ہم ارادے کے مالک ہیں کیوں خدا سے سوال کریں۔ خدا خود ہم سے پوچھے گا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی نے یہ اعلان کے طور پر کہا کہ اب ہر کام میری مرضی کے مطابق ہوتا ہے اور تشریح یوں کی کہ میں کوئی خواہش ہی نہیں کرتا، اپنا کام کیے جاتا ہوں اور جب کچھ ہوتا ہے تو سمجھتا ہوں یہی ٹھیک ہے، جو اللہ کی مرضی وہ میری مرضی۔ یہ ہوا ایک مطلب۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ 'السعی منی والاتمام من اللہ' یعنی کوشش تو میری ہوگی اور اس کی تکمیل خدا کے ہاتھ میں ہے بلکہ اقبال تو کہتا ہے کہ کوشش تو وہی اچھی ہے جو جاری رہے اور ختم ہی نہ ہو:

راز حیات پوچھ لے، خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

زندگی کا راز مبارک قدم خضرؑ سے پوچھلے کہ ہر چیز کوشش ناتمام سے زندہ ہے۔ یعنی مسلسل کوشش کرتے رہنے سے نہ کہ منزل پانے سے۔ اس کا مطلب آپ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ جو کام آپ کے سپرد ہوا ہے آہستہ آہستہ قسطوں میں کرتے رہیں تاکہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔ یہی بات فارسی میں یوں ادا کی ہے:

بدریا غلط و باموجش درآویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

دریا کی لہروں سے لڑو۔ اصل زندگی جدوجہد میں ہے۔ زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہو اور انھیں حل کرنے کی کوشش کرو۔ ہر بات اس طرح سے نہ مان لیا کرو جیسے سورج مشرق سے نکلتا اور مغرب میں ڈوبتا ہے۔ زندگی میں بہت سکون ہو تو ساکت ہونے لگتی ہے۔ حرکت ہی زندگی کی نشانی ہے، چلتی کا نام گاڑی ہے، کھڑی ہو تو لوہے اور لکڑی کے ڈبے ہیں:

ساحل اُفتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج زخود رفتہ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم، گر نہ روم نیستم

ساحل ایک جگہ پر کھڑا ہے کہتا ہے کہ اتنی زندگی گزری مگر معلوم نہ ہو سکا کہ میں کون ہوں۔ موج ساحل سے ٹکرا کر بولی۔ دیکھا میں ٹکرائی تو موج کہلائی۔ اگر ساکت رہتی تو معدوم ہوتی۔
میرے بھائیو! تم بھی موج کی طرح خروش کرو۔ خروش نہیں تو خرام ہی کرو۔ جنبش میں آجاؤ، مگر ہاں کچھ کچھ

علامہ اقبالؒ اپنے بے تکلفانہ انداز سے محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ احباب جمع ہیں کہ اتنے میں جسٹس رحمٰن پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر پہنچنے سے وہ نہیں چوکتے اور نشست بھی اچھی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تو علامہ اقبالؒ نے خود ان کو پاس بٹھالیا۔ خواب کے بعد خیال کی باری تھی، وہ حمید نظامی کو آیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنبش تو اب نظر آ رہی ہے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ایک شوریدہ سر شاعر نے، جو ریلوے میں ملازم بھی تھا، بڑے درد سے کچھ شعر کہے جن میں ایک یہ بھی تھا:

دیکھتا کیا ہے میرے منہ کی طرف
قائدِاعظم کا پاکستان دیکھ

پاکستان بننے کے فوراً بعد ایک شوریدہ سر شاعر نے جو ریلوے میں ملازم بھی تھا بڑے درد سے کچھ شعر کہے جن میں ایک یہ بھی تھا

دیکھتا کیا ہے میرے منہ کی طرف
قائدِاعظم کا پاکستان دیکھ

میں اُن دِنوں حکومت کا قانونی مشیر تھا۔ وہ مجموعہ اشعار میرے پاس آیا کہ بتاؤ، اس پر کون سی دفعہ لگتی ہے۔ میں نے کہا کہ خدا کے بندو! وہ تو صرف یہی کہتا ہے کہ میرے منہ کی طرف کیا دیکھتے ہو، پاکستان کی طرف دیکھو کیا یہ وہی ملک ہے، جو قائدِاعظم نے تراشا تھا۔ اگر آپ اس کے منہ کی طرف دیکھنا چاہتے ہیں تو خوشی سے دیکھیں۔ مجھ سے رائے لینے والے بھی ایسا ہی کرتے رہے تھے۔ نہ اُس خودی کو جو قوم میں پیدا ہوگئی تھی اُنھوں نے ترقی دی اور نہ سمندر کی موجوں سے نبرد آزما ہوئے۔ مارشل لاء آیا بلکہ دوسری مرتبہ آیا۔ ایک طرف تو لوگ خوش ہوئے کہ ایسی باتوں پر جو عام زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اچھا اثر ہوا۔ دوسری طرف اس کے خروش سے گھبرانے لگے۔ اس لیے حکومت نے کچھ آپ کے کہنے سے، کچھ میرے کہنے سے، کچھ خود سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ اب حکومت کے عام شعبوں میں جس قدر ہیجان کم ہوگا عوام میں اسی قدر زیادہ اعتماد پیدا ہوگا۔ جب یہ ہوا تو بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ یہ تو مارشل لاء نہ ہوا مذاق ہوا۔ خروشیدن سے اتر کر خرامیدن کی گردان رگوں کو پھر مست کر رہی ہے۔ چنانچہ تین چار دن ہوئے کسی نے مجھ سے کہا کہ رشوت اب پھر زوروں پر ہے۔ اب آپ بتائیے کہ آپ کے ساتھ کیا کیا جائے۔ کیا آپ میں خودی کا ارتقاء کبھی نہیں ہوگا؟ کیا آپ سے یہ نہ ہو سکے گا کہ اپنے اخلاق کو حکومت کی مدد کے بغیر ٹھیک رکھیں۔ میں سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں اور سوائے اس کے چارہ نہیں دیکھتا کہ "پیامِ مشرق" پڑھوں۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ ان ۳؍اشعار کے علاوہ جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا میں نے 'پیامِ مشرق' بھی پڑھا ہے۔ وہ ۳؍شعر میں بیان کر چکا ہوں۔ شاید آپ نے خیال نہ کیا ہو۔ ایک تو یہ کہ خودی پیدا کرو اور خودی سے محبّت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کوششِ ناتمام سے زندگی کی بقا ہے۔ تیسرے یہ کہ زندگی کی مشکلات گھبرا کر سے مری یا ایبٹ آباد یا ولایت کی طرف نہ بھاگو۔ میں آپ کو کسی خاص امتحان میں مبتلا نہیں کر رہا ہوں۔ آپ میں سے ہر ایک کے لیے یہ ممکن ہے کہ اُن پر عمل کر کے پہلے اپنی ذات کو پھر قوم کو فائدہ پہنچائے۔ مختصر یہ کہ جہاں جہاں آپ اپنی کوشش سے، محنت سے اور دیانت داری سے ترقی کرتے ہیں۔ ایک ایک قطرہ مل کر دریا بن جاتا ہے جس سے ملک سیراب ہو سکتا ہے اور باہر سے پانی لانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

صاحبان! میں پھر بے ربطی کا شکار ہو رہا ہوں۔ میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے 'پیامِ مشرق' پڑھی ہے مگر اس کتاب کو مؤنث باندھنا دل نے گوارا نہ کیا کیونکہ پیغام نہایت مردانہ ہے (اس بات پر کہیں خواتین مجھ سے بدظن نہ ہو جائیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تذکیر و تانیث کے جھگڑے میں اکثر مبتلا رہتا ہوں۔ کتابوں کی نمائش میں جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ایک اُردو ڈکشنری نظر سے گزری۔ میں نے کھول کر دیکھی تو پی ڈبلیو ڈی کا لفظ سامنے آیا۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ پی ڈبلیو ڈی سے مراد ہے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ یعنی تعمیر و تخریب کا محکمہ۔ بریکٹوں میں لکھا تھا 'مونث' یعنی پی ڈبلیو ڈی کا لفظ مؤنث کے صیغے میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نے کہا چلو خیر ہوئی کہ یہ محکمہ ابھی مؤنث ہے۔ اگر مذکر ہوتا تو یہ لوگ نہ جانے کیا کر گزرتے۔ ہاں تو ذکر تھا 'پیامِ مشرق' کا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے خیر و شر اور قضا و قدر کے بہت سے تاریک گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ اردو میں تو اقبال نے یہ کہا تھا کہ کبھی کبھی خدا بندے سے خود پوچھتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ لیکن 'پیامِ مشرق' پڑھنے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندے کو بھی خدا سے یہ پوچھنے کا حق حاصل ہوگیا ہے یہ کس طرح کی دنیا بنائی ہے تونے؟

صد جہاں می روید از کشتِ خیالِ ماچوں گل
یک جہاں و آں ہم از خونِ تمنا ساختی

"ہمارے خیال کی کھیتی سے تو سیکڑوں عالم وجود میں آتے ہیں۔ تُو نے تو ایک دنیا بنائی ہے اور وہ بھی آرزوؤں کے خون سے۔"

ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

تو نے یہ کیا آج اور کل کا حیرت خانہ بنایا ہے، مگر ان اشعار کا لطف آپ کو تب آئے گا۔ اگر آپ تھوڑی بہت فارسی جانتے ہوں یا کوئی ایسا نمایاں کام کیا ہو جس کے سبب شیطان کے ہم مشرب قرار پائیں۔ شیطان کو پہلی مرتبہ ملٹن نے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ بڑے جرم کا مرتکب ہوا تھا۔ آخر بڑی شخصیت رکھتا ہوگا جو خدا سے کہہ سکا کہ آدمی کو تو نے مٹی سے بنایا اور مجھے آگ سے۔

نوریٔ ناداں نیم سجدہ بہ آدم برم
او بہ نہاد است خاک من بہ نژادِ آذرم

میں کوئی نادان فرشتہ ہوں کہ آدم کو سجدہ کروں اس کی بناء مٹی پر ہے میری آگ پر۔ شیطان کی اس جرأت پر دل میں عزت پیدا ہوتی ہے اور اقبال تو ہمدردی بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر قرآن سے یہ معلوم نہ ہوتا کہ آدمی کا کیا قصور تھا اور شیطان نے کیا نافرمانی کی تھی تو اقبال کو پڑھ کر تو میں یہ سمجھتا کہ دونوں بیچاروں پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ ہماری تقصیر صرف یہ تھی کہ گندم کا دانہ کھایا اور اس کی خطا یہ کہ اس نے آدم کو سجدہ نہ کیا اور خدا اب دونوں سے ناخوش ہے۔

جرم ما از دانۂ تقصیر او از سجدہ
نے بآں بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی

ہمارا جرم دانہ (کھانا) اور اس کا قصور سجدہ نہ کرنا۔ اب تو (اللہ) نہ تو اس سے بنایا ہے نہ ہم سے بنائی ہے، مگر سچ پوچھیے تو فتنے کا باعث گندم کا دانہ ہے اور ہم اب بھی گندم کو نہیں چھوڑتے بلکہ اس فکر میں لگے ہیں کہ کس طرح کھاد کے استعمال سے اس کی پیداوار بڑھائیں۔ البتہ بنگال والے تو اُس دن سے ایسے ڈرے ہیں کہ قحط سالی بھی ہو تو چاول ہی مانگتے ہیں اور سنا ہے کہ بعض اوقات تو موت کو گندم پر ترجیح دیتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جو اختلاف مغربی اور مشرقی پاکستان میں ہے وہ دراصل زبان کا نہیں، چاول کا ہے اور چاول بہشت میں نہیں ملتے۔ مگر اب تو نہ چاولوں کا جھگڑا ہے نہ زبان کا اختلاف، نہ اس بات کا کہ کراچی مرکز کے نیچے ہو یا مرکز کے اوپر، نہ اس بات کا کہ ایک یونٹ اچھا ہے یا چار۔ آپ لڑتے بھی ہیں تو کن باتوں پر۔ مگر اب تو

اقبال تیرے عشق نے سب بل دیے نکال

نوٹ: سامعین کے قہقہوں اور تالیوں کی وجہ سے دوسرا مصرعہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

وجۂ شرمندگی

ایک کم عقل دولت مند شخص کا سچا ماجرا

وہ بھری محفل میں ڈپٹی کمشنر سے اُس کی تنخواہ کا تذکرہ لے بیٹھا تھا

حبیب اشرف صبوحی

۱۹۹۰ء میں میرا تبادلہ لاہور سے ایبٹ آباد ہوگیا۔ ہمارے محکمہ کا کام ایبٹ آباد اور اُس کے نواحی علاقوں میں سوئی گیس بچھانے سے تھا اور عوام کو ایک بڑی سہولت سے مستفید کرنا تھا۔

اس وجہ سے وہاں کے عوام نے ہماری پذیرائی کی اور بہت تعاون کیا۔ ہمارے دفتر کے انچارج جو چیف انجینئر تھے نہایت ایمان دار، خوش مزاج اور اعلیٰ خوبیوں کے مالک تھے۔ جب کوئی انھیں محکمہ کا اعلیٰ عہدیدار سمجھتے ہوئے کسی دعوت یا سیمینار کی شرکت کی دعوت دیتا تو وہ کہتے تھے کہ میں اکیلا نہیں آسکتا۔ جب تک میری پوری ٹیم نہیں جائے گی۔ اس وقت صرف چار پانچ آفیسر ہوا کرتے تھے چنانچہ ہمارے انچارج صاحب جہاں جاتے تھے وہاں ہم بھی جاتے تھے۔ ہنسی مذاق ہوتا اور بہت اچھا وقت گزر جاتا۔ ایک روز علاقہ کی ایک بڑی معزز اور معروف شخصیت ہمارے انچارج صاحب کے پاس آئی اور کہا ... نے ایبٹ آباد کے تمام محکموں کے آفیسرز کو بلایا ہے ... تعلق عوام کی فلاح و بہبود سے ہے کیونکہ آپ کا تعلق عوام کی فلاح و بہبود کے محکمے سے ہے۔ ڈپٹی ... ایبٹ آباد مہمان خصوصی ہوں گے۔ آپ کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔ ہمارے انچارج نے کہا کہ میرے ساتھ میرے ساتھی بھی ہوں گے۔ ہمارے میزبان نے ہمیں بلا کر فرداً فرداً کھانے کی دعوت دی۔

ہمارے میزبان جن کا نام میں جانی صاحب ہی لوں گا، کئی سال پہلے کسی خلیجی ریاست میں چلے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے بہت پیسے کمائے اور یہاں آ کر کافی جائیداد وغیرہ بنائی۔ تعلیم اور تربیت کی کمی تھی۔ اپنے تعلقات بنانے اور معاشرہ میں اپنا ایک مقام پیدا کرنے کے لیے مختلف قسم کے اجتماعات کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔

مقررہ تاریخ اور مقررہ دن جب ہم جانی صاحب کے گھر گئے تو انھوں نے کافی اچھا انتظام کیا ہوا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی بڑے آدمی کے گھر آئے ہوئے ہیں۔

ڈپٹی کمشنر صاحب کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ تاخیر سے پہنچے۔ انھوں نے دیر سے آنے کی معذرت کی۔ میزبان نے سب کا فرداً فرداً تعارف اُن کے نام اور اُن کے محکموں کے حوالے سے کیا۔ تھوڑی دیر رسمی بات چیت ہوتی رہی۔ پھر کھانا شروع ہوگیا۔ انواع قسم کے کھانے تھے اور پیسے کا بے دریغ استعمال کیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد سب گول دائرہ میں بیٹھ گئے۔ درمیان میں ڈپٹی کمشنر صاحب تھے اُن کے ساتھ جانی صاحب تھے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب محکموں کے آفیسرز سے اُن کے ترقیاتی کاموں کے بارے میں گفت و شنید کر رہے تھے اور عوامی مسائل کے حل کی طرف زور دے رہے تھے۔ اسی دوران حاجی صاحب نے ڈپٹی کمشنر صاحب سے پوچھا ”خان صاحب! آپ کی کتنی تنخواہ ہے؟“ یہ ایسا سوال تھا جسے سُن کر تمام اہلِ محفل مبہوت ہوگئے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا کہ حاجی صاحب یہ موقع ایسی بات پوچھنے کا نہیں ہے، یہ ذاتی معاملات ہوتے ہیں۔ یہ سوالات پوری محفل میں نہیں پوچھے جاتے۔ یہ بات کہہ کر ڈپٹی کمشنر صاحب پھر ضلع کے مختلف کاموں اور اسکیموں کے بارے لوگوں سے پوچھتے رہے اور متعلقہ محکمہ کے آفیسر کو ہدایات دیتے رہے۔

چند لمحوں بعد جانی صاحب نے دوبارہ ڈپٹی کمشنر صاحب سے اپنا سوال دُہرایا۔ اس مرتبہ خان صاحب نے کہا کہ ہماری تنخواہ بہت کم اور اختیارات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

میزبان نے پھر کہا کہ میں اپنی معلومات کے لیے تنخواہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس پر ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا کہ ہماری تنخواہ ۱۰ ہزار سے ۱۵ ہزار کے درمیان ہوتی ہے۔ اس پر جانی صاحب نے کہا بس اتنی تھوڑی تنخواہ۔ اس سے زیادہ تنخواہ تو میرا ڈرائیور لے لیتا ہے۔ یہ بات ڈپٹی کمشنر صاحب کے لیے ذلت کے مترادف تھی۔ وہ فوراً کرسی سے اُٹھے۔ ان کا رنگ غصہ کی وجہ سے بالکل سرخ تھا۔ انھوں نے حاجی صاحب کے مُنہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا اور کہا کہ میں ۱۵ ہزار روپے لے کر تمھیں تھپڑ بھی مار سکتا ہوں اور اندیشہ نقصِ امن کے تحت تمھیں جیل بھی بھیج سکتا ہوں لیکن تمھارا ڈرائیور یہ کام نہیں کر سکتا۔

تم نے جائز و ناجائز طریقوں سے دولت تو کمالی لیکن تم میں تعلیم اور تربیت کی ہی نہیں، بنیادی عقل اور آداب کی بھی کمی رہی۔ اگر آج تم میں تعلیم اور تربیت ہوتی تو آج یہ ذلت تمھیں اُٹھانی نہیں پڑتی۔ چند لمحے پہلے جس محفل میں ہنسی مذاق اور بڑی شگفتہ گفتگو ہو رہی تھی، یوں خاموشی چھا گئی جیسے ایک دم سے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ دوسرے روز ایبٹ آباد کے تمام اخبارات میں سُرخی لگی کہ ڈپٹی کمشنر صاحب نے جانی صاحب کو بدتمیزی کرنے پر تھپڑ مار دیا اور اس طرح ایک جاہل آدمی اپنی جاہلیت اور کم علمی کی بنا پر بھری محفل میں اپنی عزت، وقعت اور تعلقات سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

جب میں یہ مضمون لکھ رہا تھا تو میں نے اپنے ایک دوست جو اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے۔ ایبٹ آباد فون کر کے پوچھا آیا حاجی صاحب بقیدِ حیات ہیں یا انتقال کر گئے ہیں، تو میرے دوست نے جواب دیا کہ وہ کئی سالوں سے ایبٹ آباد سے باہر ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ حاجی صاحب بقیدِ حیات ہیں یا نہیں۔ اگر وہ بقیدِ حیات ہوئے تو آپ کا مضمون پڑھ کر ضرور کوچ کر جائیں گے۔ ■

WWW.PAKSOCIETY.COM

منفرد خوش طبع شاعرِ مشرق کی روزمرہ گفتگو
سے دلچسپ واقعات کا انتخاب

اقبال کی شگفتہ مزاجی

وہ بڑی شائستگی سے گہری اور پُر مزاح بات کہہ جاتے تھے

ایس مُغنی حیدر

علامہ اقبال سنجیدہ اور متین ہونے کے باوجود بڑے بذلہ سنج اور خوش طبع تھے۔ گفتگو خواہ کسی قسم کی ہو، مزاح کا پہلو ضرور ڈھونڈ لیتے۔ مہذب و شائستہ لطائف کی قدر کرتے۔ خود بھی لطائف بنا کر دوست احباب کو ہنساتے رہتے، بعض اوقات لطائف کے ذریعے اہم مسائل بھی حل کر دیتے تھے۔

ایک ہی تو ہے:

ایک مرتبہ علامہ اقبال بیمار پڑے۔ معالج نے آم کھانے سے منع کر دیا۔ بہت مضطرب ہوئے۔ کہنے لگے ”مرنا تو برحق ہے آم نہ کھا کر مرنے سے آم کھا کر مر جانا بہتر ہے۔“ اصرار بڑھا تو حکیم نابینا نے ہر روز ایک آم کھانے کی اجازت دے دی۔ مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں۔ ”میں ایک دن عیادت کے لیے علامہ صاحب کی قیام گاہ پر حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ کے سامنے ایک سیر کا بمبئی آم رکھا ہے اور آپ اسے کاٹنے کے لیے چھری اٹھا رہے ہیں۔ میں نے عرض کی ”آپ نے پھر بد پرہیزی شروع کر دی“۔ فرمانے لگے ”حکیم نابینا نے دن میں ایک آم کھانے کی اجازت دے دی ہے اور یہ آم بہر حال ایک ہی تو ہے۔“

سکندری اور قلندری:

ایک مرتبہ علامہ اقبال باہر بیٹھے تھے کہ ایک فقیر تہبند باندھے ہاتھ میں بڑی سی لٹھ لیے نمودار ہوا اور آتے ہی علامہ اقبال کی ٹانگیں دبانے لگا۔ علامہ اقبال کچھ دیر خاموشی سے پاؤں دبواتے رہے پھر فرمایا ”کیسے آنا ہوا؟“ فقیر نے جواب دیا ”میں اپنے پیر کے پاس گیا تھا۔ اُنھوں نے فرمایا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کو تمھارے علاقے کا قلندر مقرر کیا گیا ہے۔“ علامہ اقبال نے کہا ”لیکن مجھے تو اس منصب قلندری کے عطا کیے جانے کی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔“ فقیر نے علامہ کی اس بات کو قلندری کے کوچے کی کوئی رمز جانا اور بیٹھا پاؤں دباتا رہا۔ اتنے میں چوہدری محمد حسین تشریف لے آئے اور آتے ہی سر سکندر حیات سے متعلق کوئی بات کہنا چاہتے تھے کہ علامہ اقبال نے ٹوکا اور کہا ”چوہدری صاحب اس سکندری کو رہنے دیجیے آج تو یہاں قلندری کی باتیں ہو رہی ہیں۔“

انہیں سمجھائیں:

جن دنوں علامہ اقبال کی بینائی کمزور ہو چکی تھی۔ نصراللہ خاں جو ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۸ء روزنامہ زمیندار سے وابستہ رہ چکے تھے، آپ کو سول اینڈ ملٹری گزٹ پڑھ کر سناتے تھے۔ نصراللہ خاں کے ایک عزیز دہریہ ہو گئے تھے اور یہ انھیں لے کر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے ”میرے یہ عزیز حلقہ شیطان میں جا شامل ہوئے ہیں، آپ انہیں سمجھائیں۔ ہنس کر فرمانے لگے ”جس کو اللہ نہ سمجھا سکا اسے میں کیا سمجھا سکوں گا۔“

لطیف طنز:

خان نیاز الدین خان جالندھر کی بستی دانش منداں کے رئیس اور علم و ادب سے شغف رکھنے والے بزرگوں میں سے تھے۔ ایک قدرِ مشترک دونوں اصحاب میں یہ بھی تھی کہ دونوں اعلیٰ نسل کے کبوتروں کے ناقد تھے۔ خان صاحب، علامہ اقبال کو جالندھر سے اعلیٰ قسم کے کبوتروں کے جوڑے بھیجتے تھے۔ اپنے بچوں سے محبت کرنے اور پرورش کرنے کا جذبہ جانوروں میں بہت ہوتا ہے لیکن ایک جوڑا اُنھوں نے ایسا بھیجا جو ان اوصاف سے بالکل عاری تھا۔ چنانچہ ایک خط میں خان صاحب کو تحریر فرماتے ہیں ”آپ کے کبوتر بہت خوب ہیں مگر افسوس کہ زمانہ حال کی مغربی تہذیب سے بہت متاثر معلوم دیتے ہیں۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ بچوں کی پرورش سے انتہائی بیزار ہیں۔“

احتجاج:

ایڈیٹر ”رسالہ ہمایوں“، میاں بشیر احمد بیرسٹر لکھتے ہیں: ”۱۹۱۴ء میں، میں ولایت سے بیرسٹری کرنے کے بعد آیا اور لاہور چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے لگا۔ بار روم میں علامہ اقبال کو اکثر دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ایک دن میاں شاہ نواز بیرسٹر (ہمایوں صاحب کے تایا زاد بھائی) جو کہ علامہ کے خاص دوستوں میں سے تھے بار روم میں اکٹھے بیٹھے خوش گپیوں میں محو تھے۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے ”آئیے مولانا بشیر!“ یہ سن کر مجھے شرم محسوس ہوئی۔ میں جب بھی علامہ اقبال سے ملتا تو وہ مسکرا کر مجھے مولانا بشیر کہہ کر پکارتے۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے دبی زبان میں احتجاج کیا۔ ڈاکٹر صاحب میں کہاں کا مولانا ہوں۔ یہ سن کر مسکرائے اور فرمانے لگے ”واہ بھئی واہ! مولانا کوئی بری بات ہے اور کیا مولاناؤں کے سر پر

اعجاز مسیحائی

اردو زبان کے بلند پایہ شاعر مرزا غالب کی طرح علامہ اقبال کو بھی آم بہت پسند تھے۔ موسم کے آغاز میں خود بھی بازار سے منگواتے اور دوست احباب کو بھی بھیجتے تھے۔ ایک مرتبہ آموں کے موسم میں حضرت اکبر الٰہ آبادی نے علامہ اقبال کو الٰہ آباد سے لنگڑا آم بھیجا۔ رسید دیتے وقت علامہ اقبال نے درج ذیل شعر بطور شکریہ لکھ بھیجا جس سے مزاح کا لطیف پہلو ظاہر ہے۔

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبر
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

WWW.PAKSOCIETY.COM

زندہ تصنیف

گورنر پنجاب سرایڈورڈمیکلیگن نے ایک مرتبہ علامہ اقبال سے دریافت کیا۔ ''آیا آپ کے خیال میں کوئی ایسا موزوں شخص ہے جسے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا جاسکے۔'' اس ضمن میں علامہ نے مولوی میر حسن، پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ کا نام تجویز کیا۔ گورنر نے پوچھا ''میں نے ان کا نام پہلی مرتبہ آپ ہی سے سنا ہے کیا اُنھوں نے کوئی کتاب بھی تصنیف کی ہے؟'' جواب میں علامہ اقبال نے کہا ''کوئی کتاب تو اُنھوں نے نہیں لکھی البتہ ان کی ایک زندہ تصنیف ضرور موجود ہے۔'' گورنر نے قدرے حیران ہوکر پوچھا ''وہ کون سی؟'' ''میں ان کی زندہ تصنیف ہوں، وہ میرے استادِ مکرم ہیں۔'' گورنر اس مزاحیہ جواب سے بہت لطف اندوز ہوا اور ایک سادہ سی تقریب میں مولوی صاحب کے لیے شمس العلماء کا خطاب تجویز کیا گیا۔

سینگ ہوتے ہیں۔ آخر کچھ عربی جانتے ہی ہونا۔''

افطاری کے لیے سامان:

ماہِ رمضان میں ایک مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر سعید اللہ صدر شعبہ فلسفہ اور پروفیسر عبدالواحد، علامہ اقبال کے دولت کدے پر گئے۔ کچھ دیر بعد مدیر انقلاب مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک بھی تشریف لے آئے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ افطار کا وقت ہوگیا۔ آپ نے گھنٹی بجا کر اپنے نوکر کو بلایا اور اس نے کہا ''افطار کے لیے سنگترے، کھجوریں کچھ نمکین اور میٹھی چیزیں جو کچھ ہو سکے سب لے آؤ۔'' سالک صاحب نے عرض کی ''اُفوہ! اتنا سامان منگوانے کی کیا ضرورت ہے، کھجوریں ہی کافی ہیں۔'' علامہ اقبال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''سب کچھ کہہ کر ذرا رعب تو جمادیں۔ کچھ نہ کچھ تو لائے گا۔''

خواہش:

آخری دنوں میں علامہ اقبال کی صحت بڑی حد تک گر چکی تھی۔ بوقتِ شب دمے کے دورے بھی پڑنے لگے تھے۔ ضعف قلب کے ساتھ جگر بھی بڑھ گیا تھا۔ معالجوں نے آپ کو ترش اشیاء اور چاول وغیرہ کھانے سے منع کردیا تھا۔ علامہ اقبال کو پلاؤ اور کباب بہت پسند تھے۔ آپ اُنھیں اسلامی غذا کہا کرتے۔ ایک دن حکیم محمد حسن قرشی سے فرمانے لگے ''میری دلی خواہش ہے کہ ایک روز میرے ہاں آپ کی دعوت ہو۔ آپ میرے سامنے بیٹھ کر پلاؤ کھائیں تاکہ اگر میں پلاؤ کھا نہیں سکتا تو کم از کم کھاتے ہوئے دیکھ لوں۔'' ■

باتیں دانش کی

رفیدہ کلیم فاروقی

کہا حضرت عثمان غنیؓ نے

1. تو کتنا بھی مفلوک الحال ہو، لیکن مغلوب الحال نہ ہو۔
2. علم بغیر عمل بھی فائدہ مند، اور عمل بغیر علم کے بے فائدہ۔
3. تونگروں کے ساتھ عالموں، زاہدوں کی دوستی ریاکاری ہے۔
4. فقیر کا ایک درہم صدقہ بہت ہے، غنی کے ایک لاکھ درہم سے۔
5. جانور اپنے مالک کو پہچانتا ہے لیکن انسان اپنے اللہ کو نہیں پہچانتا۔
6. اس نے اللہ تعالیٰ کا حق نہیں جانا، جس نے لوگوں کا حق نہیں پہچانا۔
7. جو شخص التجائے نگاہ کو نہیں سمجھ سکتا، اس کے سامنے اپنی زبان کو شرمندہ نہ کر۔

حضرت عثمانؓ کا تعلق قریش کی ایک شاخ بنی امیہ سے تھا۔ آپ ۵۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عفان تھا۔ آپؓ مکہ کے چند لوگوں میں سے تھے جنھیں لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ آپؓ فطرتاً نرم خو، شریف الطبع، مہربان اور حد درجہ باحیا تھے۔ سخاوت و غنا کی وجہ سے آپؓ کو "غنی" کہا جاتا تھا۔ آپ نے اسلام کی خاطر بہت سا مال خرچ کیا۔ مدینہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کو پانی کی قلت کا سامنا ہوا تو حضرت عثمانؓ نے بیر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کردیا۔ حضورﷺ نے آپؓ کو زندگی ہی میں جنت کی نوید دی۔ حضورﷺ نے اپنی بیٹی حضرت رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے کردی۔ آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دعوت پر اسلام لائے۔ رات بھر عبادت میں مشغول رہتے۔ حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد حضورﷺ کی دوسری صاحبزادی حضرت کلثومؓ سے شادی ہوئی، اسی لیے ذوالنورین کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپؓ کے زمانے میں رے اور روم کے قلعے فتح ہوئے۔ سابور، آذربائیجان، قبرص، اصطخر، قساد، جور، خراسان، نیشاپور، طوس، سرخس، مرو اور طبق کے مختلف علاقے فتح ہوئے۔ آپ کے دورِ حکومت میں آذربائیجان اور آرمینیا کی بغاوت کو فرو کیا گیا۔ آپؓ کے دورِ خلافت میں حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ گورنروں کی جگہ آپ کے قبیلے کے گورنروں کی تقرری ہوئی جو دنیاوی مال و دولت کے خواہاں تھے۔ اور عوام کی انھیں چنداں پروانہ تھی۔ جس پر عوام نے ان کی معزولی کا مطالبہ کیا، لیکن آپؓ اپنی طبیعت کی نرمی کی وجہ سے ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کرسکے، جس سے حالات قابو سے باہر ہوگئے۔

باغی مدینہ میں جمع ہوئے اور جمعہ ۱۷؍ ذی الحجہ سن ۳۵ھ کو آپ کو اس وقت شہید کردیا جب آپ تلاوتِ قرآن فرما رہے تھے۔ آپ کی عمر اس وقت ۸۲؍ سال تھی۔ آپ کو جامع القرآن بھی کہا جاتا ہے۔ آپؓ نے سیدہ حفصہؓ سے قرآن پاک کے اوراق لے کر انھیں حضورﷺ کی دی ہوئی ترتیب کے مطابق یکجا کیا۔ اور اس کی نقول کوفہ، دمشق، مکہ مکرمہ اور بصرہ ارسال کیں اور ایک ایک صحابی کو ہمراہ بھیجا تاکہ وہاں کے لوگوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا سکھا سکیں۔ آپ کا خط بہت اچھا تھا اور آپ کاتبِ وحی بھی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے دورِ حکومت میں آپ مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد آپ حضرت عمرؓ کی نامزد کمیٹی کے فیصلے کے نتیجہ میں خلیفہ منتخب ہوئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہا فیثا غورث نے

1 جس راز کو دشمن سے چھپانا چاہتے ہو، اس کو دوست پر بھی ظاہر نہ کرو۔

2 مرد کا امتحان عورت، عورت کا دولت اور دولت کا امتحان آگ سے ہوتا ہے۔

3 نفسِ طاہر اوقاتِ خلوت میں دوسروں کی نسبت اپنے آپ سے زیادہ شرم ظاہر کرتا ہے۔

4 ہمیں دوسروں کی شیخی اس لیے ناپسند آتی ہے کہ وہ ہماری شیخی کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے۔

5 جو شخص ایسا دوست نہیں رکھتا کہ اس کے آگے دل کی باتیں کہے، وہ مردم خور ہے، جو اپنے دل کو کھاتا ہے۔

6 حیوانات پر بیشتر آفات بے زبانی کے باعث لاحق ہوتی ہیں اور انسان کے لیے نزولِ بلا زبان کے باعث۔

7 انسان برسوں میں جوان ہوتا ہے، لیکن اگر وہ اپنے وقت کو بہترین طریقے پر صرف کرے تو گھنٹوں میں بوڑھا یعنی تجربہ کار ہو جاتا ہے۔

ایک انتہائی متنازعہ شخصیت کا مالک فلاسفر جس کی وجہ شہرت افلاطون اور ارسطو کے زمانے تک ریاضی نہیں بلکہ روحانیت، بعد الموت زندگی، مذہبی رسومات کے پرچارک اور ایک ایسی عجیب وغریب عبقری شخصیت کے طور پر ہے۔ جس کی ایک ران سونے کی تھی، اور جو لوگوں کو بیک وقت ۲ ر مختلف مقامات پر نظر آجاتا تھا۔ وہ ایک ایسے مذہبی طریق زندگی کا پرچارک تھا جس میں کھانے پینے، مذہبی رسومات کی ادائی وغیرہ کی تحت پابندی تھی۔ وہ کائنات میں اجسام فلکی میں موجود تناسب، اور حسابی نظام کے تحت ان اجسام کی حرکت، جس کا موسیقی کے ساتھ تال میل ہو، کا قائل تھا۔
اس کے باپ کا نام مینیسارکس اور ماں کا نام پیتھاکس تھا جو ساموس کی رہنے والی تھی۔ باپ تاجر تھا جو ٹائر سے ساموس آیا تھا۔
اس نے شام میں کیلیڈینر سے تعلیم حاصل کی۔ بربط بجانے میں مہارت حاصل کی، شاعری کی، ہومر کا مطالعہ کیا۔ اس نے اپنے زمانے کے ۳ مشہور اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ ۱۸، ۲۰ سال کی عمر میں فیریکائڈز کی صحبت میں ریاضی سے شغف پیدا کیا۔ اسی نے فیثا غورث کو مصر جا کر علم فلکیات سیکھنے کی ترغیب دی۔ تھیلس اور اس کے شاگرد انیکسمنڈ نے فیثا غورث کو جیومیٹری اور آفاقیات کی تعلیم دی۔
۵۲۲ ق م میں پولی کریٹس کی موت پر معلوم نہیں کس طرح اسے قید سے رہائی ملی اور واپس ساموس آگیا۔ وہاں سے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کریٹ گیا۔ پھر اس نے ساموس آ کر ایک اسکول کھولا جسے فیثا غورث کا "نصف کرہ" کہا جاتا ہے۔ اس اسکول میں صداقت، انصاف، اچھائی اور عملی نقطہ نظر پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ مدرسہ آج بھی قائم ہے۔ فیثا غورث نے ۵۱۰ ق م میں اٹلی جا کر کروٹون میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ میتھا میٹکوئی (ریاضیات) کے متعلق ایک سوسائٹی قائم کی۔ فیثا غورث کے پیرو اس کے درج ذیل نظریات پر یقین رکھتے تھے۔
ا۔ گہرائی میں فطرت ریاضی پر مبنی ہے۔ ۲۔ روحانی طہارت کے لیے فلسفہ کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ۳۔ روح کا الوہیت سے تعلق (اتحاد) ممکن ہے۔ بعض علامات اور رموز عارفانہ اہمیت کی حامل ہیں۔
اس نے میتھا میکوئی سے متعلق تمام پیروؤں کو وفاداری اور رسومات کی پابندی کا حکم دیا۔ فیثا غورث نے موسیقی کی ریاضیاتی تھیوری میں قابل قدر اضافہ کیا۔ موسیقی سے بیماروں کو سکون پہنچانے اور علاج کی کوشش کی۔ طاق، جفت اور سالم نمبروں اور تکونی اشکال پر تحقیقی کام کیا۔ اس کے علاوہ کائنات کی تخلیق، مابعد الطبیعیات، جانوروں کی ارتقائی حیات کے علاوہ بے شمار موضوعات پر اس کے نظریات ملتے ہیں۔

بے یقینی کی دنیا میں یقین سے بھرے ایک حکیم صاحب کا ماجرا
ایک روز ان کے یقین کی آزمائش ہونے والی تھی

رازق، رازق، تو ہی رازق

ڈاکٹر پروفیسر مزمل احسن

مئی

۱۹۸۶ء تک کا زمانہ مسقط (عمان) کی فوج میں بطور ایک اکاؤنٹنٹ گزرا، وہاں ہمارے ساتھ ایک رشید صاحب بھی ہوا کرتے تھے، وہ حافظ آباد کے قریب واقع کسی گاؤں کے رہنے والے تھے، وہ وقتاً فوقتاً گاؤں کا چکر لگاتے رہتے تھے، وہ اکثر ایک حکیم صاحب کا ذکر کرتے، ان حکیم صاحب کی باتیں کچھ عجیب سی تھیں۔ مجھے بھی آج تک یاد ہیں۔ حکیم صاحب کا گاؤں گکھڑ سے چند کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا۔

حکیم صاحب کا بچپن اپنے دادا کی گود میں گزرا تھا، ان کے والد اُن کی پیدائش سے قبل انتقال فرما گئے تھے، دادا نے بچپن ہی سے عبدالحکیم کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا کہ اللہ کہتا ہے میں نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ عبادت میں سے صرف وہ وقت اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا جو اس کے دیے ہوئے رزق کی تلاش کرنے میں لگے گا اور جو وقت انسان کے بس سے باہر ہے جیسے سونا، آرام کرنا، وغیرہ وغیرہ۔

گاؤں میں گھر کا کافی بڑا صحن تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ گھر کے گرد کوئی چار دیواری بھی نہ تھی۔ گھر میں ایک طرف بڑے بڑے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ صبح شام دنیا جہان کی چڑیاں وہاں آ کر جمع ہو جاتیں اور چیں چیں کر کے آسمان سر پر اُٹھا لیتیں۔ صبح فجر ادا کر کے آپ ننھے حکیم کو گود میں لٹا کر ایک چارپائی پر بیٹھ جاتے اور چڑیوں کی آواز سے آواز ملانے کی کوشش کرتے۔ کہا کرتے یہ کہہ رہی ہیں "رازق، رازق، تو ہی رازق۔" گھر میں اکثر کہا کرتے کہ یہ اپنے دل میں دعا مانگ سکتی تھیں جیسے دنیا کے باقی سیکڑوں ہزاروں جانور مانگتے ہیں۔ لیکن انسان کو احساس دلانے کے لیے اللہ نے ان کو باآواز بلند روز کا رزق روز صبح مانگنے کا حکم دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

عبدالحکیم کو سمجھاتے رہتے کہ ہمارے بزرگوں نے اور ہم نے تو خدا سے چڑیوں کی طرح رزق مانگ کر زندگی گزار لی اور بڑے سکھی رہے۔ تم بھی یہ راہ اختیار کرو گے تو زندگی بڑے سکون سے گزر جائے گی۔

شام کو دادا جان عصر کی نماز کے بعد پھر چڑیوں کے ساتھی بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتے۔ وہ کہا کرتے غور کرو وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے تو یہی سمجھ آتا ہے کہ کہہ رہی ہوں ''شکر شکر مولا تیرا شکر'' یعنی تو نے ہماری صبح کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا اور ہمیں اتنا رزق دیا کہ ہم کھا بھی نہ سکے۔

عبدالحکیم صاحب کا گکھڑ میں جی ٹی روڈ پر مطب ایک پرانی سی عمارت میں ہوتا تھا۔ گرمیوں میں ۸ بجے اور سردیوں میں ۹ بجے دکان لازماً کھل جاتی تھی لیکن دکان بند ہونے کا کوئی مقررہ وقت نہیں تھا۔ کہا کرتے تھے جب کھاتہ مکمل ہوگیا، دنیاداری کا وقت ختم ہوگیا۔

رشید بتاتا کہ کھاتے کا بھی بڑا دلچسپ چکر تھا۔ حکیم صاحب صبح بیوی کو کہتے کہ جو کچھ آج کے دن کے لیے تم کو درکار ہے ایک چٹ پر لکھ کر دے دو۔ بیوی لکھ کر دے دیتی۔ آپ دکان پر آ کر سب سے پہلے وہ چٹ کھولتے۔ بیوی نے جو چیزیں لکھی ہوتیں۔ اُن کے سامنے اُن چیزوں کی قیمت درج کرتے، پھر اُن کا ٹوٹل کرتے۔ پھر اللہ سے دعا کرتے کہ یااللہ! میں صرف تیرے ہی حکم کی تعمیل میں تیری عبادت چھوڑ کر یہاں دنیا داری کے چکروں میں آ بیٹھا ہوں۔ جوں ہی تو میری آج کی مطلوبہ رقم کا بندوبست کر دے گا۔ میں اُسی وقت یہاں سے اُٹھ جاؤں گا اور پھر یہی ہوتا۔ کبھی صبح کے ساڑھے نو، کبھی دس بجے حکیم صاحب مریضوں سے فارغ ہو کر واپس اپنے گاؤں چلے جاتے۔

ایک دن حکیم صاحب نے دکان کھولی۔ رقم کا حساب لگانے کے لیے چٹ کھولی تو وہ چٹ کو دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایک مرتبہ تو ان کا دماغ گھوم گیا۔ اُن کو اپنی آنکھوں کے سامنے تارے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ آٹے دال وغیرہ کے بعد بیگم نے لکھا تھا، بیٹی کے جہیز کا سامان۔ کچھ دیر سوچتے رہے پھر باقی چیزوں کی قیمت لکھنے کے بعد جہیز کے سامنے لکھا ''یہ اللہ کا کام ہے اللہ جانے۔''

ایک دو مریض آئے ہوئے تھے۔ اُن کو حکیم صاحب دوائی دے رہے تھے۔ اسی دوران ایک بڑی سی کار اُن کے مطب کے سامنے آ کر رکی۔ حکیم صاحب نے کار یا صاحبِ کار کو کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ کئی کاروں والے ان کے پاس آتے رہتے تھے۔

دونوں مریض دوائی لے کر چلے گئے۔ وہ سوٹڈ بوٹڈ صاحب کار سے باہر نکلے اور سلام کر کے بنچ پر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ اگر آپ نے اپنے لیے دوائی لینی ہے تو ادھر سٹول پر آ جائیں تاکہ میں آپ کی نبض دیکھ لوں اور اگر کسی مریض کی دوائی لے کر جانی ہے تو بیماری کی کیفیت بیان کریں۔

وہ صاحب کہنے لگے حکیم صاحب میرا خیال ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ لیکن آپ مجھے پہچان بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیونکہ میں ۱۵، ۱۶ سال بعد آپ کے مطب میں داخل ہوا ہوں۔ آپ کو گزشتہ ملاقات کا احوال سناتا ہوں پھر آپ کو ساری بات یاد آ جائے گی۔ جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو وہ میں خود نہیں آیا تھا۔ خدا مجھے آپ کے پاس لے آیا تھا کیونکہ خدا کو مجھ پر رحم آ گیا تھا اور وہ میرا گھر آباد کرنا چاہتا تھا۔ ہوا اس طرح تھا کہ میں لاہور سے میرپور اپنی کار میں اپنے آبائی گھر جا رہا تھا۔ عین آپ کی دکان کے سامنے ہماری کار پنکچر ہوگئی۔ ڈرائیور کار کا پہیہ اتار کر پنکچر لگوانے چلا گیا۔ آپ نے دیکھا کہ میں گرمی میں کار کے پاس کھڑا ہوں۔ آپ میرے پاس آئے اور آپ نے مطب کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ ادھر آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی بھی یہاں آپ کی میز کے پاس کھڑی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی ''چلیں ناں، مجھے بھوک لگی ہے۔ آپ اُسے کہہ رہے تھے بیٹی تھوڑا صبر کرو ابھی چلتے ہیں۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اتنی دیر سے آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔ مجھے کوئی دوائی آپ سے خریدنی چاہیے تاکہ آپ میرے بیٹھنے کو زیادہ محسوس نہ کریں۔ میں نے کہا حکیم صاحب میں ۵، ۶ سال سے انگلینڈ میں ہوتا ہوں۔ انگلینڈ جانے سے قبل میری شادی ہوگئی تھی لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ یہاں بھی بہت علاج کیا اور وہاں انگلینڈ میں بھی لیکن ابھی قسمت میں مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔

آپ نے کہا میرے بھائی! توبہ استغفار پڑھو۔ خدارا اپنے خدا سے مایوس نہ ہو۔

یاد رکھو! اُس کے خزانے میں کسی شے کی کمی نہیں۔ اولاد، مال و اسباب اور غمی خوشی، زندگی موت ہر چیز اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی حکیم یا ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی دوا میں شفا ہوتی ہے۔ شفا اگر ہونی ہے تو اللہ کے حکم سے ہونی ہے۔ اولاد دینی ہے تو اُسی نے دینی ہے۔ مجھے یاد ہے آپ باتیں کرتے جا رہے اور ساتھ ساتھ پڑیاں بنا رہے تھے۔ تمام دوائیاں آپ نے ۲ حصوں میں تقسیم کر کے ۲ لفافوں میں ڈالیں۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ میرا نام محمد علی ہے۔ آپ نے ایک لفافہ پر محمد علی اور دوسرے پر بیگم محمد علی لکھا۔ پھر دونوں لفافے ایک بڑے لفافہ میں ڈال کر دوائی استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔ میں نے بے دلی سے دوائی لے لی کیونکہ میں تو صرف کچھ رقم آپ کو دینا چاہتا تھا۔ لیکن جب دوائی لینے کے بعد میں نے پوچھا کتنے پیسے؟ آپ نے کہا بس ٹھیک ہے۔ میں نے زیادہ زور ڈالا، تو آپ نے کہا کہ آج کا کھاتہ بند ہوگیا ہے۔

میں نے کہا مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔ اسی دوران وہاں ایک اور آدمی آ چکا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کھاتہ بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آج کے گھریلو اخراجات کے لیے جتنی رقم حکیم صاحب نے اللہ سے مانگی تھی وہ اللہ نے دے دی ہے۔ مزید رقم وہ نہیں لے سکتے۔ میں کچھ حیران ہوا اور کچھ دل میں شرمندہ ہوا کہ میرے

ہمارے بزرگوں نے اور ہم نے تو خدا سے چڑیوں کی طرح رزق مانگ کر زندگی گزار لی اور بڑے سکھی رہے۔ تم بھی یہ راہ اختیار کرو گے تو زندگی بڑے سکون سے گزر جائے گی

بقراط کون تھا......؟

عموماً بقراط کو جدید طب کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ ایک یونانی طبیب تھا جو چوتھی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں یعنی کوئی اڑھائی ہزار سال پہلے گزرا ہے۔ اس نے تعلیم دی کہ ڈاکٹر کا اوّلین فرض اپنے مریض یا مریضہ کی زندگی بچانا ہے اور یہ فرض نبھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ اچھے کام کرنے چاہئیں۔ بہت سے ڈاکٹر تعلیم اور تربیت مکمل کرنے کے بعد بقراطی حلف اٹھاتے ہیں، جس میں وعدہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کیریر میں ان اصولوں کا خیال رکھیں گے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک دن حکیم صاحب نے رقم کا حساب لگانے کے لیے چٹ کھولی تو وہ چٹ کو دیکھتے ہی رہ گئے آٹے دال وغیرہ کے بعد بیگم نے لکھا تھا، بیٹی کے جہیز کا سامان

کتنے گھٹیا خیالات تھے اور یہ سادہ سا حکیم کتنا عظیم انسان ہے۔ میں نے جب گھر جا کر بیوی کو دوائیاں دکھائیں اور ساری بات بتائی تو بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا وہ انسان نہیں کوئی فرشتہ ہے اور اُس کی دی ہوئی ادویات ہمارے من کی مراد پوری کرنے کا باعث بنیں گی۔ حکیم صاحب آج میرے گھر میں تین پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ ہم میاں بیوی ہر وقت آپ کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی پاکستان چھٹی آیا۔ کار ادھر روکی لیکن دکان کو بند پایا۔ میں کل دوپہر بھی آیا تھا۔ آپ کا مطب بند تھا۔ ایک آدمی پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ اگر آپ کو حکیم صاحب سے ملنا ہے تو آپ صبح ۹ بجے لازماً پہنچ جائیں ورنہ اُن کے ملنے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ اس لیے آج میں سویرے سویرے آپ کے پاس آگیا ہوں۔

محمد علی نے کہا کہ جب ۱۵ سال قبل میں نے یہاں آپ کے مطب میں آپ کی چھوٹی سی بیٹی دیکھی تھی تو میں نے بتایا تھا کہ اس کو دیکھ کر مجھے اپنی بھانجی یاد آرہی ہے۔ حکیم صاحب ہمارا سارا خاندان انگلینڈ سیٹل ہو چکا ہے۔ صرف ہماری ایک بیوہ بہن اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان میں رہتی ہے۔ ہماری بھانجی کی شادی اس ماہ کی ۲۱ تاریخ کو ہونا تھی۔ اس بھانجی کی شادی کا سارا خرچ میں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ ۱۰ دن قبل اسی کار میں اسے میں نے لاہور اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیجا کہ شادی کے لیے اپنی مرضی کی جو چیز چاہے خرید لے۔ اسے لاہور جاتے بخار ہوگیا لیکن اس نے کسی کو نہ بتایا۔ بخار کی گولیاں ڈسپرین وغیرہ کھاتی اور بازاروں میں پھرتی رہی۔ اسی میں پھرتے پھرتے اچانک بے ہوش ہو کر گری۔ وہ اسے میو ہسپتال لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس کو ۱۰۶ ڈگری بخار ہے اور یہ گردن توڑ بخار ہے۔ بے ہوشی کے عالم ہی میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی۔ اُس کے فوت ہوتے ہی نجانے کیوں مجھے اور میری بیوی کو آپ کی بیٹی کا خیال آیا۔ ہم میاں بیوی نے اور ہماری تمام فیملی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنی بھانجی کا تمام جہیز کا سامان آپ کے ہاں پہنچا دیں گے۔ شادی جلد ہو تو اس کا بندوبست خود کریں گے اور اگر ابھی کچھ دیر ہے تو تمام اخراجات کے لیے رقم آپ کو نقد پہنچا دیں گے۔ آپ نے ناں نہیں کرنی۔ آپ اپنا گھر دکھا دیں تاکہ سامان کا ٹرک وہاں پہنچایا جا سکے۔

حکیم صاحب حیران و پریشان یوں گویا ہوئے ''محمد علی صاحب آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں مجھے سمجھ نہیں آرہا، میرا اتنا دماغ نہیں ہے۔ میں نے تو آج صبح جب بیوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹ یہاں آکر کھول کر دیکھی تو مرچ مسالہ کے بعد جب میں نے یہ الفاظ پڑھے ''بیٹی کے جہیز کا سامان'' تو آپ کو معلوم ہے میں نے کیا لکھا۔ آپ خود یہ چٹ ذرا دیکھیں۔ محمد علی صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ''بیٹی کے جہیز'' کے سامنے لکھا ہوا تھا ''یہ کام اللہ کا ہے، اللہ جانے۔'' محمد علی صاحب یقین کریں، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ بیوی نے چٹ پر چیز لکھی ہو اور مولا نے اُس کا اسی دن بندوبست نہ کر دیا ہو۔ واہ مولا واہ۔ تو عظیم ہے تو کریم ہے۔ آپ کی بھانجی کی وفات کا صدمہ ہے لیکن اُس کی قدرت پر حیران ہوں کہ وہ کس طرح اپنے معجزے دکھاتا ہے۔

حکیم صاحب نے کہا جب سے ہوش سنبھالا ایک ہی سبق پڑھا کہ صبح ورد کرنا ہے ''رازق، رازق، تو ہی رازق'' اور شام کو ''شکر، شکر مولا تیرا شکر۔''

■

مسلمان اور ایجادات میں تعلق کمزور کیوں ہوگیا ہے؟

ہماری جدت پسندی کہاں کھو گئی؟

سلطان مسعود احمد

ایک وقت تھا جب دنیا میں ایجادات کا سہرا مسلمانوں کے سر ہوا کرتا تھا، جنھوں نے صدیوں پہلے طب اور سائنس کے شعبہ میں بے شمار ایجادات کی تھیں۔ جن سے آج بھی نبی نوع انسان مستفید ہو رہا ہے مگر گزشتہ دو تین صدیوں سے ایجادات کا رخ مغرب کی طرف ہوگیا ہے جب کہ ہم حرام کی کمائی سے کروڑوں کی کوٹھیاں بنانے کو ہی کمال سمجھتے ہیں اور دھوکے اور لوٹ مار کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ جدید دور کی ایک بھی ایجاد مسلمانوں کے کھاتے میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ مثال کے طور پر بجلی، بلب، ہوائی جہاز، ٹیلی فون اور دورِ حاضر میں ٹیلی ویژن، سیٹلائیٹ، کمپیوٹر، موبائل فون سب کی سب غیر مسلموں کی مرہون منت ہیں، جنھوں نے دنیا بدل کر رکھ دی ہے اور یہ سلسلہ ابھی رکا نہیں بلکہ زور و شور سے جاری ہے۔ یورپ کی مارکیٹ الیکٹرونکس کی ایسی ایسی حیران کن چیزوں سے بھری پڑی ہے، جن کے بارے میں پاکستان میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ وہاں کے سائنسدان آنے والے برسوں کے لیے جو تحقیق اور تجربے کر رہے ہیں۔ آج ان پر کوئی یقین نہیں کر رہا اور انھیں دیوانہ کا خواب کہا جا رہا ہے۔ ایسے ہی ۲۵/۳۰ برس پہلے کیا کسی نے سوچا تھا کہ انٹرنیٹ، موبائل فون دنیا سمیٹ دیں گے اور یہ چیزیں گھر گھر میں موجود ہوں گی مگر یہ اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں آج ایک حقیقت ہیں۔ آئیے آپ کو مستقبل میں ہونے والی چند ایجادات کی جھلک دکھائیں جن پر آج کام ہو رہا ہے۔

موبائل فون بغیر بیٹری کے ہوں گے اور یہ انسانی جسم میں موجود ''بجلی'' سے چلا کریں گے۔ کم از کم فون چارج کرنے کی حد تک واپڈا سے جان چھوٹ جائے گی۔ برسوں پہلے انگلینڈ میں جیمز بونڈ کی ایک فلم دیکھی تھی، جس میں فلم کا ہیرو اداکار سین کونری Sean Connery پیٹھ پر ایک مشین باندھ کر ہوا میں اڑنے لگتا ہے۔ آنے والے برسوں میں ایسی مشینیں عام ہوں گی اور انسان پرندوں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آئیں گے۔ ایک اور چیز جس پر چین اور امریکا میں تحقیق ہو رہی ہے، اگر یہ کامیاب ہو کر پاکستان آگئی تو پھر اللہ ہی حافظ ہے کیونکہ یہاں چوروں

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور ڈاکوؤں نے پہلے ہی انت مچایا ہوا ہے۔ اس ایجاد کے بعد تو ان کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوگا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے ایسی کون سی آفت آنے والی ہے؟ تو یہ آفت ایک ایسا کپڑا ہے جسے پہن کر انسان نظر نہیں آئے گا، یعنی یہ کپڑا (نظر نہ آنے والا) Invisible ہوگا اور ایسے ٹی وی کے بارے میں کیا کہیے گا، جس میں سے منظر کے مطابق کمروں کا ماحول تبدیل ہو جائے گا مثلاً اگر گلاب کا منظر ہوگا تو کمرے میں گلاب کی خوشبو پھیل جائے گی۔ برف کے منظر سے ٹھنڈک کا احساس ہوگا وغیرہ اور سب سے انسان دوست وہ آلہ ہوگا جسے جیب میں رکھا جا سکے گا اور حادثہ سے ہونے والی اندرونی چوٹ بٹن دبانے سے فوراً ٹھیک ہو جایا کرے گی۔

سبزیاں اُگائیے، موسم کا انتظار کیے بغیر

ہمارے زرعی ماہرین کے لیے لمحہ فکریہ جو زرعی ملک کہلوانے کے باوجود اپنے لوگوں کی کھانے کی ضرورت پوری نہیں کر سکتے۔ حد یہ ہے کہ ہم پیاز اور آلو کے اچھے بھی باہر سے منگوانے پر مجبور ہیں۔ انگلینڈ میں ۲۳۰ ملین پاؤنڈ کی لاگت سے ۸۰/ ایکڑ رقبے میں ایک گرین ہاؤس تیار کیا گیا ہے۔ جس میں ٹماٹر، کھیرا، شملہ مرچ اور وغیرہ سال کے ۱۲/ مہینے اگائی جاتی ہیں یعنی ان چیزوں کی پیداوار کے لیے موسم کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ آپ کہیں گے کہ اس میں حیران کن بات کون سی ہے تو حیران کرنے والی بات بھی پڑھ لیجیے۔ وہ یہ کہ یہ سب کچھ زمین یا مٹی میں نہیں بلکہ انہیں ایسے برتنوں یا گملوں میں اگایا جاتا ہے

ہائیڈروپونکس ٹیکنالوجی

جن میں صرف پانی ہوتا ہے۔ یہ سبزیاں ہر قسم کی بیماری سے پاک ہوتی ہیں۔ یہ ٹیکنالوجی (Hydroponics) کہلاتی ہے۔ انگلینڈ سے پہلے ہالینڈ ایسا ملک ہے جہاں کامیابی سے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔

بغیر پروں والا پنکھا

اب آئیے آپ کو ایک ایسے پنکھے کے بارے میں بتاؤں جس کے پر یعنی بلیڈ نہیں ہیں۔ بہت سے پڑھنے والے یقیناً میری ذہنی حالت پر شک کریں گے اور شاید مجھے فوری ذہنی ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا مشورہ بھی دیں۔ پنکھا اور وہ بھی بغیر پروں کے۔ ناممکن سی بات لگتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یورپ اور امریکا میں گزشتہ ۳/ برسوں سے ایسا پنکھا مارکیٹ میں ۳۰۰/ ڈالر کا فروخت ہو رہا

ہے۔ اسے برطانوی موجد جیمز ڈائسن نے ایجاد کیا ہے۔ یہ عام پنکھا کی نسبت ۱۵/ گنا زیادہ اور ٹھنڈی ہوا پھینکتا ہے۔ ۳/ یا ۴/ پروں والے عام روایتی پنکھے ہوا کاٹتے ہیں یعنی ان کی ہوا رک رک کر آتی ہے جبکہ بغیر پروں والے اس پنکھا سے مسلسل ہوا آتی ہے۔ اس میں جیٹ انجن کی ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے۔ چھوٹے بچوں والے گھروں کے لیے یہ پیڈسٹل اور ٹیبل پنکھے بے حد محفوظ ہیں کیونکہ ان میں گھومنے والی کوئی چیز ہی نہیں ہے، جس سے بچے اپنی انگلی یا ہاتھ زخمی کر سکیں۔ آپ کل کا انتظار کیجیے، بہت کچھ آ رہا ہے۔

کیا روبوٹ خود سوچ سکیں گے؟

روبوٹس کسی مخصوص صورتِ حال میں دستیاب انفارمیشن کی بنیاد پر اندازے لگانے اور "معلوم" کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ کچھ روبوٹ "سیکھ" بھی سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک عمل ناکام ہونے پر وہ دوبارہ ویسا نہیں کرتے۔ لیکن کوئی بھی روبوٹ الیکٹرونک سرکٹ جتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی مزید پیچیدہ اور حساس ہوتے جانے کے ساتھ ساتھ روبوٹس بھی زیادہ حساس اور سمجھدار ہوتے جائیں گے۔ خیال غالب ہے کہ اکیسویں صدی کے دوران ہماری زندگیوں میں ان کا عمل دخل کافی بڑھ جائے گا۔ کاش اس تحقیق میں ہمارا بھی کافی حصہ ہوتا......!

■

WWW.PAKSOCIETY.COM

فینا قبیلے کے ساتھ

ھاتھی کا شکار

انوکھے لوگ
انوکھا شکار
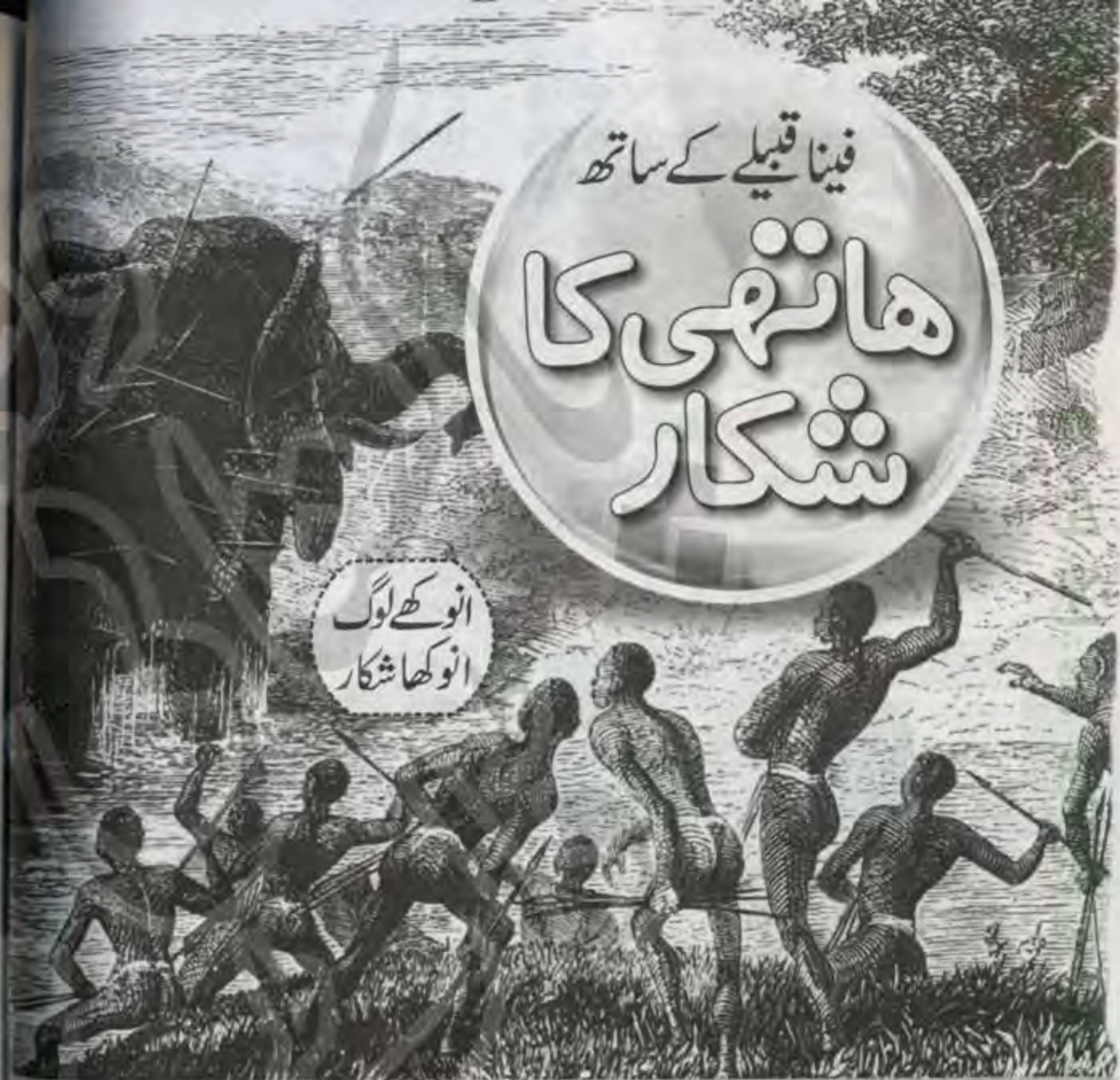
قبیلہ والوں کا ماننا تھا کہ ہاتھی پر وار ہمیشہ پیچھے سے کرنا چاہیے

صبا شفیق

افریقی

قبیلہ فینا کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے ۱۰ر دن ہو گئے تھے۔ دوسرے بہت سے وحشی جنگلی افریقی قبیلوں کی طرح یہ قبیلہ بھی گوشت خور تھا، حرام حلال کی تمیز سے بے نیاز۔ ہر طرح کا گوشت انھیں مرغوب تھا۔ کسی حد تک یہ قبیلہ آدم خور بھی تھا کیونکہ یہ جنگلوں اور قبیلوں کے درمیان لڑائی میں مارے جانے والے دشمنوں کا گوشت کھانا بھی باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ خیر میرے ساتھ وہ دوستی اور احترام سے پیش آرہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے میں ایک بہترین شکاری ہوں۔ وہ خود بھی بہت اچھے شکاری تھے۔ جوان، بچے بوڑھے سب ہی شکار میں دلچسپی رکھتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اُن کو گوشت شکار سے ہی مل سکتا ہے۔

میرے قیام کے گیارھویں روز قریبی گاؤں سے آنے والی ایک عورت نے خبر دی کہ اُس نے ہاتھیوں کو دیکھا ہے اور ہاتھیوں نے گاؤں کے کئی کھیت اُجاڑ ڈالے ہیں۔ یہاں یہ ایک معمولی سی بات تھی۔ ہاتھی اکثر تیار فصلیں کھا جاتے اور باقی اپنے بھاری قدموں تلے روند جاتے تھے اور بہت سے لوگ اپنی اُجاڑی ہوئی فصلوں کا ماتم کرتے تمام سال بھوک برداشت کرتے رہتے تھے۔

ہاتھیوں کے قریب نظر آنے کی خبر نے تمام قبیلے میں خوشی کی لہر دوڑا دی اور وہ اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر مسکرانے لگے اور خوشی سے چلانے لگے ”ڈھیر سارا گوشت...... ہمیں ڈھیر سارا گوشت ملنے والا ہے...... ہم ہاتھیوں کو شکار کریں گے...... اب بہت مزا آنے والا ہے۔“ اُس رات انھوں نے جشن کا اہتمام بھی کیا۔ اندھیری رات میں مشعلوں کی روشنی میں وہ ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ہو کر ناچنے لگے۔ اُن کی جنگلی چیخیں پہاڑوں سے ٹکرا کر گونجتیں تو عجیب وہشت زدہ سا ماحول بن جاتا۔ انھوں نے اپنی جلد کو مختلف رنگوں سے رنگ رکھا تھا اور ناچتے ناچتے جب اُن کے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگتا تو یوں لگتا تھا جیسے اُنھوں نے پورے جسم پر تیل اُنڈیل رکھا ہے۔ مشعلوں کی روشنی میں وہ بالکل بھوت لگتے تھے۔ اچانک فضا میں ایک زوردار چیخ گونجی جس نے زمین کو ہلا ڈالا۔ میں گھبرا گیا تو میرا مترجم مسکرانے لگا اور بولا ”گھبراؤ مت، یہ ہمارے سب سے دلیر اور ماہر شکاری جسے ہم چیتا کہتے ہیں اُس کی آمد کا اعلان ہے۔“ اب ایک گانا گایا جانے لگا جو کہ سراسر اُس کی بہادری کی مدح سرائی تھی اور پھر چیتا میدان میں اُترا۔ وہ بھی ہتھیاروں سے پوری طرح لیس تھا۔ چاقو، کمان، تیر، نیزہ اُس کی کمر سے بندھے تھے اور ہاتھ میں اُس نے ایک بہت بڑا شکاری کلہاڑا پکڑ رکھا تھا۔ پھر اُس نے نیزہ بھی اپنی کمر سے نکال کر دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا اور ناچنے لگا۔ یہ ایک جنگلی رقص تھا جس میں وہ اپنے ہتھیاروں کا استعمال بھی بخوبی کر رہا تھا۔ نیم اندھیرے میں وہ اُونچا لمبا تنومند آدمی بالکل ایک دیو لگ رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک ناچتا رہا اور جب تھک کر چُور ہو گیا تو ایک اور نوجوان شکاری وحشیوں کی طرح ناچنے لگا۔ تمام رات یہ سب چلتا رہا۔

اگلی صبح چمکدار اور روشن تھی۔ تمام شکاریوں نے اپنے ہتھیاروں کو چمکایا۔ میں بھی اپنی بندوق صاف کرنے لگا کہ شاید میں بھی کسی ہاتھی کا شکار کرسکوں۔ قبیلہ کی عورتوں نے مختلف جڑی بوٹیوں سے ایک خاص مرکب تیار کیا۔ اُن کا ماننا تھا کہ یہ مرکب نڈر اور دلیر بناتا ہے۔ تمام شکاریوں نے اسے اپنے جسموں پر ملا۔ ہانکے کے لیے بھی بہت سے لوگ ہمارے ساتھ جا رہے تھے اور اس طرح تقریباً ہم ۵۰۰ر آدمی جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ جنگل میں داخل ہو کر ہم مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے اور مکمل خاموشی سے ہاتھیوں کی تلاش ہونے لگی۔ تقریباً ۶ر گھنٹے چلنے کے بعد ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں ممکنہ طور پر ہاتھی سو سکتے تھے مگر اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ آسمان پر گہرے کالے بادل یک دم ہی کہیں سے اُمڈ آئے تھے۔ آنے والی بارش کے مدِنظر قبیلہ والے درختوں کے پتوں اور تنوں سے پناہ گاہ بنانے لگے۔ ابھی ہم اس کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ تیز بارش شروع ہوگئی جو رات تک جاری رہی۔ ہم اپنی پناہ گاہوں میں بیٹھے رہے اور پھر رات بھی اسی طرح سوتے جاگتے وہیں گزر گئی۔ اگلے دن ہم جنگل میں آگے بڑھے۔ جلد ہی ہمیں ہاتھیوں کے پیروں کے نشان نظر آگئے۔ ٹوٹی ہوئی جھاڑیاں اور مسلی ہوئی گھاس اس بات کا واضح ثبوت تھے کہ یہاں بہت سارے ہاتھی کہیں قریب ہی ہیں۔ یہاں ہر نوع اور ہر جسامت کے پودے تھے۔ یہاں بہت سی جھاڑیاں ایسی بھی تھیں جن سے مضبوط رسے بھی بنتے ہیں۔ قبیلہ کے لوگ اُن رسیوں کو اکٹھا کر کے ایک بڑی سی جال نما شے تیار کرنے لگے۔ بے شک ہاتھی جیسا دیوقامت اور طاقتور جانور کسی جال میں قید نہیں کیا جا سکتا مگر شکاری جال میں اس کو پھنسا کر اس پر آسانی سے وار کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہاتھی کو گھیرنے کے بعد شکاری چھری چاقو اور نیزوں سے پے در پے وار کر کے اُسے ادھ موا کر دیتے ہیں اور آخرکار قوی الجثہ ہاتھی ڈھے جاتا ہے۔ جب جال تیار کیا رہا تھا تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے لگا یہ لوگ ایک طرف جانے میں خاصے محتاط ہیں۔ میں نے غور سے اُس جگہ کی زمین کا جائزہ لیا مگر وہاں کچھ نہیں تھا مگر جب میں نے اُوپر دیکھا تو مجھے ایک بڑا سا لکڑی کا شہتیر لٹکا نظر آیا۔ جس پر بے شمار چھری نما بلیڈ لگے ہوئے تھے۔ شہتیر کو نیچے پھینکنے کا انتظام زمین پر رکھی رسی سے کیا گیا تھا جس پر ہاتھی کا پاؤں پڑتے ہی بلیڈز سے بھرا شہتیر ہاتھی پر آ گرتا ہے اور چھریاں اُسے لہولہان کر دیتی ہیں جبکہ شہتیر کا وزن اُس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ ڈالتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جنگل میں جگہ جگہ بڑے بڑے گہرے گڑھے کھود ڈالے تھے تاکہ کوئی نہ کوئی ہاتھی بے خیالی میں ان میں گر جائے اور ان کا کام بن جائے کیونکہ وہ گڑھا اتنا گہرا کھودتے تھے کہ گرتے وقت ہاتھی کی ٹانگ ٹوٹ جاتی اور وہ اوپر چڑھنے کے قابل نہیں رہتا تھا۔

یہ سب تیاریاں کرنے کے بعد مختلف ٹولیاں بنائی گئیں اور ہاتھیوں کے گرد گھیرا ڈالنے کی پوری منصوبہ بندی کی گئی کیونکہ اب ہمیں ہاتھی قریب ہی نظر آ رہے تھے۔ تمام لوگ ہاتھیوں کے گرد ایک دائرے کی شکل میں اس طرح پھیل گئے کہ ہاتھی خود بخود ہمارے پھندوں کی طرف بھاگیں اور یوں شکار خود شکاری کے پاس آجائے۔ اب سب نے مل کر شور مچانا شروع کر دیا۔ بگل بجائے گئے اور قبیلہ کے لوگ منہ سے جنگلی اور وحشی آوازیں نکالنے لگے۔ ہاتھی شور کو سخت ناپسند کرتے اور اس سے دور بھاگتے ہیں۔ وہ دائیں جانب بھاگتے تو انھیں وہاں سے شوروغل سنائی دیتا۔ وہ گھبرا کر بائیں جانب بھاگتے تو اُس سمت والی ٹولی شدید شور مچاتی۔ یوں وہ گھبرا کر بالکل سیدھ میں ہمارے پھندوں کی طرف آ گئے۔

اُن میں سے ایک تو چھریوں والے شہتیر کا شکار بنا۔ دوسرا ہاتھی گڑھے میں گر گیا۔ جبکہ تیسرے ہاتھی پر قبیلہ کے لوگ جال ڈالنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اب دوسرے شکاری بھی آگے بڑھے اور بپھرے ہوئے خوفزدہ ہاتھی پر نیزوں اور چاقوؤں سے وار کرنے لگے۔ جن لوگوں نے جال تھام رکھا تھا، وہ ہاتھی کی طاقت سے زمین پر [illegible] طرح رگڑیں کھا رہے تھے۔ وہ انھیں اُٹھا اُٹھا کر ز[illegible] پٹخ رہا تھا کیونکہ وہ خود کو آزاد کرانے کی پوری کوشش[illegible] تھا۔ کچھ شکاری درختوں پر چڑھے ہوئے تھے اور [illegible] سے ہاتھی پر نیزے برسا رہے تھے۔ بے چارہ ہاتھی [illegible] چھڑانے کی مسلسل کوشش کر رہا مگر مسلسل ناکام ہو [illegible] اور پھر پے در پے واروں نے اُسے نڈھال کر دیا۔ [illegible] زخموں سے چور ہو کر تڑپ رہا تھا تب میں نے [illegible] تکلیف سے آزاد کرتے ہوئے سر میں گولی مار کر ا[illegible] ٹھنڈا کر دیا۔ چوتھا ہاتھی بھی اسی طرح جال ڈال کر [illegible] نیزے چاقوؤں سے وار کر کے شکار کیا گیا اور اس دور[illegible] ہاتھی نے جنون میں، جال تھامے ایک آدمی کو اچانک [illegible] اپنے قدموں تلے روند ڈالا۔ وہ بے چارہ دوسرا سانس [illegible] نہ لے سکا تھا۔ اس رات کل ۴ ہاتھی شکار کیے گئے۔ [illegible] فینا قبیلہ کی جرأت، دلیری اور عقلمندی کی داد دیے بغیر [illegible] سکا۔ اُن کا ماننا تھا کہ ہاتھی پر ہمیشہ پیچھے سے وار [illegible] چاہیے کیونکہ وہ گھبرا کر ہمیشہ آگے کی سمت بھاگتا ہے۔ [illegible] لیے اس کے سامنے کھڑے ہو کر وار کرنا موت [illegible] درختوں پر چڑھ کر نیزے مارنے کے لیے بھی وہ طا[illegible] درختوں کا انتخاب کرتے تھے جو ایک بڑے ہاتھی کی ٹکر [illegible] سہہ سکیں کیونکہ اکثر ہاتھی جب درخت پر موجود شکاری [illegible] دیکھ لیتے ہیں تو وہ اس درخت کو گرانے کی بھرپور کوش[illegible] کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ جال کو تھامنے کے لیے [illegible] قبیلہ کے سب سے مضبوط اور صحت مند آدمیوں کا انتخا[illegible] کرتے تھے تاکہ ہاتھی اُنھیں گھسیٹ اور روند نہ سکے۔

اگلے دن قبیلہ کے لوگوں نے مردہ ہاتھیوں کے گ[illegible] رقص کیا اور پھر اس کی رانوں کا گوشت کاٹ کر بھونا۔ [illegible] سب بے انتہا خوش تھے۔ ۳ دن تک انھوں نے صرف [illegible] صرف ہاتھی کا گوشت بھون بھون کر کھایا اور باقی کا گوشت اُبال کر اور نمک لگا کر سکھا کر محفوظ کر لیا گیا۔ میں چند [illegible] اور اُن کے ساتھ رہ کر شہر واپس آ گیا۔ مگر ہاتھی کا یہ دلچسپ شکار اور فینا قبیلہ کی مہمان نوازی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

ظالموں کے گرد پھندا تنگ کرنے والا ادارہ حرکت میں آ چکا

سیٹلائٹ سیارے ظالموں کے پیچھے پیچھے

کیا واقعی مستقبل قریب میں روئے زمین پر ہونے والے ہر فساد اور جنگ و جدل کے مناظر خلا میں دیکھے جا سکیں گے

شہزاد حسین علوی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اُس

کمرے میں ۴۹ سالہ نیلی ۴۰ عورتوں کے ساتھ پھنسی بیٹھی تھی۔ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا، اسی لیے عورتوں کو دھکے دے کر اس میں ٹھونسنا پڑا۔ اکثر عورتیں چیخ چلا رہی تھیں۔ بعض مجبوراً کمرے ہی میں حوائج ضروریہ سے فارغ ہوگئیں۔ چنانچہ اب بدبو کی شدت سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔

نیلی نے دریافت کیا "کیا مجھے پانی مل سکتا ہے؟"

دروازہ پر کھڑے گارڈ نے اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا "کیا فائدہ؟ ابھی ایک گولی تمھارا خاتمہ کر ڈالے گی۔"

نیلی نے خوف کے مارے جھرجھری لی اور خاموش ہوگئی مگر وہ اس جہنم میں ایک ہفتہ مقیم رہ کر اپنی موت کا انتظار کرتی رہی۔ اس دوران وہ یہی سوچتی رہی کہ نجانے اسے کیونکر موت آئے گی؟

تنگ کمرے میں قید ان بے بس و نہتی عورتوں کا واحد جرم "جارجیائی" ہونا تھا۔ یہ اگست ۲۰۰۸ء کا واقعہ ہے اور یہ عورتیں ایک گاؤں، زیمواچابتی کی باسی تھیں۔ یہ گاؤں روس کے نزدیک واقع ایک متنازع خطہ، جنوبی اوستیا میں آباد ہے۔

قانونی طور پر جنوبی اوستیا جارجیا کا حصہ ہے، لیکن یہاں کے لوگ خودمختار ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ملیشیا بنائی اور جارجیا کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ بے چارے شہری بھی اس لڑائی کی لپیٹ میں آگئے۔

خوش قسمتی سے ہلالِ احمر کے کارکن قیدی عورتوں تک پہنچ گئے۔ ان کی کوششوں سے بچی کھچی عورتوں کو رہائی مل گئی جن میں نیلی مخلذزی بھی شامل تھی مگر جب نیلی اپنے گھر واپس پہنچی، تو یہ دیکھ کر اس پر جیسے بجلی گر پڑی کہ وہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔

نیلی کے گناہ گار سزا سے محروم رہے، لیکن مسرت کی بات یہ ہے کہ اب ظالموں کے گرد پھندا تنگ کرنے والا ادارہ حرکت میں آچکا۔ دراصل نیلی اور علاقہ کے دیگر ۱۳۳ مرد و زن نے لندن کی ایک تنظیم، دی یورپین ہیومن رائٹس ایڈووکیسی سینٹر کو یہ درخواست دی تھی کہ ۲۰۰۸ء کی جنگ کے دوران جنوبی اوستیا اور روس کے فوجیوں نے انھیں ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا۔ لہٰذا ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ تنظیم نے ان کی جانب سے یورپین کورٹ برائے انسانی حقوق میں مقدمہ دائر کر دیا۔

فروری ۲۰۱۲ء سے مقدمہ سنا جانے لگا۔ ایک لحاظ سے یہ مقدمہ انوکھا اور تاریخی بن گیا...... اس میں پہلی بار ہائی ریزولیشن والی وہ تصاویر بطور ثبوت پیش کی گئیں جو خلا سے مواصلاتی سیاروں (Satellites) نے کھینچی تھیں۔

وہ تصاویر یہ تو عیاں نہیں کر سکیں کہ کمرے میں عورتوں پر ظلم و تشدد ہوا، مگر وہ بے رحمی کا ایک مظاہرہ ثابت کرنے میں کامیاب رہیں۔ دراصل ایک امریکی ادارے، امریکن ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف سائنس کے پاس مواصلاتی سیاروں سے کھینچی گئی ریمواچابتی گاؤں کی پرانی تصاویر محفوظ تھیں۔ ان میں گاؤں کے سبھی گھر صحیح سالم تھے۔ جب ان کا موازنہ گاؤں کی تازہ تصاویر سے کیا گیا، جن میں سبھی گھر کھنڈر بنے ہوئے تھے، تو جنوبی اوستیا کے جنگجوؤں کا جرم سامنے آگیا۔ انھوں نے دانستہ گاؤں کے باسیوں کو نشانہ بنایا کیونکہ وہ مخالف نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

سیٹلائٹ تصویروں نے دُنیا کی توجہ تیزی سے بڑھتے ہوئے تنازعات کی طرف دلائی

ترقی یافتہ ممالک نے خلا میں ایسے جدید مواصلاتی سیارے بھیج دیے ہیں جو لاکھوں فٹ کی بلندی کے باوجود سڑک پر چلتی گاڑی کی بھی تصویر اتار لیں۔ چنانچہ اب فوجی گاڑیوں، جلتے ہوئے اور تباہ شدہ گھروں اور کسی مجمع کی تصویریں اتارنا مسئلہ نہیں رہا۔ یہ ایک طرح سے دکھی انسانیت کے لیے مفید امر ہے۔

وجہ یہ ہے کہ جن ممالک میں آمریت یا بادشاہت ہو، وہاں حکومتیں خاموشی سے مخالفین پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتی ہیں۔ انسانی حقوق کے اداروں اور امدادی تنظیموں کو پتا ہی نہیں چلتا کہ ان ملکوں میں عوام کس دکھ و کرب سے گزر رہے ہیں۔ لیکن اب مواصلاتی سیاروں سے کھینچی گئی تصاویر یہ ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ کن کن ممالک میں بنیادی انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں۔

ظاہر ہے، خلا سے کسی قتل یا ٹارچر کے واقعہ کو دریافت کرنا بڑا کٹھن مرحلہ ہے لیکن امریکن ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف سائنس کے ماہرین ایسے جلوسوں، احتجاج اور جھگڑوں کی بابت جاننے لگے ہیں جو عموماً ناخوشگوار واقعہ کے بعد جنم لیں۔ مثال کے طور پر گزشتہ سال مصراتہ، لیبیا میں مواصلاتی سیاروں نے سیکڑوں تباہ شدہ عمارتوں کی تصویریں اتاریں۔ تب دنیا والوں کو علم ہوا کہ وہاں سرکاری فوج اور باغیوں کے مابین جنگ جاری ہے۔ چنانچہ دیگر ممالک نے پھر باغیوں کو اسلحہ پہنچایا اور کمک دی تاکہ وہ قذافی کا مقابلہ کر سکیں۔

اسی طرح ۲۰۰۹ء میں اقوام متحدہ سے منسلک مواصلاتی سیاروں کے ماہرین نے پتا چلایا کہ شمال مشرقی سری لنکا میں تامل ٹائیگرز اور سرکاری فوج کے مابین زبردست لڑائی جاری ہے اور شہریوں کے کئی گروہ فریقین کے مابین پھنس چکے۔ اقوامِ متحدہ نے ہلالِ احمر کو مصیبت زدگان کی بابت بتایا۔ تنظیم نے فوراً تباہ حال لوگوں تک غذا و ادویہ پہنچائیں اور یوں ان کی قیمتی جانیں بچالیں۔

ایک غیر انسانی واقعہ کا کھوج لگاتے ہوئے ماہرین شہادتوں سے بھی مدد لیتے ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال ۲۰۰۹ء میں سامنے آئی۔ ہوا یہ کہ ایک امریکی غیر سرکاری

مدد درکار ہے

جون ۲۰۱۰ء میں کرغستان میں کرغز باشندوں اور ازبکوں کے مابین وسیع پیمانے پر نسلی فسادات ہوئے۔ ان کی لپیٹ میں آ کر ۴۷۰ انسان اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس موقع پر اقلیتی ازبک باشندوں نے دُنیا والوں سے بڑے انوکھے انداز میں مدد مانگی۔ انھوں نے سڑکوں اور میدانوں میں سفید روغن سے "ایس او ایس" (SOS) لکھ دیا۔ پہلے پہل ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ماہرین نے مواصلاتی سیاروں کی تصاویر کے ذریعے یہ پیغام دیکھے۔ یوں انھیں معلوم ہوا کہ اکثریتی لوگ اقلیت پر ظلم و ستم کر رہے ہیں۔ تنظیم نے عالمی قوتوں سے اپیل کی کہ وہ کرغستان میں جاری فساد رُکوانے کی کوشش کریں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شمالی کوریا کے نظر بندی مراکز

شمالی کوریا بقیہ دنیا سے کٹا ہوا خاصا پُراسرار ملک ہے۔ وہاں کی حکومت بڑے جتن کرتی ہے کہ غیر ملکی اندرونِ ملک کے معاملات سے آگاہ نہ ہونے پائیں لیکن مواصلاتی سیاروں کی تصویروں نے یہ افشا کردیا کہ شمالی کورین حکومت ملک میں نئے نظربندی مراکز (Detention Centres) تعمیر کررہی ہیں۔ ان مراکز میں مخالفین کو رکھا اور تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

اقوامِ متحدہ کے ماہرین نے اس ضمن میں ۲۰۰۱ء اور ۲۰۱۱ء کی تصاویر کا موازنہ کیا۔ انکشاف ہوا کہ جنگل میں نئی عمارتیں بن گئیں اور مشینری بھی آگئی۔ خیال ہے کہ یہ عمارات قیدیوں ہی سے تعمیر کرائی گئیں۔

تنظیم، فزیشنز فار ہیومن نے دعویٰ کیا کہ ۲۰۰۱ء میں امریکی فوج نے سیکڑوں طالبان قیدیوں کو دشتِ لیلیٰ میں اجتماعی قبروں میں دفنا دیا تھا۔

امریکیوں نے ان قیدیوں کو پنجروں میں بند کر رکھا تھا۔ پھر اسی حالت میں انھیں ٹرکوں پر سوار کرایا گیا۔ ان کو دُور دراز واقع قیدخانوں تک لے جانا مقصود تھا۔ راستے میں کئی قیدی دم گھٹنے یا بھوک پیاس کی وجہ سے دم توڑ گئے۔ امریکی فوجیوں نے اپنا جرم چھپانے کے لیے صحرا میں اجتماعی قبریں کھودیں اور لاشیں وہاں چھپا دیں۔

۲۰۰۹ء میں امریکن ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف سائنس نے فیصلہ کیا کہ اس معاملہ کی چھان بین ہونی چاہیے۔ چنانچہ ادارے کے ماہرین افغان گواہوں کی مدد سے اجتماعی قبروں تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ یوں یہ واقعہ سچ ثابت ہوا۔ دشتِ لیلیٰ میں قبریں اس لیے بھی دریافت ہوئیں کہ وہاں کی مٹی کا رنگ اور ہیئت اردگرد کی زمین سے مختلف تھی۔ وہاں پر ڈمپ ٹرک چلنے کے آثار بھی مل گئے۔ یہ ثبوت ملنے کی بنا پر صدر اوباما نے حکم دیا کہ کیس کا ازسرِنو جائزہ لیا جائے۔

مستقبل قریب میں روئے ارض پر ہونے والا ہر فساد اور جنگ وجدل کا واقعہ خلا سے دیکھا جا سکے گا

مواصلاتی سیاروں کی ٹیکنالوجی کے باعث ہی خلا سے دنیا کا پہلا عالمی چوکیداری نظام بھی وجود میں آیا۔ یہ نظام گوگل ارتھ کے ذریعے کام کرتا ہے۔

گورنر کی چیرہ دستی

فروری ۲۰۱۰ء میں نائیجیریا کے ایک متکبر گورنر نے فیصلہ کیا کہ پورٹ ہارکورٹ کے نواحی علاقہ میں باغات بھرا شہر (Garden City) تعمیر کیا جائے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، حکم دیا کہ وہاں آباد غریب لوگوں کے گھر بار زبردستی تباہ کر دیے جائیں۔ یوں پولیس نے بچوں بڑوں سبھی کو گھروں سے نکالنا شروع کیا۔ پھر ان کی رہائش گاہوں پر بلڈوزر چلا دیے۔

علاقہ کے لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ یہ واقعہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے علم میں آگیا۔ اس کے ماہرین نے بڑا کام یہ دکھایا کہ علاقہ کی ایسی تصاویر حاصل کرلیں جو مواصلاتی سیاروں کے ذریعے فروری ۲۰۰۸ء میں اُتاری گئی تھیں۔

اُن پُرانی تصاویر میں علاقہ کے سبھی گھر صحیح سالم تھے لیکن فروری ۲۰۱۰ء میں کھینچی گئی تصویروں میں تباہی کے مناظر نمایاں تھے۔ یہ ثبوت جب نائیجیرین صدر کے سامنے پیش ہوئے، تو اس نے ''باغات سے بھرے شہر'' پر کام رُکوا دیا اور کہا ''ایسا شہر تو ظالموں کا اڈہ ہوا جو بسے ہوؤں کو اُجاڑ کر بسایا جائے۔''

اس سلسلے میں گوگل ارتھ نے ایک ٹائم لائن متعارف کرائی ہے۔ یہ مختلف علاقوں میں جنم لینے والی ارضی تبدیلیاں عیاں کرتی ہے۔ کوئی بھی ان مناظر میں انہونی پائے، مثلاً تباہ شدہ عمارتیں یا فوجی قلعے دیکھے، تو وہ اس اَمر کی آن لائن دستاویز بنا سکتا ہے۔

حادثات اور فسادات کا ریکارڈ رکھنے والی مشہور تنظیم، ایمنسٹی انٹرنیشنل بھی ثبوتوں کی تلاش میں مواصلاتی سیاروں کی تصاویر سے مدد لیتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں ماہرین اب ایسے مصنوعی سیارے ایجاد کررہے ہیں جو بادلوں اور زمین کے نیچے بھی دیکھ سکیں گے۔ ان میں اتنے طاقتور کیمرے نصب ہوں گے کہ وہ زمین پر پڑے قلم کی تصویر بھی کھینچ لیں۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ایک ماہر، کرسٹوف کوتل کا کہنا ہے ''مجھے یقین ہے، مستقبل قریب میں روئے ارض پر ہونے والا ہر فساد اور جنگ و جدل کا واقعہ خلا سے دیکھا جا سکے گا۔''

■

WWW.PAKSOCIETY.COM

موت کی ایلچی

ایک اَناپرست، ذہین وچالاک عورت کا ماجرا
اُسے پولیس والے اچھے نہ لگتے تھے

رضوان علی شاہ

ماں

جب ۳۱رسالہ پولیس افسر، گلین ٹرنر کی ماں، کیتھی نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پڑھی، تو اُسے یقین نہ آیا۔ ٹرنر امریکی ریاست جارجیا کی کاؤنٹی کوب کا ایک مستعد وقابل پولیس افسر تھا۔ اس کی صحت قابل رشک تھی اور وہ کسی مرض میں مبتلا نہ تھا۔ پھر بھی مارچ ۱۹۹۵ء میں وہ چند دن بیمار رہا اور پھر اچانک چل بسا۔ اس کی موت بھی عزیز واقارب کو حیران کرگئی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں درج تھا کہ وہ دل زیادہ بڑا ہونے کے باعث چل بسا۔ بیوی، جولیالن نے اُسے مردہ حالت میں پایا۔ دونوں کی ۱۹رماہ قبل شادی ہوئی تھی۔ بیٹے نے کبھی ماں سے دل کی تکلیف کا ذکر نہیں کیا تھا، اسی لیے وہ شک میں پڑگئی۔

تاہم موت سے ۲رہفتے قبل گلین ٹرنر فلو جیسی علامات کا نشانہ ضرور بنا۔ اُسے قے آئی اور ہیضہ بھی ہوگیا۔ اس باعث وہ ۳ر دن دفتر نہ جا سکا۔ بعدازاں اُسے کینسٹون ہسپتال کے ایمرجنسی روم لے جایا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے اُسے ٹیکوں کے ذریعے صحت بخش ادویہ دیں اور چند گھنٹے دیکھ بھال کے بعد پھر گھر بھیج دیا۔

جولیا نے ٹرنر کے دوستوں کو بتایا کہ جب وہ گھر واپس آیا، تو اُس کی حالت مزید خراب ہوگئی۔ وہم کا مریض بن کر وہ راتوں کو اٹھنے لگا مثلاً اُسے یقین ہوگیا کہ وہ اُڑ سکتا ہے، چنانچہ ٹرنر چھت پر چڑھا اور چھلانگ لگانی چاہی۔ اگر جولیا اُسے نہ بچاتی، تو وہ کبھی دنیا سے گزر جاتا۔

اگلی رات کو ٹرنر تہ خانہ پہنچا اور وہاں ڈبے سے پٹرول پینے کی کوشش کی۔ اس بار بھی بیوی شوہر کے پیچھے پیچھے تھی، چنانچہ ٹرنر پھر بچ گیا۔ اگلی صبح جب ٹرنر کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی، تو جولیا نے اُسے اس کی مرغوب غذائیں، جیلی اور پڈنگ کھلائیں۔

پیٹ بھرا، تو ٹرنر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ جولیا گھریلو کام کاج کرنے لگی۔ ۲رگھنٹے بعد فارغ ہو کر وہ خواب گاہ میں آئی، تو شوہر کو مردہ حالت میں پایا۔ اس نے ۲رکمبل اوڑھ رکھے تھے اور بستر پر سیدھا لیٹا تھا۔ کیونکہ یہ پُراسرار موت تھی، لہٰذا پولیس کو دخل اندازی کرنا پڑی۔

جولیا نے پولیس افسر کو سارا ماجرا سنایا اور اُسے تہ خانہ بھی لے گئی۔ وہاں پولیس فوٹوگرافر نے پٹرول کے ڈبے کی تصاویر لیں۔ ڈبے کے ساتھ ایک نیلے آہنی خول میں مائع ضدِانجماد (AntiFreeze) بھی پڑا تھا۔ (مائع ضدِ انجماد وہ مرکب ہے جو شدید سردی میں گاڑی کے انجن کو منجمد ہونے سے روکتا ہے۔)

☆☆

جولیالن وومیک ٹرنر چھوٹی ہی تھی کہ اس کے والدین ایک حادثہ میں مارے گئے۔ بعدازاں ایک وکیل، ہیلن وومیک نے اُسے گود لے لیا۔ ہیلن اور اس کے شوہر نے بچی کو بڑے لاڈ پیار سے پالا جس نے بچپن ہی سے جولیا کو بگاڑ ڈالا۔ وہ قیمتی کھلونوں اور کپڑوں کی دلدادہ ہوگئی۔

جب وہ ۵ربرس کی تھی، تو ہیلن نے شوہر سے طلاق لے کر دوسری شادی کرلی۔ جولیا کا نیا باپ، ڈی ایل گریگوری سخت نکلا۔ اس نے سوتیلی بیٹی کو شاہ خرچی اور خودغرضی سے روکنا چاہا تو دونوں کے تعلقات خراب ہوگئے۔ گریگوری نے جولیا پر پابندیاں لگائیں تو وہ نشہ کرنے لگی۔ تاہم بعدازاں منشیات کے ایک کلینک میں علاج سے وہ تندرست ہوگئی۔

جولیا ۲۰رسال کی تھی کہ اس نے بحیثیت ایمرجنسی سروسز آپریٹر پولیس میں ملازمت کرلی۔ وہ پھر نوجوان پولیس افسروں سے کھلنے ملنے لگی۔ ایک دعوت میں اس کی ملاقات گلین ٹرنر سے ہوئی اور دونوں کے معاشقے کا آغاز ہوا۔ یہ ۱۹۹۱ء کی بات ہے۔

اس عشق پر گلین کے دوستوں کو حیرانی ہوئی کیونکہ وہ ایک بدھو اور دبو قسم کا نوجوان تھا۔ پھر جولیا کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھتی تھی، جبکہ گلین کا باپ ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا، تاہم جولیا اُسے رجھانے میں کامیاب رہی۔ اس نے اپنے محبوب کو سانپ کی کھال سے بنے قیمتی جوتے تحفتاً دیے۔ نیز اُسے سیر وتفریح کراتی رہی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی اور اُسے پا کر گلین اپنی قسمت پر رشک کرنے لگا۔

گلین کے قریبی دوستوں کا حلقہ ایک مزاحیہ خطاب ”چوہا گروہ“ (Rat Pack) سے مشہور تھا۔ جلد ہی اس کے دوستوں کو احساس ہوگا کہ جولیا ایک فضول خرچ اور ”شو“ مارنے والی لڑکی ہے۔ وہ ہر نوجوان سے چہلیں کرنے لگتی۔ اس کی سعی ہوتی کہ ہر تقریب میں شمعِ محفل بن جائے۔

جولیا کا مزاج بھی پل میں تولہ پل میں ماشہ والا تھا۔ گلین کی بہن، لنڈا ہارڈی اس سے ملی جلی، تو جان گئی کہ یہ لڑکی چند سیکنڈ میں محبت کرنے والی ہے، انتہائی نفرت کی چھٹی حس فوراً جان گئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

جولیا نے اپنے محبوب کو سانپ کی کھال سے بنے قیمتی جوتے تحفتاً دیے
گلین خوبصورت لڑکی پا کر اپنی قسمت پر رشک کرنے لگا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرنے والی بن جاتی ہے۔

ان دونوں میں مشترکہ بات صرف یہ تھی کہ وہ کار دوڑ پسند کرتے تھے۔

بہرحال ان کا معاشقہ جاری رہا۔ ایک دن گلین نے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ جولیا سے شادی کر رہا ہے۔ اس نے شادی کی انگوٹھی بھی دکھائی۔ تاہم گلین نے ''چوہا گروہ'' کو یہ نہ بتایا کہ اس کی ساری انشورنس پالیسیوں سے صرف جولیا مستفید ہوسکتی تھی۔ جب اس کے دوستوں کو یہ بات معلوم ہوئی، تو انھیں بڑا صدمہ پہنچا۔

گلین ٹرنر

دراصل شادی کے وقت جولیا قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ جولیا کے گھر اور کار کی ہفتہ وار اقساط تقریباً اس کی تنخواہ کے برابر تھیں۔ پھر کریڈٹ کارڈ کی حد سے زائد رقم خرچ کرنے پر وہ بھاری جرمانوں کی زد میں تھی۔ گلین کے دوستوں کو یقین ہے کہ شادی کے وقت وہ ان تلخ حقائق سے بے خبر تھا۔

بہرحال اگست ۱۹۹۳ء میں جولیا اور گلین رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ بیشتر دوست احباب حتیٰ کہ گلین کی ماں کو بھی یقین تھا کہ شادی زیادہ عرصہ نہیں چلے گی۔ ''چوہا گروہ'' میں تو اس بابت شرطیں لگ گئیں کہ ان کا بندھن کب تک برقرار رہے گا۔

حسب توقع ہنی مون سے قبل ہی دونوں میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ دراصل جولیا کو اس امر پر شدید طیش آیا کہ گلین نے لگژری کے بجائے ہنی مون کا فیملی پیکج کیوں لیا۔ رفتہ رفتہ ان کے ازدواجی تعلقات بھی سرد مہری کا شکار ہوگئے۔ حتیٰ کہ وہ الگ کمروں میں سونے لگے۔

تاہم گلین اپنی شادی برقرار رکھنا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے بیوی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی کوششیں کیں۔

پولیس کار میں گلین کا ساتھی، ڈیوڈ ڈنکرٹن بتاتا ہے ''ایک دن گلین نے دوران کار جولیا کو فون کیا اور پوچھا، تمھارے لیے کچھ لیتا آؤں؟'' جواباً جولیا نے بڑا درشت رویہ اختیار کیا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ آخرکار گلین بھی کہنے لگا ''جب اُسے میری فکر نہیں، تو میں کیوں کروں؟''

اُدھر جولیا نے شاہ خرچی جاری رکھی۔ کریڈٹ کارڈ کی بنیاد پر کار خرید لی اور سیر و تفریح پر جاتی رہی۔ خرچے اتنے بڑھ گئے کہ انھیں پورا کرنے کی خاطر بے چارے گلین کو دوسری ملازمت کرنا پڑی۔ لیکن جب جولیا اس سے بُرے انداز میں پیش آتی رہی، تو گلین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

اب گلین نے اس سے طلاق لینے کا فیصلہ کرلیا اور کاغذی کارروائی شروع کرا دی۔ جب جولیا کو یہ بات معلوم ہوئی، تو وہ طیش میں آگئی۔ اس نے شوہر کو دھمکی دی کہ اگر اُسے طلاق ملی، تو وہ اسی کے سرکاری ریوالور سے اسے گولی مار دے گی۔ انھی دنوں گلین نے ڈنکرٹن کو بتایا ''اگر مجھے کچھ ہوا، تو جولیا کی طرف ضرور دیکھنا۔'' اور پھر ایک دن اچانک وہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔

کیتھی ٹرنر سے لے کر گلین کے دوستوں تک سبھی کو جولیا پر شک تھا۔ لیکن وہ اس کے خلاف ثبوت کہاں سے لاتے؟ کیتھی دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانا چاہتی تھی، لیکن اُسے کہا گیا کہ اب وہ اپنی جیب سے اخراجات ادا کرے۔ بے چاری کیتھی کہاں سے ہزاروں ڈالر لاتی، چنانچہ وہ رو پیٹ کر خاموش ہوگئی۔ گلین کے دوستوں نے سعی کی کہ اعلیٰ حکام سے انھیں جولیا کے خلاف تفتیش کی اجازت مل جائے مگر ناکامی مقدر بنی۔ کیتھی اور گلین کے سبھی دوست

اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ شوہر کی موت کے صرف ۴۸ دن بعد جولیا نے رینڈی تھامپسن کے نام سے ایک فلیٹ کرائے پر لیا اور وہاں منتقل ہوگئی۔

دراصل شادی کے ۱۰ ماہ بعد ہی جولیا نے رینڈی کو پھانس لیا جو مقامی فائر بریگیڈ کا افسر تھا۔ وہ بھی گلین کے مانند شریف النفس اور بھولا بھالا تھا۔ جولیا نے اُسے بھی قیمتی تحفے دیے۔ اعلیٰ ہوٹلوں میں کھانے کھلائے اور اپنے جال میں پھانس لیا۔ رینڈی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اس کی محبوبہ شادی شدہ ہے۔

جولیا کو گلین کی انشورنس میں سے ڈیڑھ لاکھ ڈالر موصول ہوئے۔ ۱۹۹۵ء کے موسم سرما میں جولیا نے اس رقم کی مدد سے گھر خرید لیا اور بغیر شادی کے رہنے لگے۔ جنوری ۱۹۹۶ء میں ان کی بیٹی، امبر پیدا ہوئی۔ ایک سال بعد بیٹا، بلیک دنیا میں چلا آیا۔ بچے ہونے کے باوجود جولیا شادی سے انکار کرتی رہی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ رینڈی سے شادی کرتی تو گلین کی پنشن سے محروم ہو جاتی۔

۱۹۹۷ء کے اوائل میں جولیا اپنے دوسرے محبوب کو بھی یہ باور کرانے میں کامیاب رہی کہ وہ اپنی لائف انشورنس اس کے نام کر دے۔

اگلے سال جولیا کے اصرار پر رینڈی نے انشورنس کی رقم ایک لاکھ ڈالر سے بڑھا کر ۲ لاکھ ڈالر کر دی۔

اس کے بعد جولیا اپنے دوسرے بے نکاحی شوہر سے بھی تعلقات خراب کرنے لگی۔ اس ضمن میں چالاک عورت کا ہتھیار ذہنی ٹارچر کرنا تھا۔ اب وہ بات بے بات رینڈی کو دق کرنے لگی حتیٰ کہ ۱۹۹۹ء میں پریشان حال رینڈی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

رینڈی

لیکن رینڈی اپنی ۵ سالہ بیٹی اور ۲ سالہ بیٹے کی خاطر یہ رشتہ برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹ جنوری ۲۰۰۱ء کو دونوں کی ملاقات ہوئی تا کہ آپس کے اختلافات دور ہوسکیں۔ ۳ دن بعد رینڈی اپنے کرایہ کے اپارٹمنٹ میں مردہ پایا گیا۔ اس کی عمر صرف ۳۲ سال تھی۔

☆☆

عجیب بات یہ ہے کہ موت سے قبل رینڈی بھی پہلے فلو جیسے اثرات میں گرفتار ہوا۔ اپارٹمنٹ کے دیگر مکینوں نے اس کی حالت خراب دیکھی تو اُسے ہسپتال لے گئے مگر وہ صحت یاب نہ ہوسکا۔ موت کے بعد جب لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا، تو پتا چلا کہ رینڈی دل کی بے ترتیب دھڑکن کے باعث چل بسا۔ لیکن مجرم قانون کی نظروں سے کتنا ہی چھپ لے، ایک نہ ایک دن ضرور بے نقاب ہوتا ہے۔ جولیا کی بھی ایک معمولی سی ٹیلی فون کال اُسے جیل بھجوانے کا سبب بن گئی۔

ہوا یہ کہ جولیا نے کرائے پر کاریں دینے والے ایک ادارے کو فون کیا۔ وہاں اس کی بات مائیک آرچر نامی مینیجر سے ہوئی۔ جولیا دراصل کرائے کی گاڑی میں رینڈی کے جنازے تک جانا اور آنا چاہتی تھی۔ اُسے علم نہ تھا کہ مائیک آرچر اس کے پہلے شوہر، گلین ٹرنر کا قریبی دوست تھا۔ پولیس سے ریٹائرمنٹ کے بعد اب وہ ادارے کا مینیجر بن گیا تھا۔

مائیک آرچر کو جب معلوم ہوا کہ جولیا گاڑی کیوں چاہتی ہے، تو اس میں مخصوص ''پولیس'' حس جاگ اٹھی۔ اُسے یقین ہوگیا کہ عیار عورت نے اپنے دوسرے محبوب کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اس نے پھر

WWW.PAKSOCIETY.COM urdudigest.pk

"چوہا گروہ" کے ارکان سے رابطہ کیا جن میں سے بعض اعلیٰ عہدوں پر پہنچ چکے تھے۔

اب ان پولیس افسروں پر زور ڈالا گیا کہ وہ جدید ترین ٹیکنالوجی بروئے کار لاتے ہوئے رینڈی کی نعش کا پوسٹ مارٹم کرائیں۔ اسی دوران رینڈی کی ماں، نیتا نے مقامی اخبار، اٹلانٹا جرنل کے ایک صحافی، جون ہینسن سے رابطہ کیا اور اُسے جولیا کے مشکوک ماضی و حال کی بابت بتایا۔ جب جون ہینسن نے اپنے طور پر تحقیق کی، تو اُسے بھی احساس ہوا کہ یہ عورت قاتلہ ہے۔ اس نے ایک مضمون لکھا جس میں گلین اور رینڈی کی اموات میں پائی جانے والی مماثلت کا تذکرہ کیا۔ جون نے اپنے اخباری مضمون میں جولیا کو "موت کی ایلچی" قرار دیا۔

پولیس افسروں کی کوششوں اور اخباری مضمون کے باعث آخرکار مقامی حکومت نے ایک فورینسک پیتھالوجسٹ (Forensic Pathologist) سے رینڈی کا پوسٹ مارٹم کرایا۔ اب تفصیلی جائزے سے رینڈی کے گردے میں کیلشیم آگزیلیٹ کے کرسٹل پائے گئے۔ یہ کرسٹل ایتھلین گلائی کول کے باعث جنم لیتے ہیں۔ گویا جولیا مختلف کھانوں میں اس کی معمولی مقدار شامل کر کے رینڈی کو کھلاتی رہی۔ اس نے رفتہ رفتہ رینڈی کے گردے و دل گلا دیے اور پھر موت سے ہمکنار کر دیا۔ اسی ایتھلین گلائی کول کو گاڑیوں میں مانع ضد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ ثبوت پا کر جولائی ۲۰۰۱ء میں فیصلہ ہوا کہ جدید ٹیکنالوجی ہی کے ذریعے گلین ٹرنر کا بھی پوسٹ مارٹم کرایا جائے۔ چنانچہ قبر کھود کر لاش نکالی گئی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس کے گردوں میں بھی کیلشیم آگزیلیٹ کی کثیر مقدار پائی گئی۔ یوں یہ شک پختہ ہو گیا کہ قاتل عورت نے ایتھلین گلائی کول سے مدد لیتے ہوئے اپنے دونوں محبوبوں کو اگلے جہان پہنچا دیا۔

پولیس نے گلین کو قتل کرنے کے الزام میں جولیا کو گرفتار کر لیا۔ نومبر ۲۰۰۲ء سے مقدمہ کا آغاز ہوا۔ دوران

جولیا شیرف بننا چاہتی تھی لیکن امتحان میں فیل ہو گئی۔ اس ناکامی نے جولیا کو نفسیاتی مریض بنا دیا۔ پھر اُس نے ۲ پولیس والوں کو قتل کر کے ثابت کرنا چاہا کہ وہ قانون سے زیادہ سمارٹ، چالاک اور ذہین ہے

کارروائی جولیا کے چہرے پر کسی قسم کی پشیمانی یا ندامت دکھائی نہ دی، بلکہ وہ صحافیوں کے سامنے یہ شیخی بگھارتی "مجھے سزا نہیں ہو سکتی، میں رہا ہو جاؤں گی۔"

لیکن پولیس نے جولیا کے خلاف ناقابل تردید ثبوت اکٹھے کر لیے تھے۔ چنانچہ جیوری اور جج دونوں نے اُسے مجرم قرار دیا۔ اُسے عمر قید کی سزا ملی۔ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں اس پر رینڈی کو قتل کرنے کے الزام پر مقدمہ چلا۔ اس میں بھی اُسے عمر قید کی سزا کا حقدار ٹھہرایا گیا۔

مقدموں کے دوران انکشاف ہوا کہ جولیا شیرف بننا چاہتی تھی لیکن وہ امتحان میں فیل ہو گئی۔ اس ناکامی نے جولیا کو نفسیاتی مریض بنا دیا۔ اس نے پھر ۲ پولیس والوں کو قتل کر کے ثابت کرنا چاہا کہ وہ قانون سے زیادہ سمارٹ، چالاک اور ذہین ہے۔ جولیا نے محبت کا ڈھونگ رچایا، گلین اور رینڈی کو ٹھکانے لگایا اور یوں تسکین حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ لاکھوں ڈالر کی بھی مالک بن گئی۔

اس شیطان فطرت عورت کا انجام بھی عبرت ناک ہوا۔ وہ ۶ برس جیل میں پڑی سڑتی رہی۔ اس دوران ضمیر کی خلش نے اُسے اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ وہ خون کا دباؤ (بلڈ پریشر) کم کرنے والی ادویہ کھانے لگی۔ ادویہ کے کثرتِ استعمال نے ۳۰ اگست ۲۰۱۰ء کو جولیا کی جان لے لی۔ یوں وہ اپنے تمام گناہوں سمیت خدا کے حضور حاضر ہو گئی۔ یقیناً دوزخ کا عذاب اُسے تڑپاتا ہو گا لیکن اب پچھتانے کا کیا فائدہ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

urdudigest.pk
WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک محفل میں ایک صاحب زمانے کی ناقدری کا رونا رونے شروع ہوئے، تو بولتے ہی چلے گئے۔ حتیٰ کہ انھوں نے زمانے کو بھی کھری کھری سنا دیں، حالانکہ ہماری کتاب مقدس میں حکم دیا گیا ہے کہ زمانے کو برا مت کہو، یہ تو انسان ہے جو اپنے عمل سے وقت کو نیک یا بد بناتا ہے۔ بہرحال ہر معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو صرف منفی عینک ہی سے زندگی کو دیکھتے ہیں۔ انھیں اردگرد بکھری نیکیاں اور اچھائیاں نظر نہیں آتیں۔

اس کے برعکس رجائیت پسند بھی موجود ہیں۔ وہ بدی کے واقعات سے بھی خیر کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ ایک ایسا ہی رجائیت پسند انگریز سائنسی ادیب، میٹ ریڈلی بھی ہے۔ اس کا کہنا ہے ''آج دنیا کی حالت جتنی اچھی ہے، وہ انسانی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں رہی اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں حالات مزید اچھے ہوں گے۔''

آج دنیا جنگ و جدل، غربت، مہنگائی اور امراض کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ تقریباً ہر انسان کسی نہ کسی مسئلے کا شکار ہے۔ ایسے میں میٹ ریڈلی کی باتیں عجوبہ ہی لگیں گی۔ اسی لیے امریکا و یورپ میں میٹ کے ناقد اُسے ''احمق''، ''پاگل'' اور ''جھوٹا'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ تاہم کڑی نکتہ چینی کے باوجود وہ دل برداشتہ نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنے دل پسند موضوع پر پوری کتاب ''دی ریشنل آپٹیمسٹ: ہاؤ پراسپیرٹی ایوولوز (The Rational Optimist: How prosperity evolves) لکھ ڈالی۔

کتاب میں میٹ نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ آج دنیا میں زندگی گزارنا اتنا بھی برا نہیں جتنا عام لوگ سمجھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے ''میں سمجھتا ہوں کہ ایک روشن مستقبل بنی نوع انسان اور کرہ ارض کا منتظر ہے اور ایسا سوچنا ہرگز دیوانگی نہیں۔''

میٹ ریڈلی کی زندگی بھی خاصی گہما گہمی میں گزری۔ وہ ایک اخبار میں صحافی رہا، پھر ماہر حیوانیات بنا، پھر معاشیات دان اور ماہر مالیات رہا اور اب سائنسی ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے بتاتا ہے ''میرے ناقدوں کا ہے کہ تم چغد ہو، کہتے پھرتے ہو کہ دنیا بہترین کی گامزن ہے۔ لیکن میں یہی بات بار بار کہتے نہیں تھک اپنا دعویٰ برحق کرنے کی خاطر کتاب میں ریڈلی ۱۶/دلائل دیے ہیں۔ انھیں پڑھیے اور فیصلہ کیجیے کہ وہ ہے یا نہیں۔

1 ہماری حالت پہلے سے بہتر ہے

۵۰/سال قبل کی نسبت آج فرد ۳/گنا زیادہ کما تقریباً ۷۵/فیصد حرارے زیادہ کھاتا، کم بچے دفناتا اور برس زیادہ جیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے ۵۰ برس دوران دنیا کے ہر حصے میں ترقی ہوئی اور وہ ماضی مقابلے میں بہتر ہوگیا حالانکہ اسی عرصے میں دنیا کی آبا تقریباً دگنی ہوگئی۔

2 شہر میں رہنا اچھا ہے

شہروں کے باسی کم جگہ گھیرتے، کم توانائی اس کرتے اور دیہاتیوں کے مقابلے میں فطری ما (Ecosystems) پر کم منفی اثرات مرتب کرتے آج دنیا کے شہروں میں عالمی آبادی کا ۵۰/فیصد حصہ ہے، لیکن انھوں نے صرف ۳/فیصد جغرافیائی جگہ گھیر ہے۔ ماحولیات دانوں کو شہروں کا پھیلاؤ اور بڑھتی پسند نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دیہات میں کرۂ ارض کے لیے کوئی سب سے مفید امر نہیں۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم بلندو بالا عمارات تعمیر کریں۔

3 غربت میں کمی کا رجحان

درست ہے کہ امیر پہلے سے زیادہ دولت مند گئے۔ لیکن لاکھوں کروڑوں غریبوں نے بھی غربت

جان چھڑالی۔ مثلاً سائنسی تحقیق افشا کرتی ہے کہ ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۰ء کے درمیان غریبوں کی غذا دُگنی ہوگئی۔ اسی طرح ۵۰/برس کی نسبت آج چینی ۱۰/گنا زیادہ امیر اور تقریباً ۲۵/سال زیادہ جیتے ہیں۔ اسی طرح نائیجرین دو گنے امیر ہوچکے اور ۹/سال زیادہ جیتے ہیں۔ مزید برآں انتہائی غربت میں زندگی گزارنے والے لوگوں کی تعداد بھی اس عرصے میں آدھی ہوچکی۔ اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ پچھلے ۵۰/برس میں غربت جتنی کم ہوئی ہے، اتنی ۵۰۰/سال کے دوران بھی دیکھنے کو نہیں ملی۔

4 اہم اشیا سستی ہوگئیں

ہم ماضی کی نسبت زیادہ امیر، صحت مند، طویل قامت، ذہین، لمبی عمر پانے والے اور آزاد اس لیے بھی ہیں کہ ہماری ۴/بنیادی ضرورتیں...... غذا، لباس، ایندھن اور رہائش سستی ہوگئیں۔ مثال کے طور پر ۱۸۰۰ء میں ایک عام آدمی ۶/گھنٹے محنت کرکے اتنا کماتا تھا کہ ایک گھنٹے والی موم بتی خرید سکے۔

۱۸۸۰ء میں ایک عام آدمی ۲۰/منٹ کام کر کے اتنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

رقم کمانے لگا کہ ایک گھنٹہ چلنے والا مٹی کا تیل خرید لے۔ آج یہ عرصہ (بیشتر ممالک میں) صرف آدھا سیکنڈ ہو چکا۔ گویا حساب کی رو سے ہم ۱۸۰۰ء کی نسبت آج ''۲۰۰، ۴۳'' گنا زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ ہیں۔

5 ماحولیات زیادہ بہتر ہوئی

پچھلے کئی برس سے ہمارا ماحول مجموعی طور پر صاف ہو رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اب دھواں چھوڑنے والی گاڑیاں اور کارخانے عنقا ہیں۔ پھر جدید گاڑیاں ماضی کی نسبت کم آلودہ گیسیں خارج کرتی ہیں۔

6 خرید و فروخت نے ایجادات کو جنم دیا

یہ سچ ہے کہ اب بھی لاکھوں انسان شدید غربت میں گرفتار ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری نسل کو پچھلی نسلوں کے مقابلے میں زیادہ حرارے، واٹ، ہارس پاور، گیگا بائٹس، میگا ہرٹز، مربع گز، ہوائی میل، غذائی ایکڑ، کلومیٹر فی لیٹر اور ظاہر ہے، زیادہ پیسے میسر ہیں۔ بنی نوع انسان جب تک نت نئی اشیا بناتا رہا، یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

7 زیادہ کھیت زیادہ جنگل

۱۹۰۰ء سے عالمی آبادی میں ۴ گنا اضافہ ہو چکا، لیکن دیگر متعلقہ چیزیں بھی بڑھی ہیں مثلاً کھیتوں کا رقبہ ۳۰ فیصد بڑھا جبکہ فصلوں کی مقدار ۶۰۰ فیصد بڑھ گئی۔ اسی دوران کاشتکار ۲ ارب ایکڑ رقبہ چھوڑ کر شہر چلے گئے۔ چنانچہ یہ رقبہ اب جنگلوں میں ڈھل رہا ہے۔ یہاں اب خوب حیاتی تنوع ملتا ہے۔ اس صدی میں دنیا والوں کو مناسب غذا دستیاب ہوگی جبکہ نئے کھیت بھی وجود میں نہیں آئیں گے۔

8 پٹرول کا خات[illegible] قریب نہی[illegible]

۱۹۷۰ء میں پٹرول کے مستند ذخائر کی [illegible] ۵۰۰ ارب بیرل تھی...... آنے والے ۲۰ برسوں [illegible] والے ۶۰۰ ارب بیرل تیل پی گئے۔ لہٰذا ۱۹۹۰ [illegible] پٹرول ختم ہو جانا چاہیے تھا مگر اس سال پٹرول کے ذخائر ۹۰۰ ارب بیرل تک پہنچ چکے تھے۔

درج بالا اعداد و شمار میں تارمٹی اور آئل شیل میں [illegible] پٹرول شامل نہیں، اس کی مقدار کئی ہزار ارب بیرل [illegible] جاتی ہے۔ اس مثال سے عیاں ہے کہ تیل، کوئلہ اور [illegible] ابھی کئی عشروں تک انسانوں کے کام آئیں گے۔ ایند[illegible] کے یہ تینوں ذرائع محدود ہیں مگر خاتمے سے پہلے ہی انس[illegible] ان کا متبادل دریافت کر لے گا۔

9 عالمی معاش[illegible] بحران عارضی ہ[illegible]

۱۹۳۰ء میں امریکا کے معاشی بحران نے پوری د[illegible] متاثر کیا لیکن وہ ایک عارضی واقعہ تھا۔ یہی وجہ [illegible] ۱۹۳۹ء تک بحران سے شدید متاثر دونوں ممالک امری[illegible] جرمنی ۱۰ سال قبل کی نسبت خوشحال ہو چکے تھے۔ [illegible] دوران ہر قسم کی صنعتوں اور مصنوعات نے جنم لیا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ حکومتیں بُری پالیسیاں نہ بنا[illegible] ترقی جاری رہتی ہے۔ آج بھی کہیں نہ کہیں پہلا [illegible] سافٹ ویئر بنانے میں محو ہے، دوسرا نئے مواد پر تحقیق [illegible] ہے اور تیسرا ایسی شے بنانے لگا ہے جو زندگی گزارنا [illegible] بنا دے گی۔

10 آبادی میں اضاف[illegible] خطرہ نہی[illegible]

گو دنیا کی آبادی بڑھ رہی ہے، تاہم پچھلے ۵۰ [illegible] سے شرح اوسط میں کمی کا رجحان ہے۔ چنانچہ تمام م[illegible] میں ۱۹۶۰ء کی نسبت شرح پیدائش کم ہے۔ خصوصاً [illegible] پذیر ممالک میں شرح پیدائش تقریباً آدھی کم ہو چکی۔ اب لوگ زیادہ عرصہ زندہ رہتے ہیں اور اموات اطفال میں بھی کمی آ چکی، پھر بھی آبادی میں اضافہ پہلے جیسا تیز رفتار نہیں رہا۔ اقوام متحدہ کی تازہ رپورٹ کے مطابق ۲۰۷۵ء تک کرۂ ارض پر ۹ ارب ۲۰ کروڑ افراد آباد ہوں گے۔ تب آبادی میں کمی آنے لگے گی۔ گویا امکان یہی ہے کہ سبھی لوگوں کا پیٹ بھرتا رہے گا۔ آج بھی دنیا میں ۷ ارب انسان آباد ہیں اور بہرحال انھیں پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا ہے۔

11 ہم خوش قسمت ترین نسل ہیں

تاریخ انسان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ دورِ حاضر کی نسل ہی کو سب سے زیادہ امن، آزادی، فارغ وقت، تعلیم، ادویہ اور سیر و سفر نصیب ہوا۔ افسوس کہ وہ دستیاب نعمتوں پر شکر گزار نہیں مثلاً خریدار اس امر پر خوش نہیں ہوتے کہ انھیں خریدنے کے لیے ڈھیر ساری اشیا دستیاب ہیں۔ الٹا وہ چیزوں کو کوسنے لگتے ہیں کہ انھیں انتخاب کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ حالانکہ اشیا کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

تنوع سے خرابی پیدا نہیں ہوئی بلکہ کوئی شے منتخب کرنا آسان ہوگیا۔

12 ماضی ہمیشہ عمدہ نہیں ہوتا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گئے زمانے میں زیادہ سکون، سادگی، ملنساری اور روحانیت تھی جو اب عنقا ہوچکی۔ یہ نظریہ دراصل صرف سفید پوش طبقے اور اشرافیہ تک محدود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں ہمہ اقسام کی آفتیں زیادہ تھیں جواب خاصی کم ہوچکیں۔

13 عظیم خیالات و نظریات کا جنم

انسان کی سوچ لامحدود ہے، اسی لیے پوری دنیا میں روزانہ نت نئے نظریے جنم لیتے ہیں۔ دورِ جدید کی خصوصیت یہ ہے کہ اب پوری دنیا میں دانشور، سائنسدان، موجد وغیرہ ایک دوسرے سے خیالات ونظریوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزانہ نت نئی ایجادات ہوتی اور نظریے وجود میں آتے ہیں۔ مزید برآں کچھ بھی ہو جائے، انسان کو نظریات، دریافتوں اور ایجادات کی فراہمی جاری رہے گی۔

14 سمندری طوفان زیادہ نہیں ہوئے

پچھلی صدی میں کرۂ ارض کا درجہ حرارت بے شک تھوڑا سا بڑھ گیا، لیکن سمندری طوفانوں کی شرح میں کمی آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۰ء سے اب تک سمندری طوفانوں کے باعث چل بسنے والے انسانوں کی تعداد میں ۹۹ رفیصد کمی آئی ہے۔

دراصل سمندری طوفانوں سے پھیلنے والی تباہی کا انحصار تیز ہواؤں سے زیادہ دولت پر ہے مثلاً ۲۰۰۷ء میں میکسیکن شہر، یکتان سے سمندری طوفان ٹکرایا چونکہ حکومت نے بھرپور تیاری کر رکھی تھی لہٰذا ۴۰ رافراد ہی لقمۂ اجل بنے۔ اگلے سال اتنی ہی شدت کا سمندری طوفان برما کے ساحلی شہروں سے ٹکرایا اور ایک لاکھ [illegible] مار ڈالے۔ قدرتی آفتوں سے بچاؤ کا بہترین طریقہ ترقی وخوشحالی ہے۔

15 ہم تمام مسائل حل کر سکتے ہیں

اگر آپ لوگوں کو بتائیں کہ دنیا بہتر ہو رہی ہے، لوگ آپ کو دیوانہ سمجھیں گے۔ لیکن آپ یہ شور مچائیں کہ تباہی آئی کہ آئی، تو ممکن ہے آپ کو نوبل انعام مل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت آنے کی پیشین گوئیوں والی کتابوں سے دکانیں بھری پڑی ہیں۔ نام نہاد دانشوروں کا دعویٰ ہے کہ دنیا تباہ ہونے میں بس کچھ ہی دیر ہے۔

بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ اگر معاشی ترقی رک جائے، تو بنی نوع انسان کی بقا ممکن ہے۔ لیکن اب معاشی ترقی کا رکنا مشکل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسانی نسل مسائل حل کرنے والی مشین بن چکی ہے۔ وہ نت نئی راہیں [illegible] کر اپنے تمام مسئلے ختم کر ڈالتی ہے۔ اُسے حقیقی خطرہ اس بات سے ہے کہ کہیں معاشی ترقی سست نہ ہوجائے۔

16 اُمید پرست بننا سیکھیں

پچھلے ۲۰۰ ربرس سے قنوطی ہی شہ سرخیوں میں چھائے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اس دوران اُمید پرستوں کی [illegible] پیشین گوئیاں درست ثابت ہوئیں۔ دراصل قنوطیت سے [illegible] لوگوں کے مفادات وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر ہر این جی او یہی واویلا مچا کر چندہ جمع کرتی ہے کہ دنیا مصائب وآفات کا نشانہ بن چکی ہے۔ آج تک ایسے صحافی کو صفحۂ اول [illegible] نہیں ملی جو ٹل جانے والی آفت پر تحریر لکھے۔ اخبار ورسائل بھی اسی وقت چلتے ہیں جب وہ زیادہ سے زیادہ مار دھاڑ کی خبریں وتحریریں شائع کریں۔ چنانچہ پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں اور امید پرست بننے کی سعی کریں۔

سیٹی کے لیے زیادہ قیمت

حمنہ طالب

فرینکلن اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ ۷رسال کی عمر میں میں نے بہت دنوں میں کچھ پیسے جمع کیے۔ ایک لڑکے کو سیٹی بجاتے دیکھا، جو مجھے بہت پسند آئی۔ وہ تمام پیسے دے کر میں نے سیٹی اس سے خرید لی اور خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا۔ گھر آکر معلوم ہوا کہ میں نے اس پر اصل قیمت سے چوگنے دام خرچ کیے ہیں، جن سے کئی اور کھلونے خرید سکتا تھا۔ میں رنج کے مارے رونے لگ گیا، اور میرا یہ افسوس اس خوشی سے کہیں زیادہ تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے واقعہ نے میرے دل پر ایک دیرپا اثر قائم کیا۔ یعنی کئی دفعہ جب مجھے کسی غیر ضروری چیز خریدنے کی ترغیب ہوتی، تو میں اپنے آپ سے کہتا "سیٹی کے لیے قیمت سے زیادہ مت خرچ کرو۔"

اور یوں اپنا روپیہ بچالیتا۔ جب میں بڑا ہو کر عملی دنیا میں داخل ہوا، تو مجھے معلوم ہوا کہ دنیا ایسے بیوقوفوں سے بھری پڑی ہے، جو سیٹی کی قیمت سے زیادہ اس پر خرچ کرتے ہیں۔ جب میں کسی طالب شہرت کو دیکھتا کہ محض حصولِ شہرت کی غرض سے وہ ملکی معاملات میں شوروغل مچاتا اور اپنے کاروبار میں تغافل کر کے مالی نقصان اٹھاتا ہے تو میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ "سیٹی کے لیے زیادہ قیمت خرچ کرتا ہے۔" اگر میں نے کوئی ایسا آدمی دیکھا جو نفیس لباس، نفیس سامان اور کروفر پرست تھا اور ان چیزوں کے لیے اس نے قرض لیا تھا، اور انجام کار جیل خانہ میں بھیجا گیا، تو میں خیال کرتا "افسوس اس شخص نے کتنی زیادہ قیمت سیٹی کے لیے دی ہے۔" الغرض میں نے نتیجہ نکالا کہ دنیا میں انسانی تکالیف کے بڑے حصے کا سبب یہ ہے کہ لوگ معاملہ کی قیمت لگانے میں غلطی کرتے اور سیٹی کے لیے مناسب سے بہت زیادہ قیمت دیتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کلاؤڈ کمپیوٹنگ

قیمتی ڈیٹا محفوظ کرنے کا نسخہ

دُنیائے انٹرنیٹ کی ایسی ہارڈ ڈسکیں جہاں ہر کوئی اپنا قیمتی ڈیٹا محفوظ کر سکتا ہے

ثاقب خان

آج ہم ایسی دنیا میں زندہ ہیں جہاں قدم قدم پر ڈیٹا یا کمپیوٹر میں محفوظ معلومات سے واسطہ پڑتا ہے۔ گھر ہو یا دفتر، ٹکٹ گھر ہو یا سپر اسٹور، بہت سی جگہوں پر اب کمپیوٹر ہی سارا کام انجام دیتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم کچھ ڈیٹا کسی بھی وجہ سے دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل رکھنا چاہتے ہیں۔

کمپیوٹر میں مطلوبہ ڈیٹا یا فائلیں محفوظ کرنے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اس پر پاس ورڈ لگا دیا جائے۔ لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ یوں ڈیٹا پر سرخ جھنڈا لگ جاتا ہے۔ وہ پھر گویا اعلان کر دیتا ہے ”مجھے دیکھو، میں ایک اہم اور خفیہ فائل ہوں۔ مجھے کھولنے کی سعی کرو اور تمام رازوں سے واقف ہو جاؤ۔“

اس کے علاوہ ایسے سافٹ ویئر بھی دستیاب ہیں جو مطلوبہ ڈیٹا کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک میں پوشیدہ کر دیتے ہیں۔ لیکن تب بھی خطرہ رہتا ہے کہ کمپیوٹر چلانے والا کوئی بھی ماہر انھیں کھوج سکتا ہے۔ گویا، یہ طریق کار بھی ۱۰۰ رفیصد حد تک کارگر نہیں۔

خوش قسمتی سے حال ہی میں مطلوبہ ڈیٹا خفیہ رکھنے کا ایک اور طریقہ سامنے آیا ہے جو اپنانے میں سب سے آسان اور تقریباً ۱۰۰ رفیصد محفوظ ہے۔ وہ یہ ہے کہ بڑی بڑی کمپنیوں نے دنیائے انٹرنیٹ میں ایسی دیو ہیکل ہارڈ ڈسکیں رکھ دی ہیں جن میں ہر کوئی مفت یا قیمتاً اپنی جگہ حاصل کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے، مفت جگہ تھوڑی ہے، مگر اتنی ضرور ہے کہ خاطر خواہ ڈیٹا اس میں سما جائے۔ کمپیوٹر کی اصطلاح میں اس قسم کی ڈیٹا چھپائی کو ”کلاؤڈ“ (Cloud) کا نام دیا گیا ہے۔

کلاؤڈ ڈرائیو میں رکھی فائلیں گویا آپ سے جدا ہو جاتی ہیں لیکن آپ جب چاہیں، جہاں بھی چاہیں، کسی بھی کمپیوٹر کے ذریعہ ان تک رسائی پا سکتے ہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ کلاؤڈ ڈرائیو سے نکلنے کے بعد آپ اپنے براؤزر کی ساری ہسٹری ختم کر دیں۔ ورنہ ہسٹری دیکھ کر سبھی کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کلاؤڈ ڈرائیو میں فائلیں رکھتے ہیں۔ ہسٹری مٹانے کے بعد کوئی نہیں جان سکتا کہ آپ کی خفیہ فائلیں کہاں موجود ہیں۔

دنیائے انٹرنیٹ میں کئی کمپنیوں نے کلاؤڈ کمپیوٹنگ کی سہولت فراہم کر رکھی ہے۔ تاہم ان میں بہترین خدمات و سہولیات فراہم کرنے والوں کا تعارف درج ذیل ہے:

ایمیزن کلاؤڈ ڈرائیو

ایمیزن کمپنی کی یہ کلاؤڈ ڈرائیو استعمال کنندہ کو ۵رگیگا بائٹ کی مفت سہولت فراہم کرتی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر آپ ڈرائیو میں کوئی ایم پی ۳ یا اے اے سی گانا رکھیں، تو اُسے باآسانی ایمیزن کلاؤڈ پلیئر کی مدد سے بجا سکتے ہیں۔

اگر آپ زیادہ جگہ چاہتے ہیں، تو آپ کو ہر زائد گیگا بائٹ کے لیے سالانہ ایک ڈالر فیس دینا ہو گی۔ تاہم ایمیزن کمپنی نے یہ رعایت دی ہے کہ اگر آپ اس سے گانوں کی کوئی سی ڈی خریدیں، تو آپ ایک سال کے لیے ”مفت“ ۲۵رگیگا بائٹ جگہ پا سکتے ہیں۔ ایمیزن کلاؤڈ ڈرائیو کی خامی یہ ہے کہ اس میں شیئرنگ، بیک اپ اور آن لائن ایڈیٹنگ کی سہولیات موجود نہیں۔

گوگل ڈوکس

یہ گوگل کا مشہور پروگرام ہے۔ جب گوگل ڈوکس ایپلی کیشن کے ذریعہ کوئی فائل بنائی جاتی ہے، تو اسے اسی پروگرام میں ایڈیٹ کیا جاتا ہے۔ لیکن اب گوگل نے استعمال کنندگان کو یہ سہولت فراہم کی ہے کہ وہ اس پروگرام میں کوئی بھی فائل محفوظ کر سکتے ہیں۔

فی الوقت گوگل ڈوکس ایک گیگا بائٹ کی مفت جگہ فراہم کرتا ہے۔ تاہم ۵رڈالر سالانہ فیس ادا کر کے آپ ۲۵رگیگا بائٹ جگہ پا سکتے ہیں۔ یوں یہ ایمیزن کلاؤڈ ڈرائیو کی نسبت سستا سودا ہے۔ اگر آپ کو زیادہ جگہ درکار ہے تو ۴۰۹۶ ڈالر ادا کر کے ”۱۶رٹیرا بائٹ“ کی جگہ حاصل کر سکتے ہیں۔ گوگل ڈوکس میں قیمتاً جگہ لی جائے، تو استعمال کنندہ جی میل اور پکاسا کے ساتھ اپنی فائلیں شیئر کر سکتا ہے اور یہ پروگرام بنیادی طور پر ایڈیٹنگ ٹول ہی ہے، تاہم یہ ضروری ہے کہ دیگر پروگراموں کی فائلیں ایڈیٹ کرنی ہوں، تو اس کے فارمیٹ میں منتقل کر دی جائیں۔

ونڈوز لائیو سکائی ڈرائیو

یہ دنیائے نیٹ کی بہترین کلاؤڈ ڈرائیو ہے۔ یہ استعمال کنندہ کو ۲۵رگیگا بائٹ مفت جگہ فراہم کرتی ہے۔ اس معاملہ میں اسے شکست دینا بہت کٹھن ہے۔ مزید برآں یہ ڈرائیو شیئرنگ اور ایڈیٹنگ کی سہولیات بھی مفت دیتی ہے۔ بہت سے لوگ ان کلاؤڈ ڈرائیوز کو بحیثیت بیک اپ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن آپ مخصوص فائلیں سبھی کی نظروں سے دور کرنا چاہتے ہیں، تو انھیں پوشیدہ کرنے کی بہترین جگہ کلاؤڈ ڈرائیو ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پر اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

فیصلہ آپ کیجیے

حساس ہونا کافی ہے یا کسی فلاحی معاشرہ میں احساس کرنے کی زیادہ ضرورت ہے

رخسانہ بشیر

حساس لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں......
حساس لوگ کبھی چین سے نہیں جی سکتے......
حساسیت صرف دکھ دیتی ہے......
حساس لوگ کبھی خوش ہونے کا ڈھنگ نہیں سیکھ سکتے
میں سوچتی ہوں کیا حساس ہونا واقعی بُری بات ہے۔ طعنہ ہے......؟

اپنے آس پاس بسنے والے لوگوں کو دیکھتی ہوں تو تین طرح کے لوگ ملتے ہیں...... ایک وہ کہ جو بس اپنی ذات میں مگن ہیں۔ جو صرف اپنے دکھوں پر افسردہ ہوتے اور اپنی خوشیوں پر مسکراتے ہیں۔ یہ بے نیاز لوگ ہیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے لیے اپنے غم...... اپنی مسرتیں تو معنی رکھتی ہی ہیں لیکن گردوپیش میں پھیلی ویرانی، پریشانی انھیں کسی حد تک متاثر کرتی اور سوچ وفکر میں مبتلا کر دیتی ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کسی کی پریشانی یا دکھ کا مداوا کرنے کے لیے کوئی لائحہ عمل ترتیب دیں...... اُن کی نظر اپنے اُلجھے حالات کی طرف اٹھ جاتی ہے اور وہ انھیں سلجھانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ یہاں کا تو سسٹم ہی خراب ہے ہم کیا کریں؟ یہ حقیقت پسندانہ سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے سینہ میں سارے جہاں کا درد ہوتا ہے۔ جو کسی حادثہ کا شکار ہونے والے کو سڑک پر پڑا دیکھ کر تڑپنے کے لیے نہیں چھوڑ دیتے بلکہ بغیر اپنے انجام کی پروا کیے زخمی فرد کو ہسپتال پہنچاتے اور سوچتے ہیں کہ سڑک پر بے یارو مددگار پڑا یہ وجود خدانخواستہ میرا اپنا کوئی عزیز بھی ہو سکتا تھا۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو کسی ننگ دھڑنگ بچے کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھتے ہیں یا کسی چھوٹے کو ورکشاپ پر اوزاروں سے اُلجھا پاتے ہیں۔ کسی معصوم کو ہوٹلوں اور کھوکھوں پر گاہکوں اور استاد کی جھڑکیاں سہتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کا سینہ دکھ کی شدت سے پھٹنے لگتا ہے۔ انھیں لمبی لمبی چم چم کرتی گاڑیوں میں بیٹھے وہ سوٹڈ بوٹڈ بچے یاد آنے لگتے ہیں کہ جن کے سکول کے بیگ اٹھانے کے لیے ایک فرد کو خصوصی طور پر متعین کیا جاتا ہے۔

یہ معاشرتی تفاوت انھیں اس قدر بے چین کر دیتا ہے کہ وہ ہر چھوٹے کے ہاتھ میں اوزار نہیں کتاب دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے اخراجات کم کر کے کسی ایسے ہی بچہ کا ماہانہ تعلیمی وظیفہ مقرر کرنے کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔

یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو بوڑھے مزدوروں کو تمام عمر اپنی ہمت سے بڑھ کر وزن اٹھاتے، جون جولائی کی تپتی دوپہروں میں اینٹیں ڈھوتے دیکھتے ہیں۔ سخت سردی، بارش اور برفباری میں کھلے آسمان تلے، ناکافی لباس میں روزگار کی تلاش میں سرگرداں پاتے ہیں تو مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے جدا ہونے لگتی ہے۔ آنسو کہیں آنکھ میں ٹھہرنے لگتے ہیں۔ بندۂ مزدور کے تلخ اوقات، سخت مشقت اور کم معاوضہ انھیں دکھی کر دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان جفاکشوں کا صابر وشاکر رویہ اور چہرے پر پھیلا اطمینان وسکون انھیں حیران بھی کر دیتا ہے

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

لیکن بندۂ مزدور کے چہرہ پر پھیلا ہوا اطمینان وسکون حساس لوگوں کو اس وقت بے اطمینان کر دیتا ہے جب ان کی نظر لوٹ جاتی ہے اس منظر کی طرف جہاں افلاس کے باعث بچے بلکتے اور تڑپتے ہیں جہاں گھر کا چولہا ٹھنڈا دکھائی دیتا ہے۔ جہاں علاج معالجے کی سہولتیں میسر نہیں۔ جہاں غریب کا بچہ اچھے سکول میں پڑھنے کا صرف خواب دیکھ سکتا ہے جہاں غریب والدین اپنا پیٹ کاٹ کر اگر بچے کو اچھی تعلیم دلانے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو سفارش، تعلقات اور رشوت نہ ہونے کے باعث دفتروں کے چکر لگا لگا کر ایک روز وہ تھک ہار کر آلو، چنے کی ریڑھی لگا لیتے ہیں یا پھر معاشرے سے انتقام لینے کے لیے غلط راستوں کے مسافر بن جاتے ہیں۔

اس معاشرہ کے حساس لوگ جب یہ منظر نامہ دیکھتے ہیں تو یہ سب دیکھ کر محض جلتے کڑھتے ہی نہیں بلکہ اس منظر نامہ کو تبدیل کرنے کی جستجو میں لگ جاتے ہیں۔

حساس لوگ ظلم ہوتا دیکھتے ہیں تو انصاف کے علمبردار بن جاتے ہیں۔ مظلوم کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کا حوصلہ بن جاتے ہیں۔ حساس لوگ اقتدار اور اختیار کے نشہ میں دُھت اور خود کو خدا سمجھنے والے لوگوں کو جب کمزوروں کے حقوق کا استحصال کرتے دیکھتے ہیں تو منافقت کا لبادہ اوڑھ کر صاحبانِ اقتدار واختیار کی خوشامد کر کے ذاتی مفاد سمیٹنے اور منظورِ نظر ہونے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ظالم سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت رکھتے ہیں خواہ کتنی ہی مشکلیں برداشت کرنی پڑیں۔

حساس لوگ دوسروں کے جوتوں میں کھڑے ہو کر سوچتے ہیں اوروں کی خوشیوں، آسانیوں اور خوشحالی کے لیے جنگ لڑتے ہیں۔ دوسروں کے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلانے کی جدوجہد میں لگے رہتے ہیں۔ معاشرہ سے انتشار، دکھ، پریشانی، سماجی تفاوت سب کے خاتمہ کے لیے اپنا وقت، سرمایہ اور آرام دان کر دیتے ہیں۔

حساس لوگ اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی جنگ لڑتے ہیں۔ دوسروں کے حقوق کا دفاع اور اُن کے گھروں کے دیپ روشن کرتے ہیں۔

میں سوچتی ہوں کہ حساسیت اگر ختم ہو گئی تو شاید انسانیت بھی دم توڑ دے گی۔ حساسیت کو اگر ہم نے خیر باد کہہ دیا تو پھر شاید کوئی کسی کے لیے اچھا نہ سوچ سکے گا۔ پھر توانا اور بااختیار لوگوں کے گھر ہی روشن رہ جائیں گے۔ پھر کسی مظلوم، کسی ناتواں، کسی مظلوم، کسی دکھی، کسی بے آسرا اور کم حیثیت کے گھر میں شادمانیوں کے چراغ کبھی نہیں جلیں گے۔ پھر انصاف صرف کتابوں میں رہ جائے گا۔ پھر بھینس صرف اس کی ہو گی جس کے پاس لاٹھی ہو گی۔ پھر نفسانفسی اور خودغرضی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس وطنِ عزیز کے گلی کوچوں میں آزادی سے گھوما پھرا کرے گی۔

پھر کوئی کسی کے دکھ پر آنسو نہ بہا سکے گا۔

کوئی کسی کو پُرسہ نہ دے سکے گا۔

پھر "اصلاح" کا لفظ ڈکشنری سے مٹانا پڑے گا کیونکہ رویے ہوں، حالات ہوں یا معاملات اس وقت تک بہتر نہیں کیے جا سکتے، اُس وقت تک اُن کی اصلاح ممکن نہیں جب تک اُن کی ٹیڑھ، اُن کی کجی، اُن کی خامی کو محسوس نہ کیا جائے۔ جب تک "ہے" اور "ہونا چاہیے" کے فرق کا ادراک نہ ہو اور جب تک دوسروں کے لیے کوئی بھی فیصلہ سناتے وقت خود کو کٹہرے میں کھڑا کر کے یہ سوال نہ کیا جائے کہ "اگر یہی سب کچھ میرے ساتھ دہرایا جائے تو میرا ردِعمل کیا ہوگا؟"

سچ تو یہ ہے کہ حساس ہوئے بغیر گھر ہو یا معاشرہ، کسی کی اصلاح ممکن نہیں۔ مجھے اپنے قارئین سے پوچھنا ہے کیا حساسیت واقعی اصلاح کی کُنجی ہے؟ اس معاشرہ کو فلاحی معاشرہ بنانے کے لیے کیا ہمیں محض احساس کی ضرورت ہے یا پھر حساسیت کی بھی......؟

احساس یا بے حسی......! ان دونوں میں سے کس کا انتخاب کرنا ہے، فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں۔ ■

WWW.PAKSOCIETY.COM

نواب بہادر یار جنگ کی یادگار تحریر سے انتخاب

سعودی عرب جیسا کہ ۱۹۳۰ء میں تھا

موٹر گاڑیاں تیزی سے دوڑائی جارہی تھیں چونکہ سست رفتاری کی صورت میں ریت میں پھنس جانے کا اندیشہ تھا

رضی الدین سید

سعودی عرب آج جس قدر ترقی یافتہ ملک نظر آرہا ہے کہ تمام ملک میں انتہائی چوڑی چوڑی سڑکیں ہیں، خوبصورت جدید ترین عمارتیں قائم ہیں، ہر قسم کے نئے ماڈلز کی بھاری بھرکم کاریں رواں دواں ہیں، حرمین شریفین کی خوبصورتی نے باقی تمام خوبصورتیوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، دولت کا جیسے وہاں دریا بہہ رہا ہو اور ریگستان جیسے وہاں سے بالکل نابود ہو گئے ہوں، آج سے کم از کم ۸۰ سال پہلے تک یہ ملک ہرگز ایسا نہیں تھا۔ بلکہ ایسا کیا، وہ تو ایک انتہائی پس ماندہ، ترقی سے کوسوں دور، جدید تہذیب سے قطعی ناواقف اور غربت کا مارا ہوا ملک تھا۔ مملکت کے باشندوں کی عادات کا حال یہ تھا کہ وہاں دن دہاڑے ڈاکے پڑتے تھے۔ ان کے خاص خاص لوگوں کی پرورش ہندوستان کے صوبہ حیدرآباد دکن کے نظام نے اپنے ذمہ لی ہوئی تھی۔ بہت سے عربی الاصل باشندے

مدینہ منورہ کی سفید مٹی سے بنی صراحیوں میں پانی ایک گھنٹے میں برف کی طرح سرد ہو جاتا ہے

دراصل اسی لیے ہندوپاک میں آباد ہیں کہ اپنے روزگار کے سلسلہ میں غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کے آباؤاجداد نقل مکانی کر کے حیدرآباد دکن آگئے تھے اور وہیں انھوں نے مقامی لڑکیوں سے شادیاں کرلی تھیں۔

نواب بہادر یار جنگ بھی اسی حیدرآباد کے ایک نواب گھرانہ کے فرد تھے اور تحریک پاکستان میں قائداعظم کے دستِ راست تھے۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں وہ عرب ممالک کے دورے پر نکلے تو اس وقت کے رائج الوقت ذریعۂ سفر، بحری جہاز کو اختیار کیا جو لوگوں کو دس دس بارہ بارہ دنوں کے بعد جا کر کہیں منزل مراد پر پہنچاتا تھا۔ طیاروں کے ذریعے آمدورفت اس وقت تک عام نہیں ہوسکی تھی۔ مذکورہ سفر کے تاثرات کو نواب بہادر یار جنگ نے اپنے ایک روزنامچے کی شکل میں محفوظ کیا تھا، جسے بعد میں ان کے دستِ راست شاہد حسین رزاقی نے ۱۹۸۸ء میں کراچی سے ''سیاحتِ ممالکِ اسلامیہ'' کے نام سے شائع کرایا تھا۔

کتاب کے اقتباسات سے سعودی عرب کے اُس دور کے شہروں اور شہریوں کی دلچسپ تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ سمجھ میں آتا ہے کہ آج کا ترقی یافتہ اور انتہائی سہولتوں والا ملک ۱۹۳۱ء یا اس سے پہلے کس قدر قابلِ رحم حالت میں تھا۔ واضح رہے کہ اس وقت سعودی عرب میں تیل کی تلاش کے کام کا آغاز نہیں ہوا تھا جبکہ مفید تیل کی برآمد وہاں ۱۹۴۵ء سے شروع ہوئی تھی۔

''کم وبیش تمام عالم عرب پر برطانیہ کا سیاسی و معاشی اقتدار قائم ہے۔ حجاز میں (البتہ) پرانی طرز کی بادشاہت قائم ہے۔ باقی عرب ممالک کو چھوڑ کر صرف ایک ملک حجاز ہی اپنے پرانے تمدن پر قائم ہے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے ہیں، سمندر کا رنگ زیادہ نیلا ہوتا جارہا ہے۔ بعض مرتبہ تو یہ گمان ہوتا ہے کہ (ہم) پانی نہیں بلکہ نیلی روشنائی کے سمندر میں سفر کر رہے ہیں۔ بحری جہاز کے درجہ دوم کے اچھے کمرے خاصے قید خانے ہیں۔ نہ اُن میں برقی پنکھے ہیں، نہ بل، نہ طشت۔ کمرا بھی تنگ اور کوتاہ! روزِ یکشنبہ کو ہم نے جہاز کے عرشے پر سے ذی الحجہ کا چاند دیکھا۔ اپنی عمر میں سیکڑوں مرتبہ ماہِ نور دیکھے تھے، لیکن اس ہلال کا نقشہ اب تک آنکھوں میں کھنچا ہے۔ نیلا سمندر نیچے اور نیلا آسمان اوپر۔ صاف مطلع، کھلی فضا، کوئی رکاوٹ نظر کے لیے نہیں۔ وہ چاند دیکھا جس کے دیکھنے کی ہر مسلمان کو تمنا کرنی چاہیے۔

جدہ

ساحل پر جہاز کے ٹھہرتے ہی (نیچے) چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں ساحلی عرب باشندے اشیائے خورونوش فروخت کرنے لے آئے۔ قیمت (اوپر سے) کشتیوں میں پھینکی جاتی اور سامان (نیچے) رسیوں سے باندھ کر کھینچ لیا جاتا تھا۔ جدہ کے ساحل کے قریب، سمندر میں دور دور تک بڑے بڑے پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں بعض جگہ سطحِ آب سے چند انچ نیچے (اوپر ہی سے) نظر آتی رہتی ہیں۔ ان کے درمیان راستہ اتنا پُرپیچ ہے کہ کسی مقامی واقف کار کی امداد کے بغیر جہاز آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جہاز ساحل سے دور ٹھہرتے ہیں اور پھر مسافر چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر ساحل تک پہنچتے ہیں اور پھر وہیں قرنطینہ (Quarantine) ہوتا ہے۔ جدہ چھوٹا سا شہر ہے۔ مسجدیں نہایت سادہ، اکثر پر منار نہیں ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مساجد پر حکومت کی نگرانی نہیں ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

جدہ میں میٹھے پانی کی بڑی قلت ہے۔ ایک مشین لگا دی گئی ہے جس کے ذریعے سمندر کے پانی سے نمک خارج کر کے آبادی میں پہنچایا جاتا ہے۔ (تاہم) صاف کرنے کے بعد بھی پانی میں شوریت باقی رہ جاتی ہے۔ بچے، عورتیں، مرد، خوش پوش اور بظاہر شرفا تک بھیک مانگتے ہیں اور قطعاً نہیں شرماتے۔

مکہ

مکہ میں "باب السلام" میں حرم کے اندر مسجدِ حرام سے متصل جو مکان منتخب کیا گیا وہ برائے نام مکان ہے۔ پکاتے وقت باورچی خانہ کے دھوئیں سے سارا گھر بھر جاتا ہے لیکن چونکہ اس کی ایک کھڑکی (خود) مسجد حرام میں کھلتی ہے جہاں سے خانۂ کعبہ، مقام ابراہیم اور صحنِ مسجد کی پوری سیر ہو جاتی ہے، اس لیے یہ مکان جنت ہے۔ موٹر گاڑیاں تیز دوڑائی جا رہی تھیں کیونکہ سست رفتاری کی صورت میں ریت میں پھنس جانے کا اندیشہ تھا۔

عرفات

تقریباً ۷۰ رہزار بندگانِ خدا، سنتِ ابراہیم کی تکمیل اور فریضۂ حج کی ادائی کے لیے آج تمام دن یہاں بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ عرب کی چلچلاتی ہوئی دھوپ نے خیموں تک کو تپا دیا ہے۔ حجاج پسینے میں شرابور ہیں۔ جسم پر ریت کی تہیں جم گئیں ہیں، بال پریشان ہیں، احرام میلے ہو چکے، ہونٹ خشک ہو رہے اور چہروں پر وحشت برس رہی ہے لیکن خوش ہیں کہ اللہ نے یہ دن بھی دکھایا اور بیت کی زیارت سے مشرف فرمایا۔ عرفات جاتے ہوئے آج سلطان بن سعود کی سواری دیکھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ موٹر میں سفر کریں گے، کیونکہ سیکڑوں موٹریں ان کی قیام گاہ سے عرفات کی طرف جاتے دیکھی تھیں لیکن دفعتاً ہمارے پیچھے گرد و غبار اٹھا اور سیکڑوں اونٹوں کا دَل بادَل نظر آیا۔ سب اونٹ تازہ اور توانا، اُن پر سواری کی زین کسی ہوئی، زینوں پر نجدی ڈنبوں کے رنگین خوبصورت چمڑے اور ہر اونٹ پر ایک سوار، احرام باندھے، گلے میں کارتوسوں کی پٹیاں ڈالے، پیٹھ پر بندوق اور ہاتھ میں بید لیے بیٹھا تھا۔ سب سے آگے ۱۰/۱۵ رسوار تھے اور تھوڑے فاصلے کے بعد سلطان کا اونٹ۔ سلطان بھی اسی طرح چمڑے کی زین پر بیٹھے نہایت سادہ باریک کپڑے کا احرام باندھے "لبیک" کہتے جاتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر سال قربانی کا گوشت کثیر مقدار میں ضائع ہو جاتا ہے۔ حجاز جیسے علاقہ میں جہاں وسائل معیشت نہایت محدود ہیں، اگر حکومت یا عوام کی جانب سے اس کو جدید حکیمیاتی طریقے سے محفوظ کر کے فروخت کیا جائے اور برآمد کیا جائے، تو اہلِ ملک کو معتدبہ مالی فائدہ ہو سکتا ہے۔ کاش کہ حکومت اس جانب توجہ کرے اور گوشت جیسی نعمت کو ضائع ہونے سے بچائے۔ (اب تو برسوں سے ہوائی جہازوں میں بھر کر گوشت سعودی حکومت کی جانب سے افریقی اور غریب مسلمان ممالک کو ہدیہ کر دیا جاتا ہے۔ سید)

اس سفر میں عرب کی فلاکت و افلاس کے بعض عجیب و غریب مناظر دیکھے۔ کوئی قہوہ خانہ اور موٹر اسٹینڈ ایسا نہ تھا جہاں موٹر رکی ہو اور معاً مانگنے والے چھوٹے بچوں سے لے کر بوڑھے مرد عورتوں تک نے اسے نہ گھیر لیا ہو۔ کسی طرف سے "اللہ یا کریم" کی صدائیں آ رہی ہیں، کوئی "یا سید الحجاج حج مقبول، زیارت مقبول" کہہ کر متوجہ کر رہا ہے اور کوئی "اللہ یودلکم بالعافیہ" (اللہ آپ کو خیریت سے گھر واپس لوٹا دے) کی آوازیں بلند کر رہا ہے۔ کوئی بہت چھوٹا بچہ "مسکین مسکین" کہہ کر چیخ رہا ہے اور کہیں ۷/۸ ربرس کے لڑکے لڑکیاں ناچ ناچ کر گا رہی ہیں "فاطمہؓ یا فاطمہؓ۔ فاطمہؓ بنت النبی۔"

آپ کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا۔ معاً آپ پر مانگنے والوں کا جمِ غفیر اس طرح ٹوٹ پڑا کہ یا تو آپ نے اپنی جیب اضطرار کی حالت میں فوراً خالی کر دی یا داد و دہش بند کر کے اس بلائے بے درماں سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہیں بھاگ نکلے۔ رات کو مجھے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی کہ کھانے کے بعد جب میری (ماسی) نے برتن دھوئے تو ایک بدوی لڑکی نے زمین پر سے چاول کے دانوں کو چُن چُن کر کھانا شروع کیا۔

مدینہ منورہ

میں نے مکہ معظمہ میں بھی دیکھا تھا اور مدینہ منورہ کے راستہ میں بھی تجربہ ہوا کہ بدوی عورتیں سخت پردہ کرتی ہیں۔ ہر بدوی عورت چاہے وہ مجمع میں چل پھر رہی ہو، کسی سے کھڑی بھیک مانگ رہی ہو، یا تنہا وسیع ریگستان میں اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی بکریاں چرا رہی ہو، آپ اس کا چہرہ کھلا ہوا نہ پائیں گے۔ عرفات کے راستہ پر میں

انہی پہاڑوں کے اندر حاجیوں کے قافلے لٹا کرتے تھے

نے دیکھا کہ اونٹ پر ایک بدوی عورت تنہا مگر پردے سے گھرے ہوئے شغدف (ہودے۔ سید) میں اندر بیٹھی ہے لیکن اس حالت میں بھی اس کے منہ پر نقاب پڑا ہے۔ حج کے قافلوں کو لوٹ لینا ایک عام سی بات تھی۔ نواب بہادر یار جنگ بیان کرتے ہیں کہ جب "بیئرابن احسان" سے آگے ایک پہاڑی کے دامن میں ہماری موٹریں کسی وجہ سے رک گئیں تو حاجی علی خان صاحب نے مجھے بتایا کہ انہی پہاڑوں کے اندر قافلے لٹ جایا کرتے تھے۔ وہاں ان کے گزشتہ سفر میں بھی ایک ایرانی قافلہ لٹ چکا تھا اور جب خود ان (علی خان صاحب) کا قافلہ پہنچا تھا تو قافلہ کے سالار نے کنارے پر رک کر ڈاکوؤں کے سردار سے معاملت (طے) کی تھی اور حجاج سے ڈھائی سو گنی رقم جمع کر کے انھیں ادا کی تھی تو نجات ملی تھی۔

مدینہ طیبہ کو نہرِ زرقا کا پانی سیراب کرتا ہے۔ مدینہ طیبہ میں سفید مٹی کی خوبصورت صراحیاں تیار کی جاتی ہیں۔ نہیں معلوم پانی میں یہ صلاحیت ہے یا صراحی کی خوبی ہے، یا ہوا کی تاثیر ہے کہ صراحی میں پانی بھر کر ہوا میں رکھ دیجیے، ایک گھنٹہ میں پانی اتنا ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ برف کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

مئورہ (ایک اور سعودی شہر) کے قریب پہنچے تو یہاں ہوائی طوفانوں سے سابقہ پڑا۔ دور سے ایسا لگتا تھا جیسے یہ شہر، بادلوں سے گھر گیا ہے (حالانکہ وہ تمام تر ریت کے تھپیڑے تھے)۔ قریب پہنچے تو منہ، ناک اور کپڑے باریک چھنی ہوئی ریت سے اَٹ گئے۔ ہوا تند و تیز چل رہی تھی۔ جہاں سہارا ملا، ریت کا ڈھیر لگ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹے ٹیلے صاف ہو کر میدان بن گئے جبکہ ریت جمع ہونے کی وجہ سے گڑھوں نے ٹیلوں کی شکل اختیار کر لی۔ مئورہ میں ایک گھنٹہ قیام رہا۔ لوگوں نے ستا لیا، نمازیں پڑھیں اور آگے بڑھے۔ ہم جب یہاں سے روانہ ہوئے تھے تو ہوا میں اعتدال پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر چلنے کے بعد معلوم ہوا کہ طوفان ہمارے ساتھ آ رہا ہے۔ ڈرائیوروں نے رفتار تیز کر کے گاڑیوں کو طوفان کی حد سے آگے کر دیا۔ میرے ڈرائیور نے بیان کیا کہ یہ طوفان بہت ہلکا تھا، ورنہ راستہ عبور کرنا مشکل ہو جاتا۔

واپسی جدہ

مئی ۱۹۳۱ء۔ لوگ جہاز پر روانہ ہو چکے تھے۔ اپنا مختصر سامان بھی جو کل نہیں گیا تھا "عربیہ" پر لدوایا۔ جدہ میں "عربیے" سواری کے لیے نہیں بلکہ باربرداری کے لیے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی شکل بیل گاڑی سے مشابہ ہوتی ہے۔ عموماً اس میں گدھے جوتے جاتے ہیں۔ ایک کشتی کرائے پر لی تاکہ جہاز پر پہنچا جا سکے۔ چونکہ مسافت لمبی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی اور میں نے صبح جلدی میں ناشتا نہیں کیا تھا اس لیے کشتی میں بیٹھے بیٹھے روٹی کھائی۔ پانی مانگا تو معلوم ہوا کہ سب صراحیاں خالی پڑی ہیں۔ سمندر حدِ نظر تک ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اگرچہ ہم پانی کی سطح پر سفر کر رہے تھے لیکن جہاز پر پہنچنے تک پینے کے لیے چلو بھر پانی بھی میسر نہ آیا۔

جدہ میں نہ کوئی کام ہے، نہ کوئی قابلِ دید مقام، نہ کوئی دلچسپ تفریح گاہ۔ صومالی لڑکوں نے پانی میں تیر تیر کر خیرات مانگی۔ معلوم ہوا کہ مدینہ طیبہ سے آنے والے مسافروں کو لے کر جہاز پرسوں روانہ ہوگا۔ تاخیر سخت ناگوار گزر رہی ہے۔ وقت خواہ مخواہ ضائع ہو رہا ہے۔ لیکن کس سے شکایت کی جائے۔ ان بحری کمپنیوں کا کوئی نظام ہی نہیں معلوم ہوتا۔

نواب بہادر یار جنگ نے دورانِ سفر مسافروں کے قرنطینے (Quarantine) کا بھی ذکر کیا ہے کہ نئے ملک میں داخلہ ہونے سے پہلے مسافروں کو کس طرح الگ تھلگ رکھا جاتا اور جراثیم سے پاک کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں حج کی خاطر اب ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔

مصر میں داخل ہونے سے پہلے ہم لوگوں کو ٹن کے ایک سائبان میں لے جایا گیا۔ پھر ایک اندرونی ہال میں پہنچایا گیا۔ ایک بڑے کمرے میں حاجی کپڑے اتارتے اور ایک چھوٹا سا تولیا ان قرنطینہ ہی سے دیا جاتا تھا، باندھ لیتے جس سے ستر پوشی بمشکل ہی ہو پاتی تھی۔ تمام کپڑے ایک بڑے تھیلے میں باندھ کر بھپارے کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نبض اور زبان دیکھتا ہے۔ دو دو یا چار چار اشخاص کے لیے صرف ایک حمام ہوتا ہے۔ اندر داخلہ کے وقت خلاصی (کارکن چپراسی) وہ چھوٹا سا تولیا بھی جھٹکا دے کر کھول لیتا ہے، جو ستر پوشی کی خاطر بندھا ہوتا ہے۔ حمام میں داخل ہوتے وقت جب خلاصی نے تولیا واپس دینے پر مجبور کیا تو میں نے ایک ڈانٹ کے ساتھ انکار کر دیا۔ قریباً پون گھنٹے انتظار کے بعد اُبلے ہوئے گرم اور گیلے کپڑے واپس ملے۔''

1931ء کے اُس اُجڑے، تکلیف دہ اور آسایشوں سے دور سعودی عرب کا حال آج کے جدید، روشن، پُرسہولت سعودی عرب سے کس قدر مختلف تھا، اس کی جھلکیاں آپ نے اوپر ملاحظہ کیں۔ حج کو ۷۰/۸۰ سال پہلے تک جس قدر مشقتوں سے بھرا ہوا تھا، آج کے حجاج اس کے ایک فیصد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ سید ابو احمد عاکف کی کراچی سے شائع شدہ کتاب ''Passionate Passages'' سے ایک مختصر اقتباس بھی ۱۰۰ سال پہلے والے سعودی عرب کا ایک نقشہ مزید فراہم کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک زمانے میں حج کا سفر نہ صرف انتہائی دشوار گزار بلکہ خطرناک بھی تھا۔ زائرین مہینوں سفر کرکے

بیل گاڑی سے شاہ عربیئے سواری کے لیے نہیں بار برداری کے لیے ہیں

حرمین پہنچتے تھے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج سے صرف ۸۸ سال پہلے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ (۴۰۰ کلومیٹر) کا سفر اونٹوں کے ذریعے ۳۰ روز میں طے ہوتا تھا۔ آج یہ سفر ۵ گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ مدینہ منورہ کی بعض مساجد میں وضو کے لیے بھی پانی خریدنا پڑتا تھا۔''

تاہم مملکتِ سعودی عرب عالمِ اسلام کے لیے تب بھی ویسی ہی قابلِ احترام سمجھی جاتی تھی، جیسی عظمت و احترام اسے آج حاصل ہے۔ حرمین شریفین کی عقیدت و عظمت بھی بھلا کبھی کم ہو سکتی ہے؟

حقیقی زندگی اور خوشیوں کے متلاشی لوگوں کے لیے ایک راہنما تحریر

یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے، امریکا کے ''گریٹ ڈیپریشن'' کی وجہ سے وہاں لاکھوں لوگ معاشی مشکلات میں گرفتار تھے۔ مایوسی اور غموں نے انھیں گھیر رکھا تھا۔ ان دگرگوں حالات سے متاثر ہو کر مشہور امریکی ڈراما نگار، یوگین اونیل نے ایک زبردست ڈراما ''برفانی آدمی'' (The Iceman) لکھا۔ یہ ڈراما خصوصاً نوجوانوں کی ذہنیت کے کئی پہلو بڑی خوبی سے آشکار کرتا ہے۔

ڈراما کا سیٹ ایک خستہ حال شراب خانہ ہے جہاں آنے والے بیشتر نوجوان بیروزگار اور شرابی ہیں۔ انھوں نے اپنی ناامیدی اور پریشان کن حالات کا علاج یوں ڈھونڈ رکھا ہے کہ ہمہ وقت تصوراتی دنیا میں بستے ہیں۔

ایک کردار، جو پہلے کسینو کا مالک تھا، اب وہ ہر وقت ساتھیوں کو بتاتا ہے کہ عنقریب کسینو دوبارہ کھلنے والا ہے۔ پیسٹ میگوٹین سابق پولیس لیفٹیننٹ ہے۔ وہ موزوں وقت کا انتظار کر رہا ہے تاکہ اپنی نااہلی کے خلاف اپیل کر سکے۔ جو ''ٹومارو'' سابق صحافی ہے۔ وہ یہی الاپ الاپتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہتا کہ اگلے دن اُسے نئی ملازمت مل جائے گی۔ غرض سبھی نوجوان کردار حال کے بجائے مستقبل میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر ان کا کل کبھی نہیں آتا، یوں وہ سدا خلا میں معلق رہتے ہیں۔ انھیں ایسی حقیقت کی تلاش تھی جو کبھی ان کی طرف رخ نہیں کرتی۔

ڈراما کا منفرد نوجوان کردار ہکی ہے، ایک سیلزمین جو ہر سال شراب خانہ آتا ہے۔ دراصل پہلے وہ بھی بلانوش تھا، لیکن جب ملازمت ملی، تو اس کی زندگی یکسر بدل گئی۔ وہ پھرتندہی سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اب اُسے سالانہ چھٹیاں ملیں، تو وہ شراب خانہ کا چکر لگا لیتا ہے۔

ہکی جب بھی آئے، اپنے ساتھیوں کو یہی بتاتا کہ شیخ چلی کی طرح خواب دیکھنا چھوڑو، حقیقی دنیا میں واپس آؤ اور اپنی تمناؤں کو عملی جامہ پہناؤ۔ وہ کہتا ''جھوٹ بول کر اپنے آپ کو دھوکا مت دو اور کل میں نہ جیو۔''

ایک دفعہ ہکی کے سارے دوست اس کی باتوں سے متاثر ہوئے۔ اگلے دن انھوں نے بہترین کپڑے پہنے اور شہر میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ پرانے تعلقات بروئے کار لاکر ملازمتیں ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ وائے قسمت، کسی کو بھی کامیابی نہ ملی۔ چنانچہ وہ شام کو شراب خانہ پہنچے تو بہت مایوس و پژمردہ تھے۔

دراصل جب انھوں نے اپنی امنگیں و امیدیں پوری کرنے کی سعی کی، تو انھیں یہ تلخ احساس ہوا کہ وہ توغیر معقول ہیں۔ لہٰذا اب وہ ان کی مدد سے معقول نظر نہیں آسکتے تھے۔ حتیٰ کہ اس شام انھیں شراب میں بھی پناہ نہ ملی۔ چنانچہ وہ ہکی کو مغلظات بکنے لگے۔ لیکن چند گھنٹے بعد ہی مستقبل میں دیکھنے والا بقا کا میکنزم حرکت میں آگیا۔ چنانچہ وہ شراب میں مخمور دوبارہ اپنی تصوراتی دنیا میں پہنچ گئے...... پھر ایسے کل پر ایمان رکھنے لگے جس نے کبھی نہیں آنا تھا۔

یوگین اونیل کے بہترین ڈراما کا سبق یہ ہے کہ انسان فطرتاً مستقبل میں جھانکتا ہے۔ تاکہ حال سے نظریں چرا سکے، اس سے دور ہوجائے۔ ڈراما میں شامل بیشتر کردار اس عمل کے انتہا پسندانہ روپ ہیں، لیکن یہ ... ہے کہ ہم سب خصوصاً نئی نسل معمول کی زندگی میں بھی ... نفسیاتی حکمت عملی اپناتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب ہم حال میں پریشان ہوں، تو فرار ہوکر مستقبل کی آغوش ... پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ کہ یہ عمل اتنے لطیف انداز میں ... پاتا ہے کہ ہمیں شعوری طور پر اس کا پتا ہی نہیں چلتا۔ ... کے طور پر ایک سہ پہر آپ گھر میں تنہا ہیں اور ٹی وی ... دیکھ کر بور ہو چکے۔ دماغ میں ہمہ اقسام کے منفی خیال... گھوم رہے ہیں۔ اب اس منفی صورت حال سے چھٹکارا پانے کی خاطر آپ مستقبل میں جھانکتے اور ایسے آمدہ واقعات کی اسکیٹنگ کرتے ہیں جن سے لطف اندوز ہوسکیں۔

گویا منفیت سے پیچھا چھڑانے کے لیے انسان خود بخود مستقبل میں جھانک کر سہارا ڈھونڈتا اور چند ... بعد ہی اُسے پا بھی لیتا ہے...... مثلاً آپ نے آنے وا... ہفتے اہل خانہ کے ساتھ فلم دیکھنے یا دوستوں کی معیت ... باہر کھانا کھانے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ تب آپ تصور ... خود کو پیاروں کے ساتھ گپ شپ لگاتے، ہنستے اور کھا... پیتے دیکھتے ہیں۔ یہ سوچتے ہی فوراً آپ کا موڈ خوشگوار ہوجاتا ہے اور زندگی اتنی بور و بیکار معلوم نہیں ہوتی۔

شاید آپ کو علم نہ ہو، ہر انسان ذہن میں مستقبل ... از کم ایک پُرلطف خاکہ ضرور محفوظ رکھتا ہے تاکہ ... ضرورت اس سے مدد لے سکے۔ مثال کے طور پر ... پسندیدہ پروگرام، اہل خانہ سے ہنسی مذاق، کوئی میچ ... کا موقع......!

بعض اوقات انسان حال سے فرار ہوکر مستقبل ... بہت دور نکل جاتا ہے مثلاً یہ سوچنا کہ چند سال ... ملازمت کو خیرباد کہہ کر اپنا کاروبار کروں یا دنیا ... لگاؤں گا۔ کبھی کبھی ایسے موقع پر دلی تمنائیں بھی سر ... ہیں، مثلاً اداکار یا گلوکار بننے کی خواہش۔ تب نوجوان نئی ہیئت میں نئے معیار زندگی سے لطف اندوز ہوتا ...

یہ عمل انسان کی آرزوؤں اور جوش و جذ... وابستہ اور صحت مندانہ پہلو رکھتا ہے۔ لیکن انسان ہر وقت مستقبل کی آرزوؤں میں بسا رہنے لگے اور حال کو نظرانداز کردے، تو تب یہ عمل مسئلہ بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان حال کے تجربات سے صرف نظر کرکے اپنی تمام توانائی مستقبل کی خواہشات پوری کرنے پر لگا دیتا ہے۔ تب ڈھاٹا بندھے گھوڑے کے مانند اُسے سامنے راستے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔

مستقبل کے ساتھ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی وہ حال بن جاتا ہے اور تب وہ عموماً ہماری توقعات پر پورا نہیں اترتا۔ اہل خانہ یا دوستوں کے ساتھ شبینہ دعوت میں لطف تو آتا ہے، لیکن اتنا نہیں جتنی توقع ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب ہم مستقبل میں پہنچیں، تو ساتھ اپنے نفسیاتی اختلافات بھی لے آتے ہیں۔ یہ نفسیاتی تنازعات اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہوتے جب ہم ماضی میں واقعہ کے متعلق سوچتے ہیں۔

تاہم یہ واقعہ خصوصاً نوجوانوں کی نفسیات پر زیادہ اثرات نہیں ڈالتا کیونکہ ایک وقوعہ گزرتے ہی دوسرا اس کی جگہ آجاتا ہے۔ چنانچہ اگر عید کی چھٹیاں پُرلطف نہیں گزریں، تو کوئی بات نہیں، انسان اگلی چھٹیوں سے محظوظ ہوسکتا ہے۔ اگر منزل تک پہنچ کر مراد بر نہیں آئی، تو انسان فوراً دوسری منزل سامنے لے آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر انسان مستقبل میں اس لیے نہیں جھانکتا کہ کسی آمدہ واقعہ سے لطف اندوز ہوسکے، بلکہ وہ صرف حال سے فرار چاہتا ہے۔

ظاہر ہے، ایک حد تک مستقبل میں دیکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ یوں انسان اپنے جوش و جذبے تازہ رکھتا ہے۔ اگر ہمیں علم ہے کہ مستقبل میں خوشگوار لمحات ہمارے منتظر ہیں، تو ان کی بابت سوچنے میں کوئی بُرائی نہیں۔ مسئلہ یہی ہے کہ خصوصاً نئی نسل مستقبل میں جھانکنے کے عمل کو رفتہ رفتہ حال سے فرار کا ذریعہ بنا لیتی ہے۔

اگر ہم حال سے خوش ہوں، دوسرے لفظوں میں ہم ذہنی و جسمانی طور پر خود کو تندرست پائیں، تو کم ہی مستقبل کو دیکھنے کی زحمت کرتے ہیں۔ تب مستقبل ہماری خواہشات کا مرکز نہیں بنتا۔ اگر ہم اپنے آپ سے مطمئن ہیں، تو منفی رویہ اختیار کرکے مستقبل سے فرار نہیں ہوتے۔

فرانس کا بلیز پاسکل (Blaise Pascal) ایک بڑا فلسفی اور سائنس دان گزرا ہے۔ وہ انسانی فطرت کا نباض بھی تھا۔ اس کا کہنا تھا ''انسانوں کی اکثریت حال میں رہنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔'' وہ اپنی آپ بیتی میں مزید لکھتا ہے:

> ”ہم اتنے احمق ہیں کہ عموماً اس زمانہ میں رہتے بستے ہیں جو ہم سے تعلق نہیں رکھتا جبکہ ہم جس دور میں زندہ ہیں، اس کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم ایسے زمانے کے خواب دیکھتے ہیں جو وجود ہی نہیں رکھتا اور موجودہ دور کے سلسلے میں اندھے بن جاتے ہیں...... لہٰذا حقیقت میں ہم زندگی نہیں گزارتے بلکہ اُمید کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔“

نئی نسل کے نام اس تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ اگر نوجوان مستقبل میں رہنے کو اپنا معمول بنالیں، تو وہ زندگی ہی سے محروم ہوجاتے ہیں...... کیونکہ حقیقی زندگی صرف حال ہی میں جی جاتی ہے۔ ■

WWW.PAKSOCIETY.COM

دُنیا کا سب سے سستا کمپیوٹر

نیا لیپ ٹاپ جسے جیب میں رکھنا ممکن ہے

تیز رفتار اور پائیدار کمپیوٹر ''آکاش دوم'' صرف ۵/ ہزار روپے میں دستیاب ہوگا

اختر صاحب کا بیٹا امتحان میں پاس ہوا، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اب وہ خیر سے ساتویں جماعت میں گیا تھا۔ ایک دن وہ اُسے نئی جماعت کا نصاب، کاپیاں، بیگ، یونیفارم وغیرہ دلانے بازار لے گئے۔ جب تمام ضروری اشیا خریدی جا چکیں تو یہ جان کر ان کو حیرانی ہوئی کہ ان کے تقریباً ۶/ ہزار روپے خرچ ہو چکے تھے۔ بیٹے نے کمپیوٹر کی فرمائش کی تو یہ جان کر ان کے ہوش اُڑ گئے کہ کمپیوٹر ۳۰ سے ۴۰/ ہزار روپے کے لگ بھگ آرہا ہے اور لیپ ٹاپ ۵۰/ ہزار سے شروع ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ بڑھتی مہنگائی نے کتابوں، کاپیوں اور تعلیم سے متعلقہ سامان کی قیمتیں اچھی خاصی بڑھا دی ہیں۔ چنانچہ اب متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے کئی خاندان اس قابل نہیں کہ اپنے بچوں کو معیاری سکولوں میں تعلیم دلوا سکیں۔ ان سکولوں کی فیسیں جہاں متوسط آمدن والے والدین کے ہوش اڑا دیتی ہیں، وہاں افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت کسی قسم کے ایسے اقدامات نہیں کر رہی کہ کتابیں اور کمپیوٹر سستے ہو سکیں۔

اس سلسلے میں ایک روشن مثال سرحد پار قائم ہو رہی ہے۔ بھارتی حکومت کی بھرپور کوشش ہے کہ ان کی نئی نسل زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ اور جدید دور کی ضروریات سے ہم آہنگ ہو سکے۔ اسی لیے چند سال قبل من موہن سنگھ حکومت نے فیصلہ کیا کہ سستا ٹیبلٹ (Tablet) کمپیوٹر تیار کر طلبہ و طالبات کو سستے داموں فروخت کیا جائے۔

بھارتی حکومت کی ہدایت پر ۲۰۱۱ء میں ایک برطانوی کمپیوٹر کمپنی، ڈیٹاونڈ نے بھارتی نئی نسل کے لیے ''آکاش'' نامی ٹیبلٹ کمپیوٹر ایجاد کر لیا۔ یہ واضح رہے کہ ٹیبلٹ کمپیوٹر ایک قسم کا بڑا موبائل فون ہے۔ تاہم اس کے بیشتر آلات کمپیوٹر سے تعلق رکھتے ہیں۔ گویا اسے ایسا لیپ ٹاپ کہیے جسے جیب میں بھی رکھنا ممکن ہے۔

آکاش اول

آکاش اول ۳۶۶/ میگا ہرٹز پروسیسر، ۲۵۶/ ایم بی ریم، ۷/ انچ بڑی ٹچ اسکرین، ۲/ جی بی کی ہارڈ ڈسک، ۲/ یو ایس بی پورٹ، وائی فائی، جی پی آر ایس، موڈیم اور ۳/ گھنٹوں تک کام دینے والی بیٹری رکھتا ہے۔ اس میں اینڈ رئیڈ (Andriod) آپریٹنگ نظام انسٹال ہوتا ہے۔

آکاش ٹیبلٹ کمپیوٹر کی تیاری میں ۳۵/ فیصد پرزہ جات جنوبی کوریا، ۲۵/ فیصد چین، ۱۶/ فیصد امریکا، ۱۶/ فیصد بھارت اور ۸/ فیصد دیگر ممالک کے استعمال ہوئے۔ جب ڈیٹاونڈ نے یہ کمپیوٹر ایجاد کر لیا، تو حیدر آباد دکن میں واقع ایک بھارتی کمپنی کوار نے اسے تیار کرنا شروع کیا۔

آکاش کی تیاری میں سستا میٹریل استعمال کیا گیا تاکہ قیمت کم سے کم رکھی جا سکے۔ نیز سافٹ ویئر بھی وہ انسٹال کیے گئے جو انٹرنیٹ پر مفت دستیاب ہیں۔ ان اقدامات کے باعث ٹیبلٹ کمپیوٹر پر لاگت کم آئی اور ممکن ہو گیا کہ اُسے سستا رکھا جائے۔ بھارتی حکومت نے یہ کمپیوٹر ۴۹/ ڈالر (۲۳۹۰/ بھارتی، ۴۴۱۰/ پاکستانی روپے) میں خریدا جبکہ اس نے سیکڑوں آکاش کمپیوٹر صرف ۱۷۸۵/ روپے (۳۵/ ڈالر) میں طلبا و طالبات کو فروخت کیے۔

بھارت میں ۲۵/ ہزار کالج اور ۴۰۰/ یونیورسٹیاں ہیں جن میں کروڑوں طلبہ و طالبات زیرِ تعلیم ہیں۔ بھارتی حکومت اگلے ۵/ برس میں ایک کروڑ آکاش کمپیوٹر ان طلبہ میں سستے داموں تقسیم کرنا چاہتی ہے۔ یوں ہر طالب علم کو موقع ملے گا کہ وہ اپنی تعلیم کے سلسلے میں انٹرنیٹ جیسے عظیم ترین ذریعہ معلومات سے مدد لے سکے۔ یوں وہ ترقی کی دوڑ میں دیگر ممالک کے طلبہ و طالبات کے ہم پلہ ہو جائے گا۔

آکاش دوم

اس وقت بھارتی کمپیوٹر کمپنیاں آکاش دوم تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ اس میں ۳۶۶/ کے بجائے ۷۰۰/ میگا ہرٹز یا ایک گیگا ہرٹز پروسیسر لگے گا۔ دراصل ۳۶۶/ میگا ہرٹز پروسیسر آج کی ٹیکنالوجی کے حساب سے بہت سست رفتار ہے۔ چنانچہ آکاش چلتے چلتے جام ہو جاتا یا پھر صحیح کارکردگی نہ دکھاتا۔ بھارتی کمپنیوں کی سعی ہے کہ آکاش دوم کو ۵/ ہزار روپے تک رکھا جائے۔ آکاش کمپیوٹروں کی خصوصیت یہ ہے کہ عوام الناس بھی انھیں خرید سکتے ہیں تاہم انھیں زیادہ قیمت دینی پڑتی ہے۔ چنانچہ آکاش اول سوا تین ہزار روپے میں بھارتی مارکیٹوں میں دستیاب ہے۔ آکاش دوم کی قیمت ۵/ ہزار روپے ہو گی۔

بھارت کی دیوہیکل موبائل و انٹرنیٹ کمپنی، ریلائنس انڈسٹریز لمیٹڈ بھی ایک ایسا سستا ٹیبلٹ کمپیوٹر لانا چاہتی ہے جو تیز رفتار اور پائیدار ہو۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ ساتھ میں سستی انٹرنیٹ سروس بھی مہیا ہو گی۔ ایک طرف بھارت میں سرکاری اور نجی شعبہ، دونوں سنجیدگی سے ایسے اقدامات کر رہے ہیں کہ نوجوان بھارتی نسل کو جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس سازوسامان مقامی طور پر تیار کردہ اور سستا مل سکے۔

جبکہ دوسری طرف پاکستان میں ایپل، ڈیل اور دیگر امریکی و غیر ملکی کمپنیوں کے ٹیبلٹ کمپیوٹر دستیاب ہیں جن کی قیمت ۵۰/ ہزار روپے سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ عام طلبہ و طالبات کی دسترس سے باہر ہیں۔ بے شک پنجاب حکومت نے ۱۰۰/ ہزار ذہین ترین طلبہ و طالبات کو دنیا کا بہترین کمپیوٹر تحفہ میں دیا ہے اور وہ مزید ایک لاکھ کمپیوٹر دینے پر کام کر رہی ہے۔ صوبہ خیبر پختونخواہ کی حکومت نے بھی اس روایت کو آگے بڑھانے کا عندیہ دیا ہے۔

پچھلے ۱۲/ برس میں بھارت ہر میدان میں ترقی کر کے دنیا کی ایک بڑی معاشی طاقت بن چکا ہے جبکہ اس دوران پاکستان قرضوں میں جکڑا گیا یا خودکش حملوں اور بم دھماکوں نے پاکستانیوں کی زندگی اجیرن کر ڈالی۔

کیا پاکستانی حکومت سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بھی کم از کم کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ و طالبات کو سستے داموں مقامی ساختہ ٹیبلٹ کمپیوٹر فراہم کرنے کے کسی پروگرام پر کام کرے۔ بے نظیر انکم سکیم اور اس جیسے پیسے بنانے کے دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ وفاقی حکومت کو کوئی پائیدار پالیسی بھی بنانا چاہیے۔ پنجاب حکومت نے ذہین و ہونہار طالب علموں میں لیپ ٹاپ مفت تقسیم کر کے یقیناً ایک احسن قدم اٹھایا لیکن یہ لیپ ٹاپ اگر پاکستانی ساختہ ہوتے، جیسا کہ بھارتیوں نے کیا، تو خوشی دوبالا ہو جاتی مگر اس کے لیے اپنی کمپیوٹر انڈسٹری ہونا ضروری ہے جہاں مرمت نہیں مینوفیکچرنگ ہو۔ ■

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

ایک حیرت انگیز مخلوق

یہ اپنے اردگرد کی مخلوق کو ان کے جسمانی درجہ حرارت کے مطابق مختلف رنگوں میں دیکھتے ہیں

اللہ تعالیٰ اپنی عظمت اور قوت کے ثبوت کے طور پر بلا امتیاز تمام جانوروں کی مثالیں دیتے ہیں چاہیے وہ اونٹ جیسے بڑے جانور کی ہو یا شہد کی مکھی جیسے چھوٹے جانور کی کیونکہ یہ تمام ایک نہایت اہم مقصد سرانجام دیتی ہیں۔
(بقرہ/۲۶)

''یقیناً اللہ کسی مثال کے بیان کرنے سے نہیں شرماتا، خواہ مچھر کی ہو، یا اس سے بھی ہلکی چیز کی۔ ایمان والے تو اسے اپنے رب کی جانب سے صحیح سمجھتے ہیں اور کفار کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ نے کیا مراد لی؟ اس کے ذریعے بیشتر کو گمراہ کرتا ہے اور اکثر لوگوں کو راہ راست پر لاتا ہے اور گمراہ تو صرف فاسقوں کو ہی کرتا ہے۔'' (البقرہ ۲۶)

عام عقیدے کے برخلاف، مچھر جن سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے یقیناً ایک پیچیدہ مخلوق ہیں۔ یہ اپنے اردگرد کی مخلوق کو ان کے جسمانی درجہ حرارت کے مطابق مختلف رنگوں میں دیکھتے ہیں چونکہ ان کی درجہ حرارت کی حس دن کی روشنی کی محتاج نہیں، وہ اندھیرے کمرے میں خون کی باریک نسوں کو بھی گہرا سرخ دیکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مچھروں کو اپنا غذائی منبع تلاش کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ مچھر کے یہ حسی اعضاء (Receptiors) درجہ حرارت میں کمی بیشی حتیٰ کہ ایک درجے کا چھوٹا سا حصہ بھی پہچان لیتے ہیں۔

عالم طبعی کے وجود کا اصل مقصد اللہ کی کمال تخلیق اور دانائی کا ٹھوس ثبوت ہے۔ اس کو سمجھنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہر چیز کا مخلصانہ تجزیہ دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والے ذہن سے کیا جائے۔ اس طرح مفصل اور شاندار نظام جو کائنات میں موجود ہے، اس کا بہتر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

''جس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے (تو اے دیکھنے والے) اللہ رحمٰن کی پیدائش میں کوئی بے ضابطگی دیکھے گا، دوبارہ نظریں ڈال کر دیکھ لے کیا کوئی شگاف نظر آ رہا ہے؟ پھر دوہرا کر دو دو بار دیکھ لے تیری نگاہ تیز طرف ذلیل عاجز ہو کر تھکی ہوئی لوٹ آئے گی۔'' (الملک ۳،۴)

''کیا انھوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی جو ان کے دل ان باتوں کے سمجھنے والے ہوتے یا کانوں سے ہی ان (واقعات) کو سن لیتے، بات یہ ہے کہ صرف آنکھیں ہی اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔'' (الحج/۴۶)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی ہر چیز کو تمھارے کام میں لگا رکھا ہے اور تمھیں اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں بھرپور دے رکھی ہیں، بعض لوگ اللہ کے بارے میں بغیر علم کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں۔'' (لقمان ۲۰)

''کہہ دیجیے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو تو سہی کس طرح اللہ تعالیٰ نے ابتداء پیدائش کی پھر اللہ تعالیٰ ہی دوبارہ نئی پیدائش کرے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔'' (العنکبوت/۲۰)

''اور ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو ناحق پیدا نہیں کیا، یہ گمان تو کافروں کا ہے سو کافروں کے لیے خرابی ہے آگ کی۔'' (ص/۲۷)

''اور آسمان و زمین کی ہر ہر چیز کو بھی اس نے اپنی طرف سے تمہارے تابع کر دیا ہے۔ جو غور کریں یقیناً وہ اس میں بہت سی نشانیاں پالیں گے۔'' (الجاثیہ/۱۳)

TED

Ideas Worth Spreading

جہاں سائنس، ٹیکنالوجی اور بزنس کے شعبوں کے نامور مفکرین کو اپنی زندگی کا یادگار خطاب کرنے کا چیلنج دیا جاتا ہے

اس فورم پر ہر سال
ایک انقلابی آئیڈیا
ایک ملین ڈالر جیتتا ہے

دُنیا کو بہتر بنانے کے لیے

انقلابی خیالات

یہی ہے ٹیڈ کا تعارف

عاطف مرزا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک

خواب جو آپ اکیلے دیکھتے ہیں صرف خواب ہی رہتا ہے اور وہ خواب جو آپ دوسروں کے ساتھ مل کر دیکھتے ہیں حقیقت بن جاتا ہے۔ غیر منافع بخش ادارہ ٹیڈ (TED) دنیا کی بہتری کے لیے اسی سوچ کو فروغ دے رہا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں جب ایک کانفرنس کے طور پر اس کا آغاز ہوا تو اس کا مقصد ٹیکنالوجی، تفریح اور ڈیزائن سے وابستہ لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنا تھا۔ آج اس کے دائرہ کار میں وسعت آچکی ہے اور اس کے فورم پر بزنس، سائنس اور عالمی مسائل کے حوالے سے بھی بات ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ اہتمام سال میں ۲/ بار کانفرنس ہوتی ہے جن میں دنیا کے ممتاز سکالرز اور مفکّرین کو خطاب کی دعوت دی جاتی ہے۔ ہر مفکّر کے سامنے اپنی زندگی کا یادگار خطاب کرنے کا چیلنج رکھا جاتا ہے جسے اس نے ۱۸/منٹ میں پورا کرنا ہوتا ہے۔

ادارے کا مشن اس یقین کا اظہار ہے کہ خیالات اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ رویوں، زندگیوں اور آخرکار دنیا کو بدل دیں۔ یہ ایک ایسا کلیئرنگ ہاؤس (Clearinghouse) بن رہا ہے جہاں دنیا کے بہترین مفکّرین اپنا علم آگے پھیلائیں گے۔ لوگوں کا ایک ایسا گروہ سامنے آئے گا جو اس علم اور تصورات سے جڑنے کے ساتھ ساتھ آپس میں بھی جڑیں گے۔

اس فورم سے آپ کو سائنس، ٹیکنالوجی، بزنس اور دیگر شعبوں کے ماہرین کے دلچسپ اور انقلابی خیالات سننے کا موقع ملتا ہے۔ کوئی مفکّر کائنات کے اسرار سے پردہ اٹھا رہا ہوگا تو کوئی رہنما لیڈرشپ کے موضوع پر گفتگو کر رہا ہوگا۔ اسی طرح نظامِ تعلیم کو جدید تقاضوں کے مطابق کیسے بدلا جائے؟ اس فورم پر اس حوالے سے بھی انقلابی خیالات سنے جا سکتے ہیں۔ عالمی امن کے لیے کیا اقدام ناگزیر ہیں؟ ماحول کو تباہی سے کیسے بچایا جائے؟ سمندر کے اندر پائی جانے والی مخلوقات کی دنیا کتنی حیرت انگیز ہے؟ اگلے چند سالوں میں سرطان کے مرض پر کس حد تک قابو پایا جا سکے گا؟ کیا ہم سپرمین کی طرح مصنوعی پیروں کے ذریعے دیواروں پر چڑھ سکیں گے؟ روبوٹ کب انسانی چہرے جیسے جذبات کا اظہار کر سکیں گے؟ روبوٹ پرندوں کی طرح کب اُڑ سکیں گے؟ ان جیسے بے شمار امکانات اور سوالوں کے جواب اس فورم سے آپ کو مل سکتے ہیں۔ یہ زبردست تصورات ہماری توجہ، لامحدود انسانی پوٹینشل، مل کر منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش اور تخلیق اور جدت پسندی کی سوچ کی طرف دلاتے ہیں۔

اس فورم پر نوبل انعام حاصل کرنے والی کئی شخصیات اپنے خیالات کا اظہار کر چکی ہیں۔ ان میں معاشیات میں نوبل انعام حاصل کرنے والے ڈینیل کاہنمان (Daniel Kahnman) اور میڈیسن میں انعام حاصل کرنے والے جیمز واٹسن شامل ہیں۔

موسم بہار میں ہونے والی کانفرنس (Springtime) میں ایک ہزار سے زائد لوگ شریک ہوتے ہیں۔ ہر دن میں ۵۰/مقررین خطاب کرتے اور ہر مقرر کو اس کے لیے ۱۸/منٹ دیے جاتے ہیں۔

فرانسیسی شاعر اور ناول نگار وکٹر ہیوگو کا کہنا تھا

وہ خیال جس کا وقت آچکا ہو دنیا کی تمام افواج سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ اس فورم کا مقصد بھی ایسے ہی خیالات کی تلاش ہے

ٹیڈ گلوبل ہر سال موسمِ گرما میں سکاٹ لینڈ میں ہوتی ہے۔ اس میں عالمی نوعیت کے مسائل پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ ٹیڈ اب اس سالانہ کانفرنس کی سطح سے آگے نکل چکی اور کئی شاندار منصوبوں سے منسلک ہے۔

ٹیڈ کے دیگر منصوبوں میں ویڈیو ویب سائٹ، ٹیڈ ٹاکس (TEDtalks)، ٹیڈ ایکس (TEDX) اور سالانہ ٹیڈ پرائز شامل ہیں۔

ویڈیو ویب سائٹ کا منصوبہ ٹیڈ ٹاکس سب سے مقبول ہے۔ اس میں مفکّرین کے خیالات ویڈیو لیکچر کی شکل میں آن لائن ساری دنیا کے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ٹیڈ ڈاٹ کام پر ٹیڈ ٹاکس اور دیگر ویڈیوز مفت مہیا کی جاتی ہیں۔ اس وقت اس ویب سائیٹ پر ۹۰۰/ سے زائد ٹاکس موجود ہیں اور ہر ہفتہ ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انھیں ۵۰۰/ملین سے زائد بار دیکھا جا چکا جبکہ دیکھنے والوں کی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

ادارہ اپنی ویڈیوز کا دوسری زبانوں میں تراجم کا اہتمام بھی کر رہا ہے۔ اس کے لیے دنیا کے مختلف ممالک کے رضاکاروں کی صلاحیتوں سے فائدہ بھی اٹھایا جاتا ہے۔ اب تک ۲۱/ہزار ترجمے ہو چکے ہیں۔

یہ ادارہ ہر سال ایک شخص کو ایک لاکھ ڈالر کا انعام دیتا ہے۔ انعام یافتہ شخص اس رقم سے اپنی ایک ایسی خواہش پوری کرتا ہے جس سے دنیا میں کوئی بہتر تبدیلی آ سکتی ہو۔ اس سلسلے کی وجہ سے کئی اچھے منصوبے شروع کیے گئے ہیں۔ اس انعام کی رقم بڑھا کر ایک ملین ڈالر کر دی گئی ہے۔ موسیقار (Musician) اور سماجی کارکن بونو

چند خیالات ٹیڈ (TED) فورم سے

''اگر آپ لوگوں کو اپنے پاس اس لیے رکھیں گے کہ وہ آپ کے ادارے میں ملازمت کر سکیں تو وہ دراصل آپ کے پیسے کے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں لیکن اگر آپ ایسے لوگوں کو اپنے پاس رکھیں جو ان اقدار اور مقاصد پر یقین رکھتے ہیں جن پر آپ کا یقین ہے تو لوگ آپ کے لیے کام کرتے ہیں ان کی محنت، پسینہ اور آنسو بھی آپ کے لیے ہوتے ہیں۔''
(لیڈرشپ ماہر اور مصنف سیمن سینک (Simon Sinek)

''اگر آپ ناکام ہونے سے خوفزدہ رہیں گے تو آپ کوئی اوریجنل چیز نہیں حاصل کر سکیں گے۔''
(مصنف اور ماہر تعلیم کن رونبسن (Ken Robinson)

''خود اپنی ذات کو سمجھنا اور اس کے بارے میں جاننا اور خود کو بہتر بنانے کی کوشش میں رہنا اچھی تعلیم کی یکی خوبیاں ہیں۔''
(کمپیوٹر سائنس پروفیسر اور ماہر تعلیم شمن شاکن (Shimon Schoken)

''اپنے دل میں جھانکیے جو چیز آپ اپنے لیے تکلیف دہ سمجھتے ہیں کسی دوسرے کو بھی کسی صورت وہ چیز نہ دیں۔''
(مصنف کیرن آرم سٹرانگ (Karen Armstrong)

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

عام لوگوں کی طاقت

اوپن سورس سافٹ ویئر، بلاگز، موسیقی شیئر کرنے کے نیٹ ورکس اور انٹرنیٹ سے مفت کال کی سہولت، یہ ترقی کئی بڑی صنعتوں کو نقصان پہنچا رہی اور بزنس، سیاست اور کلچر کی دنیا کو نئی ترتیب دے رہی ہے۔ ان سب کے پیچھے عام لوگوں کی رائے دینے اور اپنی بات پہنچانے کی طاقت کارفرما ہے۔

(نیوز ویک)

(Bono) نے ۲۰۰۵ء میں یہ انعام حاصل کیا۔ وہ دنیا اور خصوصاً افریقہ میں سماجی ناانصافی، بھوک، غربت اور بیماری کے خاتمے کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ ڈاکٹر لیری بریلینٹ (Larry Brilliant) نے ۲۰۰۶ء میں چیچک (Smallpox) کو ختم کرنے کے حوالے سے اپنے کام کے لیے ٹیڈ انعام حاصل کیا۔ سائنس اور تعلیم عام کرنے کے لیے سرگرم نیل توراک (Neil Turok) نے فزکس میں اپنے کام اور جنوبی افریقہ میں ریاضی (Mathermatics) کے لیے تعلیمی ادارہ قائم کرنے پر ۲۰۰۸ء میں ٹیڈ انعام حاصل کیا۔

فرانسیسی آرٹسٹ جے آر نے ۲۰۱۱ء میں یہ انعام حاصل کیا۔ وہ دنیا میں مثبت تبدیلی کے لیے اپنے آرٹ کو استعمال کر رہا ہے۔ جل ٹارٹر (Jill Tarter) اپنی انعامی رقم کے ذریعے کائنات کے دوسرے سیاروں میں زندگی کی تلاش کے لیے اپنی کوشش تیز کرنا چاہتی تھی۔

انعام حاصل کرنے والوں کو دوسرے اداروں کی طرف سے مالی امداد اور تعاون بھی ملنے لگتا ہے۔

ٹیڈ ایکس پروگرام کے ذریعے ادارے اور افراد کو موقع دیا جاتا ہے کہ ٹیڈ جیسا کوئی Event منعقد کر سکیں۔ ٹیڈ ایجوکیشن ایک اور دلچسپ منصوبہ ہے۔ صارفین اس ویب سائٹ پر موجود تعلیمی ویڈیوز کو دوسرے لوگوں تک علم پھیلانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

آج ٹیکنالوجی ہماری زندگیوں کو تیزی سے بدل رہی ہے۔ عام لوگوں کی ٹیکنالوجی تک رسائی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ماس میڈیا (Mass Media) ٹی وی، فلم اور اخبارات میں ابلاغ یک طرفہ ہوتا تھا لیکن آج ابلاغ کا سفر ریڈیو، اخبارات، میگزین، سینما، تھیٹر، پوسٹر، ٹی وی، ٹیپ، سیٹلائیٹ، سی ڈی (CD) واک مین، ویڈیو گیمز، کمپیوٹر، موبائل فون سے ہوتا ہوا انٹرنیٹ اور سمارٹ فون تک پہنچ چکا ہے۔ سوشل میڈیا نے شیئرنگ کا نیا کلچر پیدا کر دیا ہے۔

اب ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت عام لوگ کم وسائل کے ساتھ اپنی بات اپنے خیال کو دوسرے لوگوں تک آسانی سے پہنچا رہے ہیں۔ اسی طرح ان کی انتخاب کرنے اور اپنی رائے دینے کی آزادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ٹیکنالوجی کی بڑھتی ہوئی طاقت کے ذریعے علم کی ترویج آسان بنانا ممکن ہے

انٹرنیٹ اکثر ایسے پلیٹ فارم مہیا

بھی تبدیل ہو جاتا ہے جہاں لوگ اکٹھے ہوتے، ایک دوسرے کی بات سنتے اور مثبت تبدیلی کے لیے ممکنہ لائحہ عمل کے حوالے سے سوچتے ہیں۔

بلاگ سوشل نیٹ ورکنگ کی ایک قسم ہے۔ اس کے ذریعے نان ٹیکنیکل افراد انٹرنیٹ پر اپنی مرضی کا کچھ مواد انٹرنیٹ پر پوسٹ کر سکتے ہیں۔ آج دنیا میں ۱۵۶ ملین بلاگز پائے جاتے ہیں۔ اس میں لکھنے والوں اور فلاحی کام کرنے والوں کے لیے بے شمار امکانات ہیں۔ ہر روز ۱۴۰ ہزار بلاگز کا اضافہ ہو رہا ہے۔

پوڈ کاسٹ کے ذریعے صارفین انٹرنیٹ کے ایسے ویڈیو مواد سے مستفید ہوتے ہیں جسے باقاعدگی سے اپ ڈیٹ (Update) کیا جا رہا ہو۔ اس وقت پوڈ کاسٹ کے صارفین تقریباً ۲۰ ملین ہیں۔ دنیا کو رہنے کے لیے بہتر جگہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ٹیکنالوجی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو علم کی ترویج کے لیے استعمال کیا جائے۔

ٹیڈ ایکس پروگرام کے ذریعے کئی ممالک میں لوگ اس فورم جیسے کئی تقریبات (Events) منعقد کر رہے ہیں۔ اب تک دُنیا کے ۱۳۰ ممالک کے ۱۲۰۰ شہروں میں ایسی تقریبات منعقد ہو چکی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اس فورم کی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے سماجی تبدیلی کے لیے کافی کام کیا جا سکتا ہے اور ٹیکنالوجی کی بدولت عام لوگوں کو بھی اِس میں شریک کیا جا سکتا ہے۔

یہ ادارہ تیزی سے ایک ایسی عالمی کمیونٹی بنتا جا رہا ہے جہاں ہر شعبے اور کلچر سے ایسے لوگ شامل ہوں گے جو دنیا کو بہتر، خوشحال اور پُرامن جگہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ سوچنے والے پُرعزم لوگوں کا چھوٹا سا گروہ پوری دُنیا کو بدل سکتا ہے اور درحقیقت دُنیا میں ہر اچھی تبدیلی ایسے ہی آئی ہے۔ ■

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

[سپیشل]

کرۂ ارض پر سب سے دولت مند پاکستانی نژاد امریکی

حیران کن تفصیلات

بے مثال محنت سے ایک نئی پہچان پانے والے لاہوری نوجوان

شاھد خان

جو دُنیا میں کاروں کے بہترین بے جوڑ بمپر بناتے بناتے اپنی ہم عصر کمپنیوں کو پچھاڑ گیا
کاروں کے پرزے بنانے والی دیوالیہ کمپنی سے فٹ بال کی بہترین ٹیم جیگوار
کی خریداری کا حیران کن سفر

شہزاد حسین علوی

چند ماہ قبل ایک امریکی صحافی شاہد خان سے انٹرویو لینے گیا۔ شاہد خان کو ڈینویل شہر میں کچھ کام تھا، لہٰذا وہ اسے بھی ساتھ لے گئے۔ جب دونوں کار میں بیٹھے ڈینویل کے صنعتی علاقے سے گزرے، تو شاہد خان امریکی صنعت کے زوال پر گفتگو کرنے لگے۔ وہ ایک پرانی عمارت کی سمت اشارہ کرکے بولے ''وہاں ایوتھ۔ پروٹی پلانٹ واقع تھا جو بند ہو چکا۔ یوں ۱۴۰۰ ر افراد بیروزگار ہوئے۔''

شاہد خان پھر بتاتے چلے گئے کہ اس کارخانہ میں ۲ ر ہزار مزدور تھے، وہ بھی بند ہوا۔ فلاں وئیر ہاؤس کی بندش سے ایک ہزار کارکن اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ غرض ڈینویل صنعتی علاقہ لٹے پٹے کارخانوں اور اداروں کا قبرستان بن چکا تھا۔ یہ صنعتی علاقہ کبھی بھرا پُرا اور زندگی سے بھرپور تھا، لیکن اب وہاں اُلّو بولتے تھے۔

لمبے قد، بھاری ڈیل ڈول اور تلوار مارکہ مونچھوں والے شاہد خان پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ اب یہ ۶۲ ر سالہ صنعت کار شاندار گاڑی چلا رہا تھا جو ہر قسم کی سہولیات رکھتی تھی۔ اندر کا ماحول باہر والے ویرانی اور بربادی کے مناظر سے یکسر مختلف تھا۔ شاہد خان کی داستان حیات مایوس لوگوں کے لیے اُمید اور خوشیوں کا انمول پیغام بھی رکھتی ہے۔

۴۰ ر سال پیشتر جب ڈینول اور ریاست الینوائے کے دیگر شہروں میں صنعتی زوال جڑ پکڑ چکا تھا، اسی وقت شاہد خان کے ترقی و خوشحالی والے سفر کا آغاز ہوا۔ اگرچہ یہ سفر صعوبتوں اور رکاوٹوں سے پُر تھا۔ تاہم نوجوان شاہد خان نے محنت، مستقل مزاجی اور ذہانت کے بل بوتے پر تمام مشکلات کا مقابلہ کیا اور آخرکار کامیاب ٹھہرے۔

شاہد خان گاڑیوں کے فاضل پرزہ جات بنانے والی ایک بڑی امریکی کمپنی، فلیکس این گیٹ کے مالک ہیں۔ جب شاہد خان نے یہ کمپنی خریدی، تو وہ دیوالیہ ہو چکی تھی۔ شاہد خان نے نئے سرے سے اُسے کھڑا کیا اور آج یہ کمپنی شمالی امریکا میں فاضل پرزہ جات بنانے والی بڑی کمپنیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے ''۵۲ ر کارخانے'' پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں ''۱۳ ر ہزار'' لوگ کام کرتے ہیں۔

۲۰۱۱ء میں فلیکس این گیٹ نے ۳ ر ارب ۴۰ ر کروڑ ڈالر (۳۲۶ ر ارب ۴۰ ر کروڑ روپے) کا مال فروخت کیا۔ امرا کی جائیدادوں کا حساب لگانے والے مشہور امریکی رسالہ، فوربس (Forbes) کے مطابق آج شاہد خان ۲.۵ ر ارب ڈالر (۲۴۰ ر ارب روپے) کی جائیداد رکھتے ہیں۔ گویا شاہد خان امریکی ارب پتیوں میں شامل ہو چکے۔ جبکہ ہمارے حساب سے انھیں امیر ترین پاکستانی ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔

شاہد خان کی داستان جدوجہد بے مثال کامیابیوں سے عبارت ہے۔ وہ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا نہیں ہوئے بلکہ ان کا تعلق پاکستانی متوسط طبقے سے ہے۔ والد نے عمر بھر کی جمع پونجی خرچ کرکے ہونہار بیٹے کو امریکا بھجوایا تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے۔ بیٹے نے تعلیم مکمل کی، تو پھر امریکا ہی میں بس گیا اور وقت نے ثابت کیا کہ شاہد خان کا فیصلہ درست تھا۔

پچھلے ڈیڑھ دو سو برس میں امریکا میں لاکھوں خاندان اچھے مستقبل کی تلاش میں پہنچے۔ وہ بُرے حال میں تھے

اپنے شعبے کے نمبر ایک کو چت کرنے کی ضرورت نہیں بس اپنے سے اگلے کو پیچھے چھوڑنے کا سوچیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیکن ان کے ارکان نے اپنی محنت اور ذہانت سے نئی دنیا بسائی اور دولت، عزت و شہرت پائی۔ امریکا بھر میں کامیابی کی یہ بکھری ہوئی شاندار مثالیں عیاں کرتی ہیں کہ ہنرمند اور محنتی مہاجر ملازمتیں لیتے نہیں بلکہ پیدا کرتے ہیں اور اس دلیل کی ایک بڑی مثال شاہد خان ہیں۔

شاہد خان کی کامیابیوں کا سفر ابھی جاری ہے۔ جنوری ۲۰۱۲ء میں انھوں نے امریکی فٹ بال کے سب سے بڑے ٹورنامنٹ نیشنل فٹ بال لیگ (NFL) میں شامل ٹیم، "جیگوارز" ۷۶۰/ملین ڈالر (تقریباً ساڑھے سات ارب روپے) میں خریدی۔ یوں انھیں یہ منفرد اعزاز حاصل ہوا کہ وہ کسی بھی اقلیتی نسل سے تعلق رکھنے والے پہلے فرد بن گئے جو این ایف ایل میں کسی ٹیم کے مالک ہیں۔

امریکی عوام نیشنل فٹ بال لیگ کے دیوانے ہیں۔ جب اس چیمپین شپ کے مقابلے ہوں، تو وہ سبھی کام چھوڑ کر انھیں دیکھتے ہیں۔ مقابلوں کا فائنل ""سپر باؤل سنڈے" کہلاتا ہے۔ یہ ایک مخصوص امریکی چیمپین شپ ہے، لیکن یہ امریکا کی آزادی و کھلے پن کا اعجاز ہے کہ ایک پاکستانی بھی اس دنیا میں داخل ہوگیا۔

تاہم شاہد خان کے نزدیک یہ سودا ان کی کاروباری صلاحیتوں کا امتحان بھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ این ایل ایف میں جیگوارز ہی سب سے کمزور ٹیم ہے۔ ایک جائزے میں صرف ۴ء۰/فیصد لوگوں نے جیگوارز کو اپنی پسندیدہ ٹیم قرار دیا۔ یوں وہ کل ۳۲/ٹیموں میں سے آخری نمبر پر آئی۔

مزید برآں جیگوارز کی مارکیٹ بھی زیادہ بڑی نہیں۔ صرف جیکسن ویل شہر کا میٹروپولیٹین علاقہ اس کا گڑھ ہے۔ اس علاقہ کی آبادی تقریباً ۱۵/لاکھ ہے۔ ٹیم کی بدقسمتی کہ ۲۰۰۷ء سے اس نے کوئی میچ نہیں جیتا اور نہ ہی وہ کبھی فائنل میں پہنچی ہے۔ ان خامیوں کے باوجود شاہد خان پُرامید ہیں کہ ان کا منصوبہ ٹیم کو نئی بلندیوں اور کامرانیوں تک لے جائے گا۔

لاہور سے الینوائے تک

شاہد خان ۱۹۵۰ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کیا، تو انھیں الینوائے یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ جب وہ نئے دیس میں پہنچے تو ان کی جیب میں صرف ۵۰۰/ڈالر تھے۔ والد ٹھیکے داری کرتے تھے اور انھوں نے بڑی مشکل سے یہ رقم جمع کر کے بیٹے کو دی تھی۔

جب شاہد یونیورسٹی پہنچے تو ہوسٹل بند تھا، لہٰذا انھوں نے مقامی وائی ایم سی اے میں قیام کیا۔ وہاں رات کا کھانا اور کرایہ کمرا ۳۱/ڈالر میں پڑا۔ جب شاہد نے یہ رقم پاکستانی کرنسی میں تقسیم کی تو اُن کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر اخراجات کی رفتار یہی رہی، تو ۵۰۰/ڈالر ختم ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔

لیکن اگلے دن باورچی خانے میں انھیں پہلے امریکی کرشمہ کا سامنا ہوا۔ انھیں ایک ساتھی سے یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ ایک گھنٹہ برتن دھو کر ڈیڑھ ڈالر کما سکتے تھے۔ گویا وہ چند گھنٹے برتن دھونے سے خرچ کی گئی رقم پالیتے۔ وہ بتاتے ہیں "یہ جان کر مجھے آکسیجن مل گئی۔"

شاہد خان پھر دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ان کا شمار یونیورسٹی کے قابل اور ہونہار طلبہ میں ہوا۔ دوران تعلیم ہی ان کی ملاقات ایک مہذب اور خوبرو دوشیزہ، این کالرن خان سے ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے۔ محبت نے جلد ہی انھیں شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔ آج وہ دو نوجوان بیٹوں، شنا اور ٹونی کے فخرمند والدین ہیں۔

۲۱/ویں سالگرہ سے ایک ماہ قبل شاہد خان نے صنعتی انجینئرنگ میں گریجوایشن کرلی۔ چونکہ ان کے علم کا چرچا تھا

امریکا مواقعوں کی جنت ہے مگر سخت محنت کرنے والوں کے لیے اگر تھوڑی سی خوش قسمتی بھی ساتھ ہو تو کرشمہ ضرور جنم لیتا ہے

لہٰذا گاڑیوں کے سپیئر پارٹس بنانے والی مقامی کمپنی، فلیکس این گیٹ میں بحیثیت انجینئرنگ مینیجر ملازمت مل گئی۔

اس وقت کمپنی کے انجینئر تقریباً ۱۵/ٹکڑے ویلڈ کر کے گاڑیوں کے بمپر بناتے تھے۔ یہ بمپر دیرپا ثابت نہ ہوتے اور جلد ٹوٹ جاتے۔ شاہد خان نے ٹکڑوں کی تعداد کم کر دی لیکن محنت کا انھیں کوئی خاص صلہ نہ ملا۔ بہرحال وہ ۷/سال تک کمپنی سے وابستہ رہے۔ اس دوران انھیں گاڑیوں کے فاضل پرزہ جات بنانے کا خاصا تجربہ حاصل ہوگیا۔

۱۹۷۸ء میں شاہد خان نے فلیکس این گیٹ سے علیحدہ ہو کر اپنی کمپنی، بمپرورکس کی بنیاد رکھی۔ اسے قائم کرنے کی خاطر وہ اپنی جمع پونجی، ۱۶/ہزار ڈالر اور بینک قرضہ ۵۰/ہزار ڈالر بروئے کار لائے۔ یہ چھوٹی سی کمپنی تھی لیکن اس نے ایک کار نمایاں کر دکھایا...... یہ کہ سٹیل کے ایک ہی ٹکڑے سے گاڑیوں کا بمپر بنانے میں کامیاب رہے۔ اب ایندھن بچانے کے لیے ایسے ہی بمپر ضروری تھے لہٰذا بہت جلد بمپرورکس کو گاہک مل گئے۔ ان میں جنرل موٹرز جیسا بڑا ادارہ بھی شامل تھا۔

شاہد خان اپنی بیوی این کالرن کے ساتھ

کامیابی کی وجہ کام کے بارے میں ہوشیاری سے سوچ بچار کرنا ہے۔ شاہد خان کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے بہت چھوٹی سطح پر کام کیا اور کسی بھی چھوٹی کمپنی کی بقاء کے لیے ضروری ہے کہ اسے تسلسل کے ساتھ منافع ہوتا رہے چاہے یہ کم ہی ہو۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ۱۹۷۸ء میں اپنی کمپنی کے آغاز سے لے کر آج تک انہیں کبھی بھی نقصان نہیں ہوا اور مالی طور پر وہ ہمیشہ منافع میں رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس وقت ان کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بمپرز کی ۶۷/فیصد مارکیٹ پر ان کی کمپنی کی اجارہ داری ہے جبکہ کروم پلیٹنگ میں ان کی کمپنی نے غیر معمولی ترقی کی۔ مارکیٹ میں بدلتے ہوئے رجحانات کا مقابلہ کرنے کے لیے کمپنی نے اپنی مصنوعات میں تنوع کی طرف قدم بڑھایا اور پلاسٹک کے ساتھ ساتھ گاڑیوں میں استعمال ہونے والے دیگر پارٹس کی بھی تیاری شروع کردی۔ تاہم کمپنی نے اپنی اصل مہارت یعنی بمپر سازی اور کروم پلیٹنگ کے میدان میں کسی قسم کی غفلت کا مظاہرہ نہ کیا۔ شاہد خان کا کہنا ہے کہ ان کی پروڈکٹس کی ڈیزائننگ اور کوالٹی میں اس تیزی سے تبدیلیاں آتی ہیں کہ انہیں کبھی اپنی مصنوعات کو پیٹنٹ کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ کہتے ہیں "جتنی دیر میں کوئی پیٹنٹ منظور ہوتا ہے، اتنی دیر میں ہمارا نیا ڈیزائن آجاتا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

آپ کو کاروبار میں مکمل طور پر مصروف ہونا پڑتا ہے اور اس کے لیے درست ترین لوگوں کا انتخاب ضروری ہے۔ آٹو مارکیٹ میں جو چیز آپ کو کامیاب بناتی ہے، وہ درست لوگوں کا انتخاب اور گاہک کی آواز پر کان دھرنا ہوتا ہے۔ ہم اس وقت جو کچھ بھی کر رہے ہیں، اس کا فائدہ ہمارے گاہکوں کو ہی ہو رہا ہے جو ہمارے پرستار بن چکے اور ہماری صلاحیت اور کارکردگی کی قدر کرتے ہیں۔ آپ کو سب سے پہلے میدان میں فتح حاصل کرنا ہوتی ہے۔ یہ بہت اہم ہے۔ فتح بہت سے مسئلے حل کر دیتی ہے۔"

تاہم شاہد صاحب کو جلد ہی گمبھیر مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ فلیکس این گیٹ نے تجارتی راز چرانے کے الزام میں ان پر مقدمہ کھڑا کر دیا۔ یہ سراسر بدنیتی پر مبنی تھا۔ کمپنی مالکان کو یقین تھا کہ اچھا وکیل نہ کرنے کے باعث شاہد خان مقدمہ ہار جائیں گے لیکن شاہد خان صاحب نے خود کمر کس لی۔ رقم کی شدید کمی تھی لہٰذا عدالتی معاملات نمٹانے کے لیے انھوں نے سستا ترین وکیل کیا اور بمپر ورکس کا دفاع خود کرنے لگے۔ وہ صبح اپنا کاروبار دیکھتے اور رات کو چند گھنٹے اپنی مادرِ علمی کی لائبریری میں گزارتے جہاں قانونی کتب ان کے زیرِ مطالعہ رہتیں۔

مقدمہ ۲ برس چلا۔ شاہد ہر مرحلہ جیتتے چلے گئے لیکن ان کے سر سے خطرہ نہ ٹلا۔ انھیں یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں مخالفین مقدمہ نہ جیت جائیں۔ یہ خطرہ ٹالنے کی خاطر ۱۹۸۰ء میں شاہد خان نے اِدھر اُدھر سے رقم پکڑی اور فلیکس این گیٹ خرید لی۔ تب کمپنی ہر ماہ ۵۰ ہزار ڈالر خسارہ میں جا رہی تھی۔

شاہد صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ کمپنی کو منافع بخش بنا کر رہیں گے۔ چنانچہ وہ اپنے ادارے کے فاضل پرزہ جات میں نہ صرف جدتیں لائے بلکہ انھیں زیادہ سے زیادہ پائیدار بھی بنایا۔ اعلیٰ معیار کے باعث گاڑیاں بنانے والے تمام بڑے امریکی ادارے اپنی مصنوعات میں شاہد خان کی کمپنیوں کے تیار کردہ بمپر اور فاضل پرزہ جات ہی استعمال کرنے لگے۔ ان میں جنرل موٹرز، ٹویوٹا اور مزدا نمایاں ہیں۔

کاروبار بڑھانے کے سلسلہ میں شاہد خان کا قول ہے "آپ کو اپنے شعبہ میں نمبر ایک کو چت کرنے کی ضرورت نہیں، بس اپنے سے اگلے کو پیچھے چھوڑنے کی سوچیے۔ یوں کبھی نہ کبھی آپ بھی نمبر ایک ہو سکتے ہیں۔"

آج امریکا میں ہر سال فروخت ہونے والی ۵۰ سے ۶۰ فیصد گاڑیوں میں شاہد خان کی کمپنیوں کے بنائے ہوئے سپیئر پارٹس ہی لگتے ہیں۔

جیگوارز کی خریداری

شاہد خان کو امریکی فٹ بال کھیل بہت پسند ہے۔ جب دولت آئی، تو ان میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ این ایف ایل کی کسی ٹیم کے مالک بنیں۔ ۲۰۱۰ء میں انھوں نے چیمپئن شپ کی ایک ٹیم، ریمز (Rams) خریدنی چاہی، لیکن اس کے سفید فام مالکوں نے تعصب کی وجہ سے ان کی بولی مسترد کر دی۔

اکتوبر ۲۰۱۱ء میں پھر جیگوارز کی فروخت کا معاملہ اٹھا۔ اس بار شاہد خان نے بچتے دانش مندی سے کھیلے اور کامیابی پائی۔ اب وہ اپنی فٹ بال ٹیم کو بڑی ٹیموں میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ۳۰ سالہ بیٹا ٹونی ان کا مددگار ہے۔

شاہد خان کو علم ہے کہ جیگوارز کو بہترین ٹیموں میں شمار کرانا آسان نہیں۔ لیکن وہ امریکا کو مواقع کی جنت سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے "آپ وہاں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بس ضروری ہے کہ سخت محنت کی جائے اور تھوڑی سی خوش قسمتی بھی ساتھ ہو۔ تب کرشمہ جنم لینا مشکل نہیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

ریڈاسکوائر

روس کا تاریخی وثقافتی مرکز

ہم اپنی دیگر ہم سفر خواتین کے ساتھ سابق سپر پاور روس کے دارالحکومت ''ماسکو'' کی سیر کر رہے تھے۔ ہمارا پروگرام روس کے صدیوں پرانے تاریخی وثقافتی مرکز، اس کی عظمتوں کے امین، اس تعمیراتی حسن کے نمائندے ''ریڈاسکوائر'' کو دیکھنے کا تھا۔

ریڈ اسکوائر جانے کے لیے اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے۔ ایسکیلیٹر کے ذریعے انڈر گراؤنڈ ورلڈ میں پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد ہم میٹرو میں سوار ہوگئے۔ میٹرو کمپارٹمنٹ کی کشادگی، اس میں بکھری روشنی، آرام دہ نشستیں، ان پر بیٹھے پیر و جوان، مرد و زن ہم سب کو حیرت سے تکے جا رہے تھے۔ سفر مختصر تھا کچھ دیر بعد اس زیر زمین دنیا سے باہر نکل آئے۔ آسمان نکھرا ہوا تھا، دھوپ روشن تھی۔ سڑکوں کی کشادگی، پختگی، سیاہی اور اطراف میں کھڑی بلند و بالا عمارتوں کا رعب و دبدبہ متاثر کرتا جا رہا تھا۔ ان فٹ پاتھوں پر، جہاں کتابیں بکتی تھیں اور درختوں کے پتے ہواؤں کے زور سے اڑتے پھرتے تھے، بڑا پر لطف منظر تھا۔ زیر زمین ایک اور راستہ سے ہم الیگزینڈر گارڈن کے وسطی حصہ میں جا پہنچے۔ آگے کوئی پون فرلانگ کے فاصلہ پر باغ کا اولین حصہ اور ریڈ اسکوائر تھا۔ یہاں زیر زمین فائیو اسٹار فری باتھ روم تھے۔ باغ کی ہریالی اور اس کی تازگی آنکھوں میں سمائی جاتی تھی۔ سامنے کریملن کی دندانے دار سرخ دیوار دور تک جاتی نظر آتی تھی اور ڈھلان سے نیچے خوب صورت ڈھلائی بیلٹ سے آگے کریملن کی دیوار نے جیسے مضطرب سا کر دیا تھا۔ میں سڑک کے کنارے دھرے بینچوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ میں صدیوں کی تاریخ کا لبادہ اوڑھے جس ماحول میں داخل ہونے والی تھی وہ کسی فرحت آگیں مشروب کے مانند تھا۔

ماسکو کے تاریخی ورثے، اس کی خوب صورتی اور دنیا کے بڑے شہروں میں اس کا شمار ہونے کی وجہ سے اسے بالعموم تیسرا روم کہا جاتا ہے۔ روم کی طرح یہ بھی پہاڑیوں پر آباد ہے اور ان پہاڑیوں کی تعداد سات ہے۔

زمانوں کی تاریخ کو اپنے سینہ میں کسی خزانہ کی طرح سمیٹنے اور محفوظ رکھنے والا ماسکو بہت بربادیوں اور تباہیوں کا شکار رہا۔ اس کا کون سا ہمسایہ ملک تھا جس نے اس پر چڑھائی نہیں کی۔ فرانس، سویڈن، جرمنی، منگولیا، پولینڈ اور ترکستان کی فوجوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کیا تاتاری اور کیا فرانسیسی یہ شہر ان کی جنگوں کی قربان گاہ پر چڑھتا، جلتا، تباہ ہوتا اور پھر ہر بار ایک نئی آن و شان سے ابھرتا رہا۔

اوپر کشادہ میدان میں لوگوں کا جم غفیر تھا، میرے سامنے سرخ رنگ کا ٹاور ٹروئٹسکایا کا شاہ کار، جو چوکور زیریں حصوں پر محرابی چھوٹی بڑی برجیوں اور سبز میزائل جیسی صورت والے سرے اور ڈھلائی گزرگاہ کے ساتھ کوٹافہ ٹاور کی یونانی طرز کی ڈیوڑھی میں اترتا نظر آیا۔ کریملن میں داخل ہونے کے لیے اسی ٹاور سے گزرنا پڑتا ہے۔

روس کی ریاستی شان کا مظہر، دنیا کے بہترین تعمیراتی حسن کا نمونہ، تاریخی اور ثقافتی یادگاروں کا ایک جہان کریملن کی صورت میں اس کے اندر آباد تھا، وہی کریملن جسے دیکھنے کی خواہش مجھے زمانے سے تھی، پھر اوخوتنی انڈر گراؤنڈ مارکیٹ کی چھت پر خوب صورت ریلنگ کے ساتھ ٹک کر منیز اسکوائر کے ارد گرد بلند و بالا عمارت کے ستاروں جیسے جھرمٹ پر نظریں ڈالنا، گاہے گاہے گھاس کے قطعوں کی پختہ حد بندیوں اور شیشے کے گنبدوں کے گرد کھنچی باؤنڈریوں پر بیٹھے، چلتے پھرتے، باتیں کرتے رنگ رنگ لوگوں کو دیکھنا، عین وسط میں بنے بڑے گنبد کی چوٹی کے مجسموں اور آسمان کی وسعتوں کی طرف مائل پرواز عمارتوں کی عظمتوں کو سراہنا اور اکثر دریائے نیگلینیا میں روسی کہانیوں کے کرداروں کو مجسموں کی صورت دیکھنا بڑا دلچسپ مشغلہ تھا۔ بہت دیر تک ان مناظر سے لطف اٹھایا، پھر اوپر سے نیچے آگئے۔ چھوٹی سی ندیا کی صورت، دریائے نیگلینیا کا خوبصورت کٹاؤ دار ڈیزائن میں مقید الیگزینڈر باغات کے ہمسایہ میں سست روی سے بہتا دریا بھی نہایت دل کش منظر تھا۔ پتا نہیں اسے دریا کا نام کیوں دیا، درحقیقت تو یہ ایک چھوٹا سا نالہ ہے۔

الیگزینڈر گارڈن کا سیاہ آہنی گیٹ شان دار اور اندر کے نظارے شاندار ترین تھے۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور اندر جانے کی اجازت تھی۔ کنگورے دار سرخ فصیل آرسینلینیا ٹاور کے ساتھ ریڈ اسکوائر کی طرف مڑتی چلی گئی تھی، پس منظر میں جھانکتی ایک کلاسیکل طرز کی زردئی عمارت کو غور سے دیکھا۔ اس کی سفید کھڑکیوں اور سفید ستونوں نے اسے بڑی دلکشی اور انفرادیت بخش رکھی تھی۔ یہ عمارت ''منیز'' کہلاتی ہے۔ منیز کے معنی گھڑ سواری کے ہیں۔ ماضی میں یہ عمارت گھڑ سواری کا اسکول

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

تھی، آج کل نمائش ہال ہے۔ اس عمارت کا کمال فن اس کی چھت ہے، جو ۴۵ ر میٹر چوڑی ہونے کے باوجود لکڑی کے شہتیروں پر کسی ستون اور سہارے کے بغیر کھڑی ہے۔ الیگزینڈر گارڈن میں کریملن کی دیوار کے سائے میں نامعلوم سپاہی کے مقبرے پر ستارہ صورت والے برنز میں کبھی نہ بجھنے والی آگ کا شعلہ روشن تھا۔ پھولوں کی ٹوکریاں، میز پر دھرا اس کا آئینی کنٹوپ اور بندوق ایک لمحہ کے لیے اس خوبصورت صبح کو بے حد اداس کرتی تھی اور اندر کہیں یہ خواہش بیدار ہوئی تھی کہ کاش دنیا امن کا گہوارہ بن جائے اور زندگی اتنی ہی خوبصورت اور پر امن ہو، جیسی اس صبح محسوس ہوئی۔ شیشے کے نیم قوسی شیڈ کے سامنے خاکی وردی میں ملبوس دو جوان سپاہی ساکت کھڑے زندہ انسانوں کے بجائے مجسمے سے دکھائی دے رہے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک دل موہ لینے والا منظر تھا۔ کسی تہذیبی، ثقافتی یا فوجی روایت کا امین، مگر سچی بات ہے ایک زندہ انسان گھنٹوں بے حس و حرکت کسی مردے کی طرح کھڑا رہے، تو یہ کافی ظلم کی بات تھی، تھوڑے تھوڑے وقفے بعد تین سپاہیوں کا مارچ پاسٹ کرتے ہوئے آنا، رکنا اور اسی انداز میں واپس چلے جانا بھی دلچسپ عمل تھا، ہم نے حد بندی کرتی آہنی چمک دار زنجیروں کی جھالروں کے پاس بیٹھ کر تصویریں بنوائیں۔

دیوار کریملن ریڈ اسکوائر کی طرف مڑ گئی تھی۔ ڈھلائی چڑھائی سے آگے مشہور سینٹ باسل گرجا گھر تھا۔ یہ خوبصورت گرجا گھر اپنے گنبدوں، میناروں عمارت پر لپٹے رنگوں کی بوقلمونیوں کے سبب دور ہی سے آنکھوں میں بسا جاتا تھا۔ ہرا، پیلا، گہرا گاجری، سرخ و سپید جیسے رنگوں کی بہار چھائی جاتی تھی۔ یہ منظر بہت دور سے نگاہوں کو گرفت میں لیتا اور بار بار تکنے پر مجبور کرتا تھا۔

میرے اردگرد مشرقی اور مغربی طرز تعمیر کا حسن بکھرا پڑا تھا۔ اگر سامنے قدرے سیاہی مائل سرخ سہ منزلہ اسٹیٹ ہسٹری میوزیم کی عمارت کی چھوٹی بڑی محرابی کھڑکیاں، چھوٹی اینٹ سے بنا ڈیزائن اور اس کے برج مشرقی طرز کے عکاس تھے، تو بائیں جانب دور تک مغربی طرز تعمیر اپنی جلوہ آرائیاں کرا رہا تھا۔ بڑی لمبی قطار لوگوں کے ملبوسات سے لے کر صورتوں میں بھی بوقلمونی تھا۔ میں عمارتوں سے ہٹ کر اب انسانوں کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ بھانت بھانت کے سیاحوں کے ساتھ روسی ملک کے طول و عرض سے آئے ہوئے مختلف لوگوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ دراصل روسی معاشرہ رنگا رنگ قبائل اور نسلوں کا ملغوبہ ہے۔

ریڈ اسکوائر، کریملن کی جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ وسیع میدان کے سینہ پر لمبی لکیریں یوں کھنچی ہوئی ہیں جیسے ابھی یہاں کوئی ریس شروع ہونے والی ہے۔ ریس ہو یا فوجی پریڈ بات تو ایک ہی ہے اور ہر قومی تہوار پر یہاں فوجیوں کی پریڈ اور آتش بازی سے آسمان کا سینہ رنگین ہونا اس کی ثقافتی و تاریخی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے۔ صنوبر کے درخت ساتھ ساتھ خاموش سنتریوں کی طرح کھڑے تھے۔ یہاں انقلاب اکتوبر میں ہلاک ہونے والوں، کمیونسٹ لیڈروں، جنگ عظیم دوم میں مرنے والوں، کچھ اہم ملکی شخصیتوں اور کچھ غیر ملکی انقلابیوں کی قبریں ہیں۔ قبروں پر جا بجا پھولوں کی ٹوکریاں اور گلدستے سجے ہوئے تھے۔ زنگاری اور سیاہ گرینائٹ سے تعمیر شدہ ایک چھوٹی سی عمارت، جس کی تعمیر مصری مستطیے (چبوترے پر دھرا چبوترا اسٹائل) جیسی ہے، ریڈ اسکوائر کے کلاسیکل ماحول میں بڑی منفرد سی لگتی ہے۔ ۱۹۲۴ء میں تعمیر ہونے والے اس مقبرہ کا نام قاہرہ کے عظیم فرعون، موسولس کے نام پر ہے، جو چوتھی صدی قبل مسیح میں تعمیر ہوا تھا۔

ریڈ اسکوائر کی یہ پر لطف سیر شاید تا عمر میرے ذہن پر چھائی رہے گی کہ یہاں ہر گام پر نت نئے نظاروں سے محظوظ ہوئے۔ پتا نہیں یہاں دوبارہ آنا نہ ہو، مگر دل میں خواہش ضرور رہے گی کہ کاش ایک بار پھر کبھی ریڈ اسکوائر کے مناظر دیکھ پاؤں، سو یہی حسرت دل میں لیے واپسی کا رخت سفر باندھا۔

☆☆

فرعون کا اُداس مُجسمہ

لکسر فرعونوں کا دارالحکومت تھا، یہ مصر کے درمیان نیل کے دونوں کناروں پر آباد ہے اور ۷ ر ہزار سال پرانا ہے۔ اس کا قدیم نام تھبس تھا، حضرت موسیٰؑ اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے، فرعون رعمیس دوم بھی اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ نیل کے جنوبی کنارے پر فرعون کے محلات تھے، یہ فن تعمیر کا شاہکار ہیں۔ یہ ۲، ۲ ر سو فٹ اونچے اور ۴، ۴ ر میٹر چوڑے ستونوں کا جنگل ہے جن پر قدیم مصری زبان میں فرمودات لکھے ہیں۔ آپ ان میں داخل ہوتے ہیں تو پہلے ایک پل پر پہنچتے ہیں۔ یہ پل انٹری پوائنٹ تھا، دریائے نیل اس وقت اس پل تک بہتا تھا، لوگ کشتیوں پر پل تک آتے تھے اور محلات میں داخل ہوتے تھے۔ ان محلات کے سو دروازے تھے۔ یہ محلات حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے تین ساڑھے تین ہزار سال قبل تعمیر کیے گئے تھے۔ ان کے لیے پتھر نیل کے دوسرے کنارے سے لایا گیا تھا۔

وہاں سرخ پتھروں کا درمیانے سائز کا پہاڑ تھا۔ بنی اسرائیل اس وقت فرعون کے غلام تھے، یہ لوگ سارا دن پہاڑ کاٹتے تھے، پتھروں کو چوکور تختوں کی شکل دیتے تھے، انہیں کشتیوں میں رکھتے تھے۔ یہ پتھر شاہی محل میں لائے جاتے تھے اور انہیں بعد ازاں تعمیر کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ فرعون کے دیوتا کا نام امان تھا۔ پورے کمپاؤنڈ کی دیواروں پر دیوتا امان کی تصویریں کندہ تھیں۔ دیوتا کی نشانی دو ٹوپیاں تھیں۔ محل کے باہر بنی اسرائیل کی بستی تھی، حضرت موسیٰ اسی بستی میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی والدہ محترمہ نے انہیں ٹوکری میں ڈال کر نیل میں بہا دیا تھا۔ یہ ٹوکری بہتے ہوئے محل کی دیوار کے ساتھ لگ گئی تھی۔ فرعون کی ملکہ کا وہ بیڈ روم ابھی تک موجود ہے جہاں سے اس نے حضرت موسیٰ کی ٹوکری دیکھی تھی۔ حضرت موسیٰ کی پرورش اسی محل میں ہوئی تھی۔ فرعون اپنے اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنے خاندان کے بت بنوانے کے خبط میں مبتلا تھے۔ محلات میں ۲/قسم کے بت تھے۔ ایک قسم کے بت سیدھے کھڑے ہیں جبکہ دوسری قسم کے بتوں نے سینوں پر ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ یہ دوسری قسم کے بت مردہ فرعونوں کی نشانی ہیں۔ مصر کے قدیم سنگ تراش کسی مردہ شخص کا بت تراشتے تھے تو اس کے ہاتھ اس کے سینے پر باندھ دیتے تھے جبکہ زندہ لوگوں کے بتوں کے ہاتھ ان کی رانوں کے ساتھ بنے ہیں اور یہ تن کر کھڑے ہیں۔ محلات کے درمیان مقدس جھیل تھی۔ یہ ایک بڑے سائز کا سوئمنگ پول تھا جس کی سیڑھیاں پانی کے اندر تک جاتی تھیں۔ محلات سے ذرا فاصلہ پر فرعون رعمیس دوم کا ذاتی محل تھا۔ فرعون رعمیس دوم کے سر پر سنہری تاج تھا اور اس تاج میں کوبرا پھن پھلا کر کھڑا رہتا تھا اور یہ فرعون کے اقتدار کی نشانی تھا۔ فرعون کی ۷۰/سے زائد بیویاں اور ۲۰۰/سے زائد بچے تھے۔ یہ بھی بتوں کی شکل میں دیواروں پر کندہ ہیں۔ فرعون جو کچھ دیکھتے تھے، جو کچھ سوچتے تھے یہ اسے تصویری رسم الخط میں دیواروں پر کندہ کرادیتے تھے۔ تھبس کی دیواریں فرعون کے ان خیالات اور مشاہدات کی لائبریریاں ہیں لیکن افسوس دنیا میں یہ تحریر پڑھنے والا کوئی ماہر نہیں، ہاں البتہ گائیڈ سیاحوں کو متاثر کرنے کے لیے یہ تحریریں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، لیکن یہ جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے۔

دنیا میں کاغذ فرعونوں نے ایجاد کرایا تھا۔ کاغذ پیپرس نام کے پودے سے تیار کیا جاتا تھا۔ پیپر کا لفظ پیپرس سے نکلا تھا اور یہ بھی فرعونوں کی مہربانی تھی۔ لکسر میں آج بھی پیپرس کی فیکٹریاں موجود ہیں لیکن یہ اب کینوس کے لیے استعمال ہوتا ہے، مصری مصور ان پر تصویریں بناتے ہیں۔

فرعون کے محلات اور دربار ریت میں دفن تھے۔ فرعونوں نے مصر پر ۳/ہزار ۳/سو سال تک حکومت کی تھی۔ تاریخ میں ۳۳/فرعون گزرے ہیں۔ ہر فرعون کو تقریباً ۱۰۰/سال اقتدار ملا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ آخری فرعون کا مقابلہ ہوا، یہ پانی میں ڈوبا اور اس کے ساتھ ہی فرعونوں کا اقتدار بھی ڈوب گیا، فرعون ختم ہوگئے اور ریت نے ان کے محلات کو ڈھانپ لیا۔ یہ ریت کے چھوٹے بڑے ٹیلے بن گئے۔ ان ٹیلوں کے ارد گرد لکسر کا شہر آباد ہوگیا۔ ان ٹیلوں میں سے کسی ایک ٹیلے پر ایک چھوٹی سی مسجد بنا دی گئی۔

۱۹۰۰ء کے شروع میں کھدائی شروع ہوئی۔ فرعون کا محل ریت سے برآمد ہوا تو پتا چلا یہ مسجد فرعون کے خصوصی دربار کے اوپر بن گئی تھی۔ یہ مسجد آج تک قائم ہے۔ اوپر مسجد اور نیچے فرعون کا دربار ہے۔ شام کا سورج اپنی شعاعیں سمیٹ رہا تھا۔ ہم فرعون کے سنگی ستونوں کے درمیان کھڑے تھے۔ سورج کی سرخ شعاعیں نیل کے پانیوں میں غسل کر رہی تھیں۔ شام لکسر کے افق پر آہستہ آہستہ پھیلا رہی تھی۔ میں ۵/ہزار سال پرانے محل کی کھڑکی میں کھڑا ہوگیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی سرخی نیل کے پانیوں میں گھل گئی اور اس کے ساتھ ہی فرعون کا محل اذان کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں نے زندگی میں ہزاروں اذانیں سنی ہیں لیکن فرعون کے محل میں اذان کی آواز کا اپنا ہی سرور تھا۔ مؤذن کی آواز کا اتار چڑھاؤ محل کی دیواروں سے ٹکرا رہا اور دیواروں پر لکھی تحریروں کو پیغام دے رہا تھا دنیا کے ہر فرعون کو زوال ہے لیکن اللہ کا پیغام دائمی ہے۔ اس دنیا میں اشہد ان لا الہ الا اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ مجھے اذان کی اس آواز میں فرعون کا مجسمہ اداس دکھائی دیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ اپنی فرعونیت پر شرمندہ اور اپنے گزرے تکبر پر نوحہ کناں ہو۔

کیہ جاناں میں کون

ایک پردیسن کی کہانی

جس کے وجود کا پودا اپنے ہی دیس کے
ایک دور دراز کے گملے میں لگ گیا تھا
اس کے رخ بدلتے رہے مگر اسی دوران
جڑیں کمزور ہوگئی تھیں

پروین ملک

ایک طویل عرصہ کے بعد گاؤں جا رہی تھی اور یہ سارا عرصہ میں نے اپنے ہی دیس میں پردیسن ہو کر بسر کیا تھا۔ اگر آپ سوچیں کہ مجھے پردیسی بنانے میں کسی قسم کے جبر کا دخل تھا تو ایسا نہیں ہے۔ یہ جوگ تو میں نے خود لیا تھا اور آپ کو معلوم ہے کہ نئے زمانے میں جو کوئی جوگ مالا گلے میں ڈالتا ہے تو وہ انسانوں کے جنگل کی طرف لپکتا ہے اور پھر وہیں کھو جاتا ہے۔

میں بھی شہر آئی اور پھر جانے کیا ہوا...... شاید مجھے نیند

WWW.PAKSOCIETY.COM

آئی، پل دو پل ہی سوئی ہوں گی مگر آنکھ کھلی تو زمانہ بدل چکا تھا...... ابھی کچھ ہی دیر میں بچے بڑے ہو گئے، لڑکیاں اپنے بچے کھلانے میں مصروف ہو گئیں اور لڑکے اپنے بچوں کے لیے چوگا اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ میں اتنے برس سوئی رہی۔ پر نہیں۔ ٹھہریے ذرا۔ مجھے یاد ہے چند گھڑیاں پہلے ہی تو مجھے وہ خاکی لفافہ ملا تھا، اپنی پیشانی پر On Pakistan State Service کا جھومر سجائے، وہ لفافہ یہ پیغام لایا تھا ''ہمیں آپ کی خدمات اپنے دفتر کے لیے حاصل کر کے خوشی ہوگی۔ آپ کو تاکید کی جاتی ہے کہ جلد از جلد ڈیوٹی پر حاضر ہو جائیں۔''

اور میں حاضر ہو گئی۔ لیکن اگر میں حاضر تھی تو پھر غائب کیسے ہو گئی۔ چھوٹے چھوٹے بچے، میرے گودوں کھلائے اتنے بڑے کیسے ہو گئے، میرے اپنے بچوں نے سکول جانا شروع کر دیا اور میں غافل ہی رہی۔ دن رات کا پھیر تو مجھے یاد ہے مگر رتوں کی خبر نہ رہی۔

پودا جب گملا میں لگ جائے تو اسے بدلتے موسموں کی پروا نہیں رہتی، دھوپ چھاؤں کے ساتھ اس کا رخ بدلنا ممکن ہو جاتا ہے، اگر اس سارے عمل کے دوران جڑیں کمزور بھی رہ جائیں تو کیا پروا۔ زندگی کا دھارا بہے چلا جاتا ہے، بسوں، رکشوں، ویگنوں کے ہارن، ہر وقت بھاگ دوڑ کا سماں، جیسے کہیں آگ لگ گئی ہو، دھول اور دھوئیں کے بادل یہی تو زندگی ہے۔

سرسوں کے پھولوں کی نرمی، شریہنہ اور دھریک کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، وہ سب تو ایک سپنا تھے۔ شہر کی زندگی رواں دواں، ہر وقت نئے ہنگاموں پر آمادہ، کہتے ہیں کئی کارخانے ایسے ہوتے ہیں جنھیں ایک بار چالو کر دو تو پھر رکتے نہیں، رکنے کا مطلب ہوتا ہے کوئی بڑی خرابی۔ اس بڑی خرابی سے بچنے کے لیے دن رات خام مال ان کارخانوں میں جھونکا جاتا ہے، پیداوار کیسی بھی ٹیڑھی بھینگی ہو کہیں نہ کہیں اس کی کھپت ہو ہی جاتی ہے۔

چلیے چھوڑیے ہمیں کیا۔ میں تو اپنے گمشدہ لمحوں کا حساب لگانے بیٹھی تھی، وہ لمحے جن میں سرسوں کی سی نرمی اور شریہنہ کے پھولوں کی خوشبو تھی جانے کہاں گم ہو گئے۔ شکر ہے کہ ان کے سپنے میری نیم خوابیدہ آنکھوں میں موجود تھے اور شاید میں انہی سپنوں پر گزارہ کر لیتی کہ میری بیٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ وہ باہر سے بھاگی بھاگی آئی اور مجھ سے لپٹ کر کہنے لگی ''امی ہمارا بھی کوئی گاؤں ہوتا تو کتنا مزہ آتا!''

''بیٹا ہمارا گاؤں ہے تو سہی مگر آج تمھیں کیسے خیال آیا۔'' اب میں پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔

''امی! ہمیں لے چلیں نا وہاں۔ پتا ہے گوشی وغیرہ اپنے گاؤں جا رہے ہیں اور کہتے ہیں تمھارا کوئی گاؤں ہی نہیں۔''

وہ بولنے لگی تو مجھے لگا میری ساری نیند ہوا ہو چکی ہے، اب میں جاگتی آنکھوں سے اپنے گاؤں کی گلیاں دیکھ رہی تھی۔

''تم جا کے انھیں بتاؤ کہ ہمارا گاؤں ہے اور اس گاؤں میں ہمارا خوبصورت سا گھر ہے، جس کے صحن میں لگی بیری کے بیر وہ کھا لیں تو سیبوں کا مزہ بھول جائیں۔''

''ہیں امی! سچ مچ......!'' میری بیٹی کی آنکھوں میں جیسے جوت سی جگ گئی۔

اور پھر اس نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر وہ رولا ڈالا کہ مجھے مانتے ہی بنی۔ گاؤں جانے کی تیاری کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ جانے کتنے چھوٹے بڑے کام مکڑی کے جالے کی طرح میرے اردگرد لپٹے ہوئے ہیں، پر کسی نہ کسی طرح میں ان جالوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی اور اب ہم گاؤں جا رہے تھے۔

بڑا لمبا سفر تھا یا پھر مجھے سفر کرنے کی عادت نہیں رہی تھی اس لیے ایسا لگا، بہرحال سٹیشن پر اتر کر تانگہ لیا اور گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ تانگہ کی سواری بچوں کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ خوشی سے بے حال ہوئے جا رہے تھے۔

جب گاؤں کے قریب کچی سڑک شروع ہوئی تو دھول کے بادلوں نے ہمارا استقبال کیا، مگر یہ دھول وہ نہیں تھی جو شہر کی سڑکوں کے ساتھ مل کر سب کا دم گھونٹتی پھرتی ہے۔ یہ تو جیسے ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے فضا میں بلند

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوتی اور پھر واپس اپنی جگہ پر چلی جاتی۔
گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے ایک ایک اینٹ مجھ سے شکوہ کر رہی ہو ''ہم تم سے ناراض ہیں، تم کہاں گم ہو گئی تھی۔'' اپنے گھر کے صحن میں لگے بیری کے درخت کی طرف بڑھی تو وہ بھی چپ چاپ کھڑا رہا ورنہ پہلے تو وہ میرے لیے پکے پکے بیر خود ہی گرا دیتا تھا ''خیر سب کو منالوں گی۔'' میں نے سوچا اور بند دروازے کھولنے لگی۔
کچھ ہی دیر میں سارے گاؤں کو میرے آنے کی خبر ہو گئی اور لوگ ملنے کے لیے آ گئے۔ دراصل گاؤں میں کوئی بھی فقط پڑوسی نہیں ہوتا، سب کے ساتھ کوئی نہ کوئی ناتا جڑا ہوتا ہے۔ عورتیں آتیں میرا ماتھا چوم کے گلے سے لگاتیں اور پھر بچوں سے تعارف ہوتا۔ کچھ دیر تو وہ حیران و پریشان سے کھڑے رہے پھر ان سے رہا نہ گیا تو دونوں بیک وقت بولے ''امی! آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ گاؤں میں ہماری اتنی نانیاں اور خالائیں ہیں۔''
''پتر! تمھاری ماں بہت ساری جماعتیں پڑھ گئی ہے نا۔ اسے یہ نمانے سے رشتے کہاں یاد رہ سکتے ہیں۔'' ماسی رحمتاں نے کہا تو میں شرمندہ ہو گئی۔ ''وہ ماسی! میں یاد تو سب کو کرتی تھی مگر کام کاج سے فرصت ہی نہیں ملی۔''
''نہ پتر! یہ بات نہ کہو۔ یاد رکھو جب کام بندے کو ہل میں جتے بیل جیسا بنا دیں تو زندگی بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔'' ماسی کے جواب نے مجھے لاجواب کر دیا۔
ہمارے گھر کے ساتھ ہی لالہ ممتاز کا گھر تھا۔ اکثر کام سے فارغ ہو کر امی ان کے ہاں جا بیٹھتیں، میں بھی ان کا پلو پکڑے ساتھ ساتھ ہوتی۔
اس گھر میں جانے کس زمانے کی ایک لکڑی کی سیڑھی تھی، یوں تو گاؤں کے کچی چھتوں والے گھروں کے لیے سیڑھی بہت ضروری ہوتی ہے مگر گھروں میں بانس کی سیڑھی ہی ہوتی تھی جسے ''پڑسانگ'' کہتے تھے۔ یہ زمین میں گڑی ہوئی چوڑے تختوں والی سیڑھی ان سے مختلف تھی۔ پرانی پکی لکڑی کے یہ موٹے موٹے تختے اور دوسری طرف کٹاؤ کے کام کا جنگلا، جس کے ہر ڈنڈے پر لٹو سا بنا ہوا تھا، تختوں کی چوڑائی اور جنگلے کا ہر ڈنڈا کٹاؤ کے کام کا ایسا بہترین نمونہ جسے دیکھ کر دل خوش ہو جائے، جانے کون سی لکڑی تھی کہ اس کا رنگ روپ اتنے موسموں کی سختیاں سہہ کر بھی ماند نہیں پڑا تھا۔ مجھے وہ سیڑھی بہت اچھی لگتی، لالہ ممتاز کے گھر جاتے ہی میں صحن میں بچھے پلنگوں اور پیڑھوں کو نظر انداز کر کے سیڑھی کے پہلے قدمچے پر جا کر بیٹھ جاتی، گھر کے سب لوگ میرے اس معمول کے عادی ہو گئے تھے اس لیے کوئی کچھ نہ کہتا، میں ہولے ہولے کھسکتی سب سے اوپر والے قدمچے پر پہنچ کر کھڑی ہو جاتی جہاں سے دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور پہاڑوں کے پیچھے ڈوبتے سورج کا نظارہ کر کے میں خوشی سے بے حال ہو کر چلا اٹھتی ''امی جی!'' وہ گھبرا کے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر کہتیں ''نیچے آؤ گر جاؤ گی۔'' بہت عرصہ یہ سلسلہ چلتا رہا نہ امی نے گھبرانا چھوڑا نہ میں سیڑھی پر چڑھنے سے باز آئی۔
اب میں اتنے عرصہ بعد گاؤں آئی تو لالہ ممتاز کے گھر جانا ہی تھا، میں صحن میں بچھے پلنگ پر بیٹھی بھابی سے باتیں کر رہی تھی تو گویا آسمان سے آواز آئی ''امی جی!'' میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ میری بیٹی سب سے اوپر والی سیڑھی پر خوشی سے دمکتا چہرہ لیے کھڑی تھی۔
''نیچے آؤ گر پڑو گی۔'' یہ شاید میری آواز تھی مگر دوسرے لمحے مجھے احساس ہوا میں سیڑھی پر کھڑی ہوں اور صحن میں بھی موجود ہوں۔ ہر طرف میں ہی میں ہوں۔
■

پروین ملک نے گورنمنٹ ہائی سکول اٹک سے میٹرک، گورنمنٹ کالج اٹک سے بی اے کیا۔ ایم اے صحافت کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ایم اے کرنے کے دوران ہی میں ریڈیو پاکستان لاہور سے ان کی کئی کہانیاں نشر ہوئیں۔ ۱۹۸۳ء میں پنجابی کہانیوں کا مجموعہ ''کیہ جاناں میں کون'' کے نام سے شائع ہوا۔ ''کیہ جاناں میں کون'' میں شامل چھ کہانیاں چھاچھی لہجے میں لکھی گئی ہیں جو پنجاب کے اس گوشے کی زبان ہے جو دریائے سندھ کے اُدھر پنجاب کا آخری کونہ ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

urdudigest.pk

جان

ڈریک نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے مردم بیزار اور دل آزاد لہجے میں کہا۔ ''دیکھو آنٹی! جو کچھ بھی کہنا ہے، جلدی سے کہہ دو، میرے پاس وقت بہت ہی کم ہے۔''

اس کی معمر آنٹی نے ایک ان چاہا عجز محسوس کیا۔ اسے اس امر کا گمان تک نہیں تھا کہ اس کے حقیقی بھائی کا کروڑ پتی بیٹا، اس کا سگا بھتیجا اس سے ایسا روکھا پھیکا اور جی بجھا دینے والا سلوک کرے گا۔ یہ بے رخی، بیزاری اور سرد مہری معمر خاتون کے لیے غیر متوقع تھی۔ بھتیجے سے ملنے کے لیے بھی اسے آدھ گھنٹہ انتظار کی کوفت برداشت کرنا پڑی تھی جو اس کے لیے بہت زیادہ تھی، اس کے نک چڑھے پی اے کی واہی تباہی سننی پڑی تھی تاہم وہ ہمت کر کے کچھ کہنے کے لیے اپنے آپ کو جمع کر رہی تھی کہ جان ڈریک نے ایک اور کچوکا لگایا'' آنٹی! اگر تم کچھ پیسے مانگنے آئی ہو تو یہ بات مت کرنا۔''

''نہیں جان...... نہیں۔ میں پیسے مانگنے نہیں بلکہ میں تو ایک گزارش کے لیے آئی ہوں۔'' خاتون نے خائف لہجے میں کہا۔

''جان! دیکھو سیموئیل تمہارا پھوپھی زاد بھائی ہے۔ اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لو۔ وہ بی کام اور ایل ایل بی کے امتحانوں میں اول آیا ہے۔ شریف، دیانت دار اور قابل اعتبار ہے۔ شراب نہیں پیتا، جوا نہیں کھیلتا۔ اپنی ہم

WWW.PAKSOCIETY.COM

لڑکیوں کے ساتھ بھی نہیں گھومتا اور تو اور وہ کلب تک نہیں جاتا۔ جان اسے اپنے بینک میں رکھ لو، وہ تمھارے بینک کے لیے موزوں امیدوار ہے۔"

"لیکن بینک میں تو کوئی اسامی خالی نہیں۔"

"ہے، خالی اسامیوں کے لیے اشتہار تو اخبار میں بھی چھپا ہے، میں اس کا تراشا ساتھ لائی ہوں۔"

"اوہ ہاں...... یاد آیا کہ ایک اسامی تو پُر کرنے کا اختیار مجھے بھی ہے۔ اچھا آنٹی! تم درخواست بھجوا دینا۔"

"جان! میں تو سام سے درخواست لکھوا کر ساتھ لائی ہوں۔"

معمر پھوپھی نے سام کی درخواست، جان ڈریک کے آگے رکھ دی اور معذرتیں کرتے ہوئے واپس جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

اس کے جاتے ہی جان ڈریک نے درخواست پھاڑ کر پھینک دی۔

اس کے بعد وہ بڑبڑانے لگا۔ "ان رشتے داروں نے تو جینا حرام کر دیا ہے، جب دیکھو، ملنے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔ وقت بے وقت چلے آتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ میں نے کوئی خیرات خانہ کھولا ہوا ہے۔

پھر اسے اپنے مختلف رشتے دار یاد آئے اور اپنے بچپن کا زمانہ یاد آیا۔ ان ایام رفتہ کا خیال آیا جب وہ بہت چھوٹا تھا تو اس کی یہی پھوپھی ایک تنومند، خوش دل اور بھرپور جوان عورت تھی اور اسے اپنی آنکھ کا تارا اور دل کا سرور کہتی تھی۔ وہی اس کی دنیا کا بہترین کردار تھی۔ اس کی پھوپھی پہروں اسے اپنے پاس رکھتی، اسے ہاٹ چاکلیٹ بنا بنا کر کھلاتی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں نے اپنی پھوپھی کے ساتھ بہت ناروا سلوک کیا ہے۔ درخواست پھاڑ دینا تو ہرگز درست نہیں ہے۔ اگر سیموئیل کو ملازمت مل جاتی تو آخر میرا کیا بگڑتا ہے۔"

وہ ایسی باتیں سوچتے سوچتے مضطرب ہو گیا پھر اس نے اپنے پی اے کو بلا کر ہدایت کی۔ "مجھے آدھ گھنٹے تک ملنے کے لیے کوئی نہ آئے، سمجھے، کوئی بھی نہیں۔"

اس کے بعد اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ پھاڑی ہوئی درخواست کے تمام پرزے جمع کیے۔ اُنھیں صحیح ترتیب دے کر جوڑا۔ اُس نے سیموئیل کی لکھی ہوئی درخواست اپنے ہاتھ سے لکھی اور دوبارہ اپنے سیکرٹری کو بلا کر وہ درخواست اسے دیتے ہوئے کہا "دیکھو، بینک میں خالی اسامی کے لیے جو درخواستیں آئی ہیں، یہ درخواست بھی اُن کے ساتھ رکھ لو۔ یہ درخواست دہندہ میرا کزن ہے۔ اگر یہ انٹرویو وغیرہ میں کامیاب ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ کچھ نہیں۔ میں صرف اس کی درخواست دے رہا ہوں، کوئی سفارش قطعاً نہیں کر رہا، سمجھے۔"

کچھ دنوں بعد اس کی پھوپھی پھر آئی اور اس نے بڑے غمگین اور افسردہ لہجے میں کہا "جان! تم نے سیموئیل کو کیوں نہیں لیا؟ وہ تو انٹرویو میں اول آیا تھا، اس کے بجائے ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے کو لے لیا جو پورے شہر میں بدنام ہے اور کئی تھانوں میں اس کے خلاف سنگین جرائم کی رپورٹیں ہیں۔"

جان ڈریک نے پھر اس بے لحاظ انداز میں کہا۔ "آنٹی! اس وقت تو میں گورنر سے ملنے کے لیے جا رہا ہوں، واپس آ کر خود تحقیق کروں گا۔"

پھوپھی کے جانے کے بعد اس نے اپنے سیکرٹری کو بلایا اور پوچھا "کیا سیموئیل موزوں اُمیدوار نہیں تھا جو اُسے نہیں لیا گیا؟"

"نہیں جناب......! بات کچھ اور ہے، سیموئیل تو انٹرویو میں بھی اول آیا تھا لیکن......"

"یہ لیکن ویکن کیا ہے؟"

"جناب......! آپ کے حکم اور بینک کے قواعد کے مطابق ہم نے اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر اپنے ماہر تحریر کو دی تھی۔ اس کی رپورٹ یہ تھی کہ ایسے خط اور تحریر والا، شرابی، کبابی، عیاش، بدکار، خائن، بددیانت، احسان فراموش اور بے ایمان ہوتا ہے۔ اس رپورٹ کے بعد ہم اسے کیسے لے سکتے تھے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

جرگہ

ایک باپ کا ماجرا

اُسے اپنے غصے پر قابو تھا نہ جرگے کے فیصلے پر اختیار
تکبر اور غیرت کے پاگل پن کی قیمت بیٹیوں کو
ادا کرنی پڑے تو دُکھ نہیں جاتا

اسماعیل گوہر

میں نے اس کے پاؤں پکڑے رو رو کر منت سماجت کی۔ بابا! خدا کے لیے مت جا مگر مجھے لات مار کر پرے کردیا۔ چھوٹا بھائی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ ''بابا! مت جاؤ۔'' اس نے اسے بھی بلی کے بچے کی طرح جھٹک دیا۔ ماں دوڑ کر آئی اور اپنی چادر اس کے قدموں میں ڈال کر گڑگڑائی ''تمھیں ان بچوں کی قسم مت جاؤ۔'' مگر اسے بھی دھکا دے کر اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ وہ پشتون تھا، اپنے پشتون ہونے کے غرور میں تھا، غیرت اور غصے سے پاگل ہو رہا تھا، کسی کی ایک نہ مانی پگڑی سر پر رکھی اور بندوق اٹھا کر جانے لگا، ہم سب اس کے پیچھے دروازے تک دوڑے مگر وہ پلک جھپکنے میں گلی کا موڑ مڑ چکا تھا۔

میری عمر اس وقت بارہ برس تھی اور اختر میرا چھوٹا بھائی آٹھ برس کا تھا، وہ تو شام تک روتے روتے سو گیا مگر میں اب تک رو رہی ہوں اور جب تک یہ آنکھیں کھلی ہیں یونہی آنسو بہاتی رہیں گی۔

میرا بابا گل میر کے پیچھے گیا تھا۔ آج اس نے مسجد میں بابا سے تلخ کلامی کی تھی۔ آج چاچا نے بابا کو سمجھایا بھی تھا کہ جب تک فیصلہ نہیں ہو جاتا تم درخت نہ کاٹو۔ مگر بابا کب ماننے والا تھا۔ کہنے لگا زمین میری اور مالک وہ؟ اور پھر جب گل میر نے بابا کو آنکھیں دکھا کر للکارا کہ اگر زبردستی مجھ سے لے سکتے ہو تو لے کر دکھاؤ! تو اس کا جواب دینے کے لیے بابا نے بندوق اٹھالی۔ ہمارے

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

بیٹے کے باوجود نہ رکا۔
گل میر کے دونوں بیٹے گھر کے سامنے بھوسہ اکٹھا کر کے اس پہ گیلی مٹی کا لیپ کر رہے تھے۔ بابا نے وہیں ان دونوں کا کام تمام کر دیا۔
اس وقت اختر سویا ہوا تھا کہ اچانک چیخ مار کر اٹھ بیٹھا جیسے کسی ان دیکھی طاقت نے اسے آنے والے خطرات سے آگاہ کیا ہو۔ ماں نے دوڑ کر اسے اپنے سینے سے لگایا اور تھپک تھپک کر سلا دیا مگر ہم دونوں صبح تک جاگتی رہیں۔ کبھی کبھی رات کے اندھیرے میں گلی میں کتے بھونکتے تو ہمارے دل دھک سے رہ جاتے۔ ساری رات کتے بھونکتے رہے اور ہمارے دل خوف سے کانپتے رہے۔ بابا دو جوانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بعد مفرور تھا۔
دیکھتے ہی دیکھتے وقت بدل گیا۔ لوگوں کو زبانیں لگ گئیں۔ گاؤں کے لوگ جب گل میر کے ہاں دعا کے لیے جاتے تو کہتے بڑا ظلم ہوا ہے۔ وہی لوگ ہمارے ہاں آتے تو کہتے بہت بُرا ہوا۔
بات ایک ہی تھی صرف الفاظ بدلے ہوئے تھے مگر ہیر پھیر سے معنی نہیں بدل جاتے۔ بابا کہاں تھا اس کی نہ مجھے خبر تھی نہ ماں کو، مگر مجھے اتنا یقین تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوگا، اب تک اس کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا اور وہ ضرور سوچ رہا ہوگا کہ یہ میں نے کیا کیا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا ہوگا۔ غیرت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اب پرسکون ہو چکا ہوگا اور اس کی انا اس کی پشتونیت...... ہو سکتا ہے اب تک وہ بھی مثبت سوچ میں بدل گئی ہو۔
ہمارا گاؤں عزیزوں کا گاؤں کہلاتا ہے۔ بڑے بڑے معاملات عزیزوں کے جرگے میں حل کیے جاتے تھے۔ ایک بار پھر عزیزوں نے سر جوڑ لیے۔ ایک بڑے جرگے کے لیے چھوٹے چھوٹے جرگے تیاری کرنے لگے اور آخر ایک ماہ کی سرگوشیوں اور سر جوڑنے والوں کی کوششوں سے ان چھوٹے جرگوں نے بابا کا پتا لگا لیا اور پھر صلح کی راہ نکالنے میں لگ گئے۔
جب سے یہ واقعہ ہوا تھا، ماں کا رویہ میرے ساتھ بدلا بدلا سا تھا۔ اس کے دل میں جو خوف موجود تھا اس واقعہ کے بعد بڑھتا گیا اور مجھ سے محبت بھی، وہ مجھے زیادہ توجہ دینے لگی، میرا زیادہ خیال رکھنے لگی۔ عجیب بے سروپا سی باتیں کرتی۔ کبھی تقدیر کی بات کرتی تو کبھی حالات سے سمجھوتہ کرنے کا ذکر کرتی۔ کچھ بے ربط اور غیر واضح سی نصیحتیں کرتی۔ کبھی کبھی ایسی نظروں سے دیکھتی جیسے میں سمندر میں ڈوب رہی ہوں اور وہ ساحل پر کھڑی بے بسی سے تماشا دیکھ رہی ہے۔
آج ہمارے گھر بہت سے رشتے دار جمع ہوئے، سب کی نظریں بدلی بدلی سی تھیں۔ سب کی آنکھوں میں بے بسی اور چہروں پر مظلومیت کے سائے تھے۔ شاید آج ہونے والے جرگے کا اثر تھا مگر میں سوچ رہی تھی آج تو جرگے میں فیصلہ ہونا ہے۔ اب دونوں خاندانوں میں صلح ہو جائے گی۔ یہ تو خوشی کا مقام ہے، پھر سب لوگ اتنے خوفزدہ کیوں ہیں لیکن میں نادان تھی اس لیے سمجھ نہ سکی۔ مجھے تو اس وقت سب کے چہروں پر چھائی ہوئی زردی اور سردنی کی وجہ کا پتا چلا جب جرگے نے اپنے فیصلے کی شرائط کا اعلان کیا۔
اور میرا باپ جس کے غصے کی چنگاریاں اب تک ٹھنڈی پڑ چکی تھیں اور غیرت کے سمندر کی موجیں بھی اب ساحل کی گرم ریت میں جذب ہو چکی تھیں، اس نے جرگے کی تمام شرائط مان لیں۔
اعلان ہوا، ”ایک لاکھ روپیہ اور ایک لڑکی۔“
کسی نے آواز لگائی۔ ”مگر گل میر کے تو دونوں لڑکے مارے گئے ہیں اب یہ لڑکی......“
دوسرے نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے جواب دیا۔ ”جرگے کا فیصلہ ہے۔ ایک لاکھ روپیہ اور لڑکی گل میر کو دے دیے جائیں اب یہ اس کی مرضی کہ وہ ان کا کیا کرتا ہے۔“
کسی طرف سے تیسری آواز آئی، ”گل میر بھی تو رنڈوا ہے......“
میری چیخ تو حلق میں پھنس کر رہ گئی مگر ماں نے ایک دل دوز چیخ مار کر مجھے سینے سے لگا لیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

urdudigest.pk

موت کو شکست دینے والی

بہادر لڑکی

گھنے جنگلوں کی سیر پر نکلی ایک نہتی اور بہادر لڑکی کی سچی کہانی
اُس نے موت کو شکست دے ڈالی تھی جبکہ اُس کا جسم زخمی تھا
اور کہیں سے مدد ملنے کی توقع نہ تھی

فرحان سلیم

WWW.PAKSOCIETY.COM

جب

پامیلا سلانت اور ایرک اینگ صبح سویرے کار میں نکلے، تو انھیں یقین تھا کہ اگلے ۲/ دن بڑے پُرلطف گزریں گے۔ یہ پچھلے سال وسط جولائی کا خوشگوار دن تھا۔ جمعہ کی دوپہر دونوں نے پروگرام بنایا تھا کہ آنے والی ۲/ چھٹیاں ماؤنٹ ہڈ نیشنل نامی جنگل میں کیمپ لگا کر گزاری جائیں۔ وہ جنگل میں قیام کر کے فطرت سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔

ان دونوں کی منگنی ہوچکی تھی۔ وہ امریکی ریاست اوریگن کے شہر، پورٹ لینڈ کے باسی تھے۔ ۲۸/ سالہ پامیلا سالت ایک جونیئر اسکول میں استانی جبکہ ۳۱/ سالہ ایرک ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا تھا۔

۲/ گھنٹے سفر کے بعد ان کی منزل آ پہنچی۔ جنگل ہمہ اقسام کے پرندوں کی میٹھی بولیوں سے گونج رہا تھا۔ نوجوان جوڑے نے جنگل کے باہر مخصوص جگہ کار پارک کی اور جنگل میں داخل ہوگئے۔ یہ جنگل ایک پہاڑی علاقے کے دامن میں واقع تھا۔ انھیں ڈیڑھ میل دور واقع بیئر لیک نامی جھیل تک پہنچنا تھا۔ وہ اس کے کنارے ایک رات کے واسطے کیمپ لگانا چاہتے تھے۔ کل دوپہر پھر وہ واپس اپنے گھر پہنچ جاتے۔ انھیں شام کو ایک دوست کی سالگرہ میں شرکت کرنی تھی۔

جب وہ جنگل میں داخل ہوئے تو سورج خوب چمک رہا تھا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ باتوں باتوں میں مستقبل کے میاں بیوی آپس میں لڑ پڑے۔ نوجوان خون جو تھا۔ ان میں پہلے بھی دو تین بار منہ ماری ہوچکی تھی لیکن چند دن ناراض رہنے کے بعد وہ پھر باہم شیروشکر ہوجاتے۔ اس بار معاملہ خاصا بڑھ گیا اور پامیلا کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

حتیٰ کہ جب دونوں جھیل پر پہنچے، تو پامیلا بے حال ہوچکی تھی۔ اس نے تب اپنے منگیتر کے پاس رکنے سے انکار کردیا اور کہا "میں جھیل کے پار والے حصے میں جارہی ہوں، وہیں اپنا کیمپ لگاؤں گی۔ ایرک بھی تاؤ میں آیا اور جھیل کنارے آرام کرنے بیٹھ گیا۔

پامیلا نے اپنا بیگ سنبھالا اور جھیل کے کنارے کنارے چل پڑی۔ اُسے علم نہ تھا کہ بظاہر سامنے نظر آنے والے حصے تک پہنچنے کے لیے اُسے کئی چکر کاٹنے پڑیں گے۔ دراصل یہ جھیل ٹیڑھی میڑھی ہو کر جنگل میں پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ پامیلا بھی جنگل میں داخل ہوگئی اور غصے میں اندھا دھند چلتی رہی۔ اُسے ہوش تب آیا جب وہ ایک پہاڑی کے نزدیک جا پہنچی۔ اردگرد کہیں جھیل کا نام و نشان نہیں تھا۔

دراصل اپنی سوچوں میں گم پامیلا راستے سے بھٹک گئی اور جھیل کی مخالف سمت چل پڑی۔ اب اس کے چاروں طرف بلند و بالا درخت یا جھاڑیاں تھیں۔ اسے سمجھ نہیں آرہا کہ وہ کس طرف جائے۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پہاڑی پر چڑھ کر چاروں طرف کا جائزہ لے۔

پہاڑی تقریباً ۲۰۰/ فٹ بلند تھی۔ اس سے آگے پھر پہاڑیوں اور گھاٹیوں کا طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ پامیلا اوپر پہنچی، تو اُسے دور دور تک جنگل ہی نظر آیا۔ اس سے پرے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر برف چمک رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔ اس نے پھر گھبراہٹ کے مارے ایرک کو آوازیں دیں، مگر وہ وہاں ہوتا، تو سنتا۔ ایرک تو بہت پیچھے اپنے بیگ سے کھانا نکال کر کھانے میں محو تھا۔ پھر گھنے درختوں سے نکل کر پامیلا کی آواز کا پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔

پامیلا کو خبر نہ تھی کہ وہ تقریباً ۳/ گھنٹے سے چل رہی تھی۔ چنانچہ بیئر لیک خاصی پیچھے رہ گئی تھی۔ اب پہاڑی سے قرب و جوار کا جائزہ لیتے ہوئے اُسے دور سامنے ایک جھیل نظر آئی۔ وہ اُسے بیئر لیک ہی سمجھی۔ چنانچہ اسی کی سمت دیوانہ وار نیچے اترنے لگی۔

گھبراہٹ اور جلدبازی کے باعث اچانک اس کا پاؤں رپٹا اور پھر پامیلا کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تقریباً ۲۰/ منٹ بعد اُسے ہوش آیا، تو پامیلا کو دائیں ٹانگ میں تکلیف محسوس ہوئی۔ جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ اس کا گھٹنا ٹوٹ چکا۔ ۴۰/ فٹ کی بلندی سے لڑھکنے کی وجہ سے جسم کے بقیہ حصوں پر بھی خاصی چوٹیں لگی تھیں۔

پامیلا پہاڑی پر چھجے نما جگہ پر براجمان تھی۔ وہ تنہا تھی اور سردی سے بچاؤ کے کپڑے ایرک کے پاس ہی رہ گئے تھے۔ اُدھر رات سر پر آ پہنچی تھی۔ اس عالم خوف میں مردوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے وہ تو پھر عورت تھی۔ لیکن پامیلا نے ہمت پکڑی اور تہیہ کرلیا کہ وہ تمام مشکلات کا مقابلہ کر کے زندہ رہے گی۔

کچھ دور پتھروں پر پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ پامیلا جان گئی کہ وہ کوئی چشمہ ہوگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ رات اسی جگہ گزار لے گی۔ صبح اُٹھ کر چشمے کا پیچھا کرے گی، شاید وہ جھیل بیئر لیک کی طرف ہی جا رہا ہو۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کہ ٹانگ میں معمولی سا درد تھا، چنانچہ وہ جلد سوگئی۔

دوسرا دن

گو دن میں گرمی ہوتی تھی، لیکن رات کو خاصی ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ رات کے کسی حصے دائیں ٹانگ میں نمی کا احساس ہوا، لیکن وہ پھر نیند میں ڈوب گئی۔ پامیلا کی خوش قسمتی تھی کہ اس جنگل میں موذی جانور نہیں تھے ورنہ وہ اُسے نقصان پہنچا سکتے تھے۔

صبح جب وہ اٹھی، تو دیکھا کہ زخمی گھٹنے سے خون رِس رہا ہے۔ وہ اب جم کر لوتھڑا نما شکل اختیار کر چکا تھا۔ اب گھٹنے سے ٹیسیں بھی اٹھ رہی تھیں مگر بہادر پامیلا نے ہمت ہارنے سے انکار کردیا۔ وہ مصمم ارادہ کر کے اپنے آپ سے بولی "میں تمام رکاوٹوں کا مقابلہ کر کے زندہ رہوں گی۔"

وہ لنگڑاتی ہوئی چشمے کی طرف بڑھ گئی۔ شروع میں تکلیف کی لہروں نے اُسے سرتاپا جھنجھوڑ دیا، لیکن اس نے اپنی پوری توانائی سے سفر جاری رکھا۔ آخر وہ چشمے تک پہنچ گئی۔ وہاں اس نے پہلے اپنا زخم دھویا اور منہ پر چھینٹے مارے اور ٹھنڈا میٹھا پانی پیا۔ قدرتی پانی کی قوتوں نے اس کی ساری توانائی بحال کردی۔ وہ چشمے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ اس نے گھٹنے پر اپنی ٹی شرٹ باندھ لی تھی تاکہ مزید خون نہ نکلے۔

پامیلا کو علم نہ تھا کہ اس چشمے کا نام لنڈ سے کریک تھا۔ یہ چشمہ ایک گھاٹی سے ہوتے ہوئے دریائے کولمبیا میں جا گرتا تھا۔ اس گھاٹی کا راستہ اتنا پیچدار اور اونچی نیچی چٹانوں سے پُر تھا کہ شاید آج پامیلا کی صورت میں پہلی بار کسی انسان کے قدم وہاں پڑے تھے۔ تاہم ابتداً چلتے ہوئے پامیلا نے اردگرد پھیلی فطری خوبصورتی کو سراہا۔ کہیں آنکھوں کو طراوت بخشنے والا سبزہ تھا اور کہیں پُرپیچ پتھریلے راستے جن کے درمیان سے چشمے کا پانی بہہ رہا تھا۔

پامیلا سنبھل سنبھل کر پتھروں پر قدم رکھتی رہی۔ اس نے اندھا دھند سفر نہیں کیا بلکہ ہر ہر قدم ناپ تول کر اٹھاتی۔ وہ پہلے ہی پیش بینی کرلیتی کہ کس چٹان سے گزرنا آسان رہے گا۔ کبھی کبھی گرے ٹہنے اس کا سہارا بن جاتے۔ کبھی چٹانوں کی دیواریں اسے ٹیک دیتیں۔

لنگڑاتے ہوئے سفر جاری تھا کہ ایک رکاوٹ آ پہنچی۔ ایک جگہ چشمہ چھوٹی سی آبشار بناتے نیچے گر رہا تھا۔ نیچے بھی چھوٹی جھیل سی بن گئی تھی۔ فاصلہ تقریباً ۱۲/ فٹ تھا۔ اب سفر جاری رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ پامیلا نیچے چھلانگ لگا دے۔ وہ ایک گھنٹہ چٹان کی نکر پر بیٹھی اپنی حالت پر غور کرتی رہی۔ آخر اس نے چھلانگ لگانے کا فیصلہ کرلیا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں یہ کرنے لگی ہوں۔" پانی تقریباً ۱۰/ فٹ گہرا تھا لہٰذا وہ ضرب لگنے سے محفوظ رہی۔ پانی سے باہر آ کر اس نے کچھ آرام کیا۔ اب اُسے بھوک محسوس ہونے لگی۔ کھانے کا سارا سامان بھی ایرک کے پاس رہ گیا تھا۔ حقیقتاً وقتی غصے نے پامیلا کو بڑی مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ غصہ سب سے زیادہ خود ہی کو نقصان پہنچاتا ہے۔

کچھ ستانے کے بعد اترائی کا سفر پھر شروع ہوگیا اور درختوں کا سلسلہ گنجان ہونے لگا۔ راستہ تاہم اب بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

پتھریلا اور دشوار گزار تھا۔ پاملا کو اب ایسے درخت کی یا جھاڑی کی تلاش تھی جس پر بیر یا کوئی خوردنی پھل لگے ہوں۔
سہ پہر کو اچانک ایک ہیلی کاپٹر کی آواز آنے لگی۔
''کیا وہ مجھے تلاش کر رہا ہے؟'' اس نے بے تابی سے سوچا۔ اُسے درختوں کی اوٹ سے ہیلی کاپٹر نظر بھی آیا، لیکن اس میں بیٹھے لوگ پاملا کو نہ دیکھ سکے۔ درخت ان کے درمیان پردہ بن گئے۔ پاملا نے سوچا کہ کاش وہ کسی صاف جگہ پر ہوتی۔
شام کو اس نے درختوں کے مابین صاف جگہ پر قیام کیا۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے چٹانوں سے سوکھی کائی اتاری اور اسے اپنے کپڑوں میں بھر لیا۔ پھر اپنا بیگ پھاڑ ڈالا تاکہ اس سے اپنا جسم ڈھانپ سکے۔ یہ تیاری کرنے کے بعد وہ لیٹ گئی۔
گھاٹی میں اندھیرا چھاتے ہی کیڑے مکوڑے بولنے لگے تھے۔ تبھی اُسے ایرک کی یاد آئی۔ شاید اسی نے اس کی تلاش میں ہیلی کاپٹر بلایا تھا۔ پاملا کو بہت ندامت ہوئی کہ وہ کبھی کبھی خودسری کے باعث اس سے لڑ پڑتی ہے۔
یہ اتوار کی شام تھی اور آج اُسے اپنے دوست کی سالگرہ میں شریک ہونا تھا۔ وہاں یقیناً لذیذ کیک اور مزے دار کھانے مہمانوں کے منتظر ہوں گے۔ یہ تصور کرتے ہی پاملا کے منہ میں پانی بھر آیا۔

تیسرا دن

جانے اس کی کب آنکھ لگی، پاملا اٹھی، تو سورج خوب چمک رہا تھا۔ اس نے کھڑا ہونا چاہا، تو گھٹنے میں شدید درد ہوا اور اس کی چیخ سی نکل گئی۔
زخم پھول کر خاصا فربہ ہو چکا تھا اور اب اس میں عفونت پھیلنے کا خطرہ تھا۔ پاملا تشویش میں مبتلا ہوگئی مگر اس نے اپنی دلیری اور زندہ رہنے کی امنگ برقرار رکھی۔
آخر قدرت بھی اس کی مدد کو آ پہنچی۔ ایک جگہ اُسے جھاڑی پر لگی گلابی بیریاں نظر آئیں۔ اس نے ایک بڑی احتیاط سے چکھی، ذائقہ نمکین تھا۔ جب آدھے گھنٹے تک اسے کچھ نہ ہوا، تو پاملا کو یقین ہوگیا کہ بیریاں زہریلی نہیں۔ چنانچہ اس نے اتنی بیریاں کھا لیں کہ پیٹ کی آگ بجھ جائے۔ پھر چشمے کا ٹھنڈا پانی پی کر اس نے اپنے خدا کا شکر ادا کیا۔
اب ڈھلوانی راستہ ختم ہو چکا تھا، لیکن کئی چھٹی چٹانوں سے گزرنا کارے دارد تھا۔ جابجا درخت بھی اس کے اوپر چھتری کی طرح تنے تھے۔ تیسرے دن سہ پہر کو پھر ایک ہیلی کاپٹر فضا میں نمودار ہوا لیکن درختوں نے اُسے پھر چھپائے رکھا۔ اس رات وہ سوئی، تو بچپن کی حسین یادوں نے پاملا کو گھیرے رکھا۔ اُسے اپنے والدین کی محبت اور بہن بھائیوں کی شرارتیں یاد آئیں۔ پھر ایرک کی والہانہ محبت بھی اس پر پھوار بن کر برستی رہی۔
پاملا میں تب اس شدید تمنا نے جنم لیا کہ وہ والدین کے ساتھ ہوتی۔ پاملا انھیں آغوش میں لے کر چیخ چیخ کر بتانا چاہتی تھی کہ وہ ان سے از حد محبت کرتی ہے۔ پھر ابھی تو بہت سے کام باقی تھے...... وہ بانسری بجانا سیکھنا اور بچوں کی ماں بننا چاہتی تھی۔ پھر اُسے اپنی سہیلی، ٹینا یاد آئی جو ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئی تھی۔ پاملا نے سوچا ''اگر میں زندہ نہ رہ پائی، تو کم از کم کہیں نہ کہیں ٹینا ہی سے جا ملوں گی۔''

چوتھا دن

چوتھے دن وہ بیدار ہوئی، تو گھٹنے کی تکلیف اور نقاہت برداشت کی آخری حد کو چھو رہی تھی۔ اس نے سوچا ''بہت ہوگئی۔ آج یا تو میں گھر پہنچ جاؤں گی یا یہ علاقہ میرا مدفن بن جائے گا۔''
پاملا ایک فرلانگ چلی ہوگی کہ تقریباً ایک کنال بڑا کھلا علاقہ آ گیا جس پر کسی درخت کا سایہ نہ تھا۔ وہ اسی جگہ پر بیٹھ گئی کہ شاید ہیلی کاپٹر چلا آئے۔ وہ ۳ر گھنٹے بھوک و پیاس کے عالم میں بیٹھی رہی لیکن قسمت نے یاوری نہ کی۔ تھوڑی دیر بعد ایک موٹی تازی سنڈی چلتی ہوئی وہاں آ پہنچی۔ بھوک کی ماری پاملا نے اٹھائی اور منہ میں ڈال لی۔ اس کا دہن کڑوے سیال سے بھر گیا۔ اس نے اتنی تلخ شے کبھی منہ میں نہیں ڈالی تھی۔ پاملا نے فوراً اگل دی اور پھر دیر تک چشمے کے پانی سے کلیاں کرتی رہی۔
اسے واپس کھلی جگہ آئے چند منٹ گزرے تھے کہ گھوں گھوں کی آواز آنے لگی اور جلد ہی ایک ہیلی کاپٹر وہاں آ پہنچا۔ پاملا نے کھڑے ہونے کی سعی کی مگر کمزوری کے باعث گر پڑی۔ ہیلی کاپٹر چند لمحے ہوا میں سرسراتا رہا اور پھر واپس چلا گیا۔
''کیا انھوں نے مجھے دیکھ لیا ہے؟'' پاملا کے ذہن میں یہ سوال چکرا رہا تھا۔ اچانک اُسے دائیں طرف گلابی بیریوں سے لدی ایک جھاڑی نظر آئی۔ ان بیریوں نے پہلے کم از کم بھوک تو مٹا دی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ لپک کر جائے اور پیٹ کی آگ بجھائے لیکن پیچھے سے کوئی مددگار آ گیا تو...... چنانچہ وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی۔
جب آدھ گھنٹہ گزر گیا، تو پاملا نے سوچا ''میں ۵۰۰ر تک گنتی ہوں۔ اگر کوئی نہ آیا، تو میں جا کر بیریاں کھا لوں گی۔'' اس نے آہستہ آہستہ گنتی گنی مگر کوئی نہ آیا۔ جب ختم ہوئی، تو وہ جی کڑا کر کے اٹھی اور جھاڑی کی سمت بڑھنے لگی۔
''شاید آپ ہی پاملا ہیں؟''
پاملا نے مڑ کر دیکھا، تو ۴ر نوجوانوں کو کھڑے پایا۔ وہ مہم جوئی کے ایک کلب، ہڈریور کے کارکن تھے۔ مقامی انتظامیہ نے انھیں پاملا کی تلاش پر مامور کیا تھا۔ وہ بھی یہ سوچ کر لنڈے کریک کے ساتھ ساتھ چل پڑے تھے کہ شاید گم شدہ لڑکی نے یہی راستہ اختیار کیا ہو۔ ان کا ہیلی کاپٹر سے ریڈیائی رابطہ قائم تھا۔ چنانچہ ہیلی کاپٹر والوں نے پاملا کو دیکھا، تو انھیں مطلع کر دیا۔ اب وہ منزل پر آ پہنچے تھے۔
بھوکی پیاسی پاملا انھیں دیکھتے ہی خوشی سے چلائی ''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم سب یہاں آ پہنچے۔ میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنی مسرت ہو رہی ہے۔''
نوجوانوں نے پاملا کو سینڈوچ کھلائے اور ابتدائی طبی امداد دی۔ جلد ہی قریبی ہسپتال کا ہیلی کاپٹر آ پہنچا۔ چونکہ وہ پتھریلا علاقہ تھا لہٰذا وہاں اترنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ چنانچہ پاملا کو تار سے بلند کر کے اوپر پہنچایا گیا۔ یہ آخری کٹھن مرحلہ تھا جو بخیر و خوبی مکمل ہوا۔ تب ہیلی کاپٹر ۱۵۰ر فٹ اوپر فضا میں منڈلا رہا تھا۔
ہیلی کاپٹر میں موجود ڈاکٹر بن سوجیلی نے تھکن سے نڈھال پاملا کو تسلی تشفی دی اور پوچھا ''تم ٹھیک ہو؟''
یہ سنتے ہی دورِ ابتلا میں گرفتار لڑکی پہلی بار ضبط کا بندھن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی اور زار و قطار رونے لگی۔

☆☆

ٹام سلکی، پاملا تک پہنچنے والے نوجوانوں میں شامل تھا۔ وہ بتاتا ہے ''مجھے نہیں معلوم کہ اگر ہم اس تک نہ پہنچتے، تو وہ کیا کرتی۔ دراصل کچھ دور آگے جا کر لنڈے کریک ۱۰۰ر فٹ بلند آبشار میں بلند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پاملا کو پھر وہیں رکنا پڑتا۔ مجھے تو شدید حیرت ہے کہ ٹوٹی ہڈی لیے اور رسیوں و دیگر ساز و سامان کے بغیر اس نے چشمے کا دشوار گزار راستہ طے کیسے کر لیا۔ اس کی داستان نے یقیناً انسانی عزم و ہمت کا نیا باب رقم کیا ہے۔''
ہسپتال پہنچ کر پاملا نے سب سے پہلے ایرک کو فون کیا۔ وہ ابھی تک بیئر لیک کے کنارے ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ وہ امدادی ٹیموں کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتا تھا۔ فون سنتے ہی وہ بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچ گیا۔ جب ان کی ملاقات ہوئی، تو آنکھیں بھی بھیگ گئیں اور وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بیٹھ گئے۔

☆☆

پاملا ۲ر ہفتے ہسپتال میں زیرِ علاج رہی۔ گھٹنا ٹوٹنے کے علاوہ اُسے کمر میں بھی خاصی گہری خراشیں آئی تھیں۔ اُسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں ۶ر ماہ لگ گئے۔ جب وہ اپنے پیروں پر صحیح طرح کھڑی ہوئی، تو اس نے بیئر لیک کے کنارے خاندان بھر کی دعوت کی اور یوں اپنی صحت یابی کا جشن منایا۔ اس طرح ایک ننھی مگر بہادر لڑکی نے موت کو شکست دے ڈالی۔ ■

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ ایک جُملہ

ٹرین کی بوگی سے جڑے ایک باتھ روم کی تلاش کا قصہ
وہ ایک بُری یاد سے جڑ گیا تھا

نذیر انبالوی
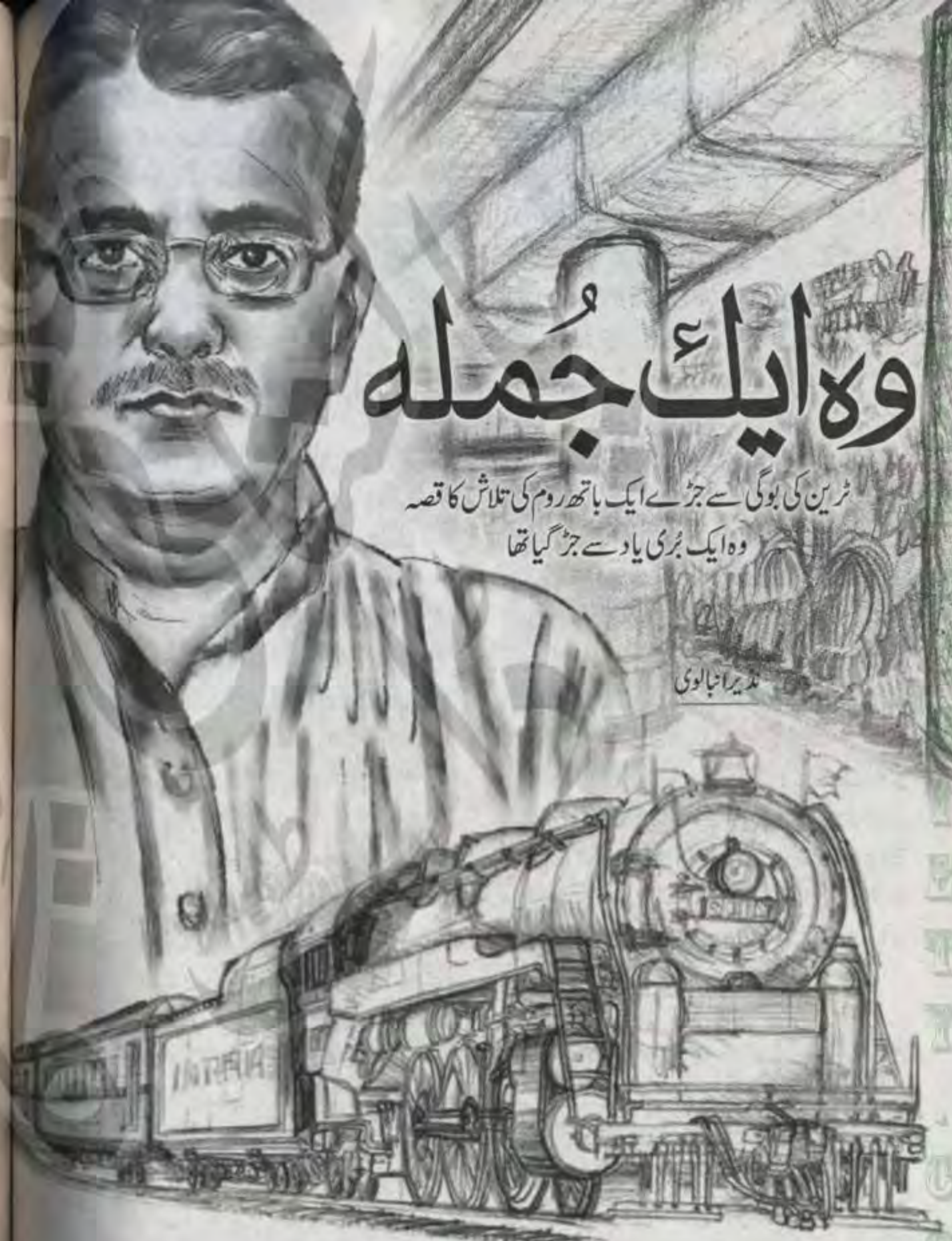
ایسے ایشوز پر کہانیاں کم ہی لکھی جاتی ہیں جن پر بات کرنے کو بھی دل نہ چاہے

اسٹیشن

کی گھڑی میں ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میں پلیٹ فارم نمبر ۴ر پر اپنے دوستوں محسن اور عبدالرحمن کا انتظار کر رہا تھا۔ راول پنڈی جانے والی ٹرین نے ۱۲ر بجے رات روانہ ہونا تھا۔ پونے بارہ بجے عبدالرحمن اور محسن دائیں طرف کی سیڑھیاں اتر کر میرے سامنے موجود تھے۔ دونوں مجھے گرم جوشی سے ملے۔ ۵ر منٹ بعد راولپنڈی جانے والی ٹرین پلیٹ فارم نمبر ۴ر پر کھڑی تھی۔ ہم نے ایک دن پہلے ہی بکنگ کرا لی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم اپنے مطلوبہ ڈبہ میں موجود تھے۔ ٹرین مقررہ وقت پر روانہ ہوئی۔ ہم تینوں دوست بچوں کے ادب کے حوالہ سے ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ اِدھر ٹرین چلی اُدھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ انہی باتوں میں مشروب اور چائے کا دور چلتا رہا۔ صبح ۶ر بجے ٹرین راولپنڈی پہنچی۔

ایک مقامی دوست کے ہاں کچھ دیر قیام کے بعد ہم نیشنل لائبریری میں انعقاد پذیر کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے۔ تمام دن وہاں گزارنے کے بعد واپسی کا قصد کیا۔ رات گئے ہم لاہور واپس آ گئے۔ ۲۴ر گھنٹے کی تھکاوٹ کے باعث جلد نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ صبح بہت مشکل سے آنکھ کھلی۔ ۷ر بجے ہاتھ منہ دھو کر ناشتا کر کے سکول چلا گیا۔ دماغ ابھی تک بوجھل تھا۔ اسمبلی میں بڑی مشکل سے وقت گزرا۔ اسمبلی کے بعد میں اپنے کمرا میں آیا ہی تھا کہ نائب قاصد رشید نے آ کر بتایا کہ پرنسپل صاحب بلا رہے ہیں۔

''پرنسپل صاحب اس وقت کہاں ہیں؟''

''اپنے آفس میں ہیں۔'' رشید بولا۔

''چلو میں ابھی آ رہا ہوں۔''

''مبارک صاحب کانفرنس کیسی رہی؟'' کفایت اللہ نے کمرا میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''کانفرنس بہت اچھی رہی ہے، وہاں بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے، تم یہاں بیٹھو میں پرنسپل صاحب کے آفس جا رہا ہوں۔''

پرنسپل سے اجازت لے کر میں آفس میں داخل ہوا تو انہوں نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''مبارک صاحب آپ ڈسپلن کمیٹی کے انچارج ہیں، میں ایک کیس آپ کو دے رہا ہوں۔ آپ نے اس کیس پر نہایت ہوشیاری اور خفیہ انداز میں کام کرنا ہے۔''

''سر! کیس کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس کے بعد پرنسپل صاحب نے کیس کی تفصیلات بتائیں تو مجھے ایک دم جھٹکا لگا۔ وہ بولتے جا رہے تھے اور میں گہری سوچ میں گم ہوتا جا رہا تھا۔

''مجھے اُمید ہے آپ اس کیس کو جلد حل کریں گے۔''

''جی...... جی...... سر!''

''کوئی اور بات جو آپ اس کیس کے حوالہ سے مجھ سے پوچھنا چاہیں تو ابھی پوچھ لیں۔''

''سر! میں اس کیس میں کسی اور استاد کو شامل کر سکتا ہوں؟''

''یہ کیس آپ نے اکیلے حل کرنا ہے۔''

''اوکے سر۔''

''مبارک صاحب! بہت شکریہ۔''

میں نے اِس کیس کے بارے میں اپنے کسی استاد سے بھی ذکر نہ کیا۔ تیسرے پیریڈ کے بعد میں نے کیس حل کرنے کے لیے غور کیا تو میں اُلجھتا ہی چلا گیا۔ آنکھوں کے سامنے راولپنڈی جانے والی ٹرین گردش کرنے لگی۔ رات ۱۲ر بجے میں پلیٹ فارم نمبر ۴ر پر موجود تھا۔ کل رات جس بوگی میں سفر کیا تھا اس میں داخل ہوا۔ میرے قدم اب باتھ روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ باتھ روم کا دروازہ کھولا تو مجھے پتا چلا کہ میں غلط بوگی میں سوار ہو گیا ہوں۔ ٹرین چلنے والی تھی اس لیے میں تیزی سے ایک سے دوسری بوگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آخر ٹرین روانہ ہو گئی اور میں اپنی مطلوبہ چیز نہ دیکھ سکا۔

دوسرے دن پرنسپل صاحب مجھے برآمدہ میں مل گئے۔

''جی مبارک صاحب کیس کا کیا بنا ہے؟''

''سر! میں چھان بین کر رہا ہوں۔ میں اس طالب علم کو ضرور تلاش کر لوں گا جس نے یہ بُری حرکت کی ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اس کیس کو جلد از جلد حل کرنا ہے۔ کیس کو لٹکائیے گا مت۔"

"سر......! ایسا نہیں ہوگا۔"

شام ۴ر بجے میں دوبارہ پلیٹ فارم نمبر چار پر کھڑا راولپنڈی سے آنے والی ٹرین کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹرین مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ تاخیر سے آئی۔ مسافر ڈبوں سے اتر رہے تھے اور میں مختلف ڈبوں کے باتھ رومز میں جھانک رہا تھا۔ مجھے جس باتھ روم کی تلاش تھی وہ مجھے نہیں مل رہا تھا۔ میں ایک بوگی سے اُترنے لگا تو سفید کپڑوں میں ملبوس ٹی ٹی میری طرف بڑھا۔ اس کی شرٹ پر مظہر کے نام کا بیج تھا۔

"آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟" مظہر نے سوال کیا۔ میں نے جب اُسے سب کچھ بتایا تو وہ بولا۔

"بوگیاں ہر روز تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔"

"آپ اس سلسلہ میں میری کچھ مدد کریں۔" میں نے التجا کی۔

"آپ یہ میرا کارڈ رکھ لیں جس ورکشاپ میں بوگیوں کی مرمت اور صفائی ستھرائی کی جاتی ہے اس میں جواد نامی ایک شخص ہوگا۔ میرا یہ کارڈ اس کو دے دینا آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

میں نے مظہر کا شکریہ ادا کر کے کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا اور سوچا کہ کل ضرور جواد کو ملنے ریلوے ورکشاپ جاؤں گا۔ سکول جا کر یہی دھڑکا لگا رہتا کہ ابھی پرنسپل صاحب کا بلاوا آ جائے گا۔ منگل کو سکول سے چھٹی کر کے میں ریلوے ورکشاپ پہنچا۔ انکوائری آفس سے جواد کے بارے میں معلوم کیا تو معلوم ہوا کہ دوپہر کے وقفہ سے پہلے یہاں کسی ملازم کو ملنے کی اجازت نہیں۔ جواد سے ملنا ضروری تھا اس لیے وہیں وقفہ کا انتظار کرنے لگا۔ آخر خدا خدا کر کے وقفہ ہوا تو ورکشاپ سے ورکرز کا جم غفیر باہر نکلا۔ انکوائری آفس والا میری مدد نہ کرتا تو میں جواد کو تلاش نہ کر سکتا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔

"جی فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"مجھے مظہر صاحب نے بھیجا ہے۔"

"کون مظہر؟"

"وہی مظہر صاحب جو راولپنڈی جانے والی ٹرین میں ٹی ٹی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے مظہر کا کارڈ جواد کو تھما دیا۔

"آپ کس سلسلہ میں مجھ سے ملنے آئے ہیں؟"

"مجھے ایک بوگی کی تلاش ہے۔"

"بوگی کی تلاش، کیا مطلب؟"

میں نے ساری بات سے جواد کو آگاہ کیا تو وہ بولا۔

"بوگی کی تلاش کرنا آسان کام نہیں ہے پھر بھی میں آپ کی مدد ضرور کروں گا۔ ورکشاپ میں کسی غیر متعلق آدمی کو جانے کی اجازت نہیں اس لیے میں ورکشاپ میں کھڑی بوگیوں کو چیک کر لوں گا۔ اپنا موبائل نمبر دے دیں۔ میں آپ کو اطلاع کر دوں گا۔"

شام کے وقت جواد کا فون آیا کہ مجھے جس بوگی کی تلاش ہے وہ ورکشاپ میں نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پرنسپل صاحب ۳ر دن کی چھٹی پر نہ ہوتے تو میری پریشانی مزید بڑھ جاتی۔ یہ ۳ر دن میرے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھے۔ میں مسلسل جواد سے رابطہ میں تھا۔ ۳ر دن گزر گئے، نہ تو میری مطلوبہ بوگی ملی اور نہ پرنسپل صاحب کی طرف سے دیا کیس حل ہوا۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اسمبلی کے فوراً بعد پرنسپل صاحب کا بلاوا آ گیا۔

"آپ نے اس طالب علم کو ضرور تلاش کر لیا ہوگا جو سکول کے باتھ رومز میں نازیبا کلمات لکھتا ہے۔"

"میں ایسا نہیں کر سکا۔"

"مگر کیوں؟"

"میں اس کا جواب ابھی نہیں دے سکتا۔"

"آخر معاملہ کیا ہے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں وقت آنے پر آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

"وہ وقت کب آئے گا؟"

"سر! بہت جلد...... بس مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں۔"

پرنسپل صاحب نے پہلی بار میری کوئی بات مانی تھی۔ اجازت ملتے ہی میں نے بوگی کی تلاش تیز کر دی تھی۔ اب راولپنڈی جانے والی ٹرین کے ساتھ ساتھ دُوسری ٹرینوں میں بھی میں نے بوگی کو تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ بوگی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اب تو ریلوے اسٹیشن کے ملازمین میری شکل سے آشنا ہو گئے تھے۔ میرے لیے روز اسٹیشن آنا ممکن نہ تھا اس لیے میں نے ایک قلی سے اس سلسلہ میں بات کی تو وہ فوراً بولا۔

"میں یہ کام کر تو دوں گا مگر اس میں میرا وقت لگے گا۔"

"تمھیں وقت کا معاوضہ ملے گا۔"

"کتنا معاوضہ دو گے؟" قلی کاروباری انداز میں بولا۔

"اگر تم میری مطلوبہ بوگی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو تمھیں ۵۰۰ر روپیہ انعام دوں گا۔"

"اور معاوضہ۔"

"وہ الگ سے ملے گا۔"

میں ہر قیمت پر بوگی کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے قلم سے لکھے جانے والا ایک جملہ مجھے اس قدر پریشان کرے گا۔ چلتے پھرتے، سوتے جاگتے وہ جملہ میرا تعاقب کرتا۔ وہ جملہ میری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگا تھا۔ جملہ مسکرا مسکرا کر میرا مذاق اڑاتا تھا۔

"مت ہنسو ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

"میں تو ہنسوں گا...... ہنسوں گا اور خوب ہنسوں گا۔"

"اے اللہ میری خطا معاف کر دے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے ٹرین کے باتھ روم میں ایک نازیبا جملہ لکھ کر بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ اب بہت سے لوگ میرے جملہ کا جواب لکھیں گے اور پھر یہ سلسلہ چل نکلے گا۔ اے اللہ مجھے معاف کر دے۔ مجھے معاف کر دے، تُو معاف کرنے والا ہے۔" شاید یہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ صبح کے وقت جواد نے فون کر کے مجھے بتایا کہ میری مطلوبہ بوگی مل گئی ہے۔

"بوگی کہاں ہے؟"

"وہ بوگی ریلوے ورکشاپ میں کھڑی ہے اور کچھ مرمت کے بعد کراچی جانے والی ٹرین میں لگا دی جائے گی۔"

"کراچی کی ٹرین کب روانہ ہوگی؟"

"۴ر بجے۔"

"آپ نے وہ جملہ پڑھا ہے۔"

"جی۔" جواد نے جواب دیا۔

اب میرے اور ٹرین کے باتھ روم میں لکھے نازیبا جملہ کے درمیان ۴ر گھنٹے کا وقت حائل تھا۔ میں نے بہت مشکل سے یہ وقت کاٹا اور ۴ر بجے سے پہلے ہی پلیٹ فارم نمبر ۳ر پر کراچی جانے والی ٹرین میں بوگی تلاش کر رہا تھا۔ جب بوگی مل گئی تو میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس میں داخل ہوا۔ میں نے ایک جھٹکے سے باتھ روم کا دروازہ کھولا تو میرا لکھا ہوا جملہ مجھے دیکھ کر میرا مذاق اڑانے لگا۔ میرے جملہ کے جواب میں کئی اور جملے بھی لکھے جا چکے تھے۔ ان جملوں کو پڑھ کر میں شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا تھا۔

"میں آج تم سب کو مٹا ڈالوں گا...... تم سب کو ختم کر دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے موٹے سیاہ مارکر سے سب نازیبا جملوں کا خاتمہ کر دیا۔ ان جملوں کو مٹاتے ہوئے میری زبان پر "شکر الحمدللہ" کے الفاظ تھے۔

دُوسرے دن پرنسپل صاحب میرے کیس حل نہ کرنے کی وجہ جان کر بولے۔

"مجھے کیس حل نہ کرنے کی وجہ جان کر خوشی ہوئی ہے۔ ایسی سوچ کسی اچھے انسان ہی کی ہو سکتی ہے۔ انسان جو بُرا عمل خود کر رہا ہو اگر وہ اس عمل سے دُوسرے کو روکے تو اس کی باتوں میں تاثیر نہیں ہوتی۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ آپ نے جیسے اپنے لکھے ہوئے نازیبا جملے مٹائے ہیں اسی طرح جلد ان طالب علموں کو بھی تلاش کر لیں گے جو سکول کے باتھ رومز میں ایسے جملے لکھتے ہیں۔ آپ سمجھائیں گے تو آپ کی باتوں کا ان کے دلوں پر اثر ہوگا۔"

پرنسپل صاحب کی باتوں سے مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کیس حل کر لیا ہو اور سکول کے باتھ رومز کی دیواروں سے گندے اور نازیبا جملے اس طرح صاف کر دیے ہوں جیسے وہاں کبھی کسی نے کچھ لکھا ہی نہ ہو۔ ■
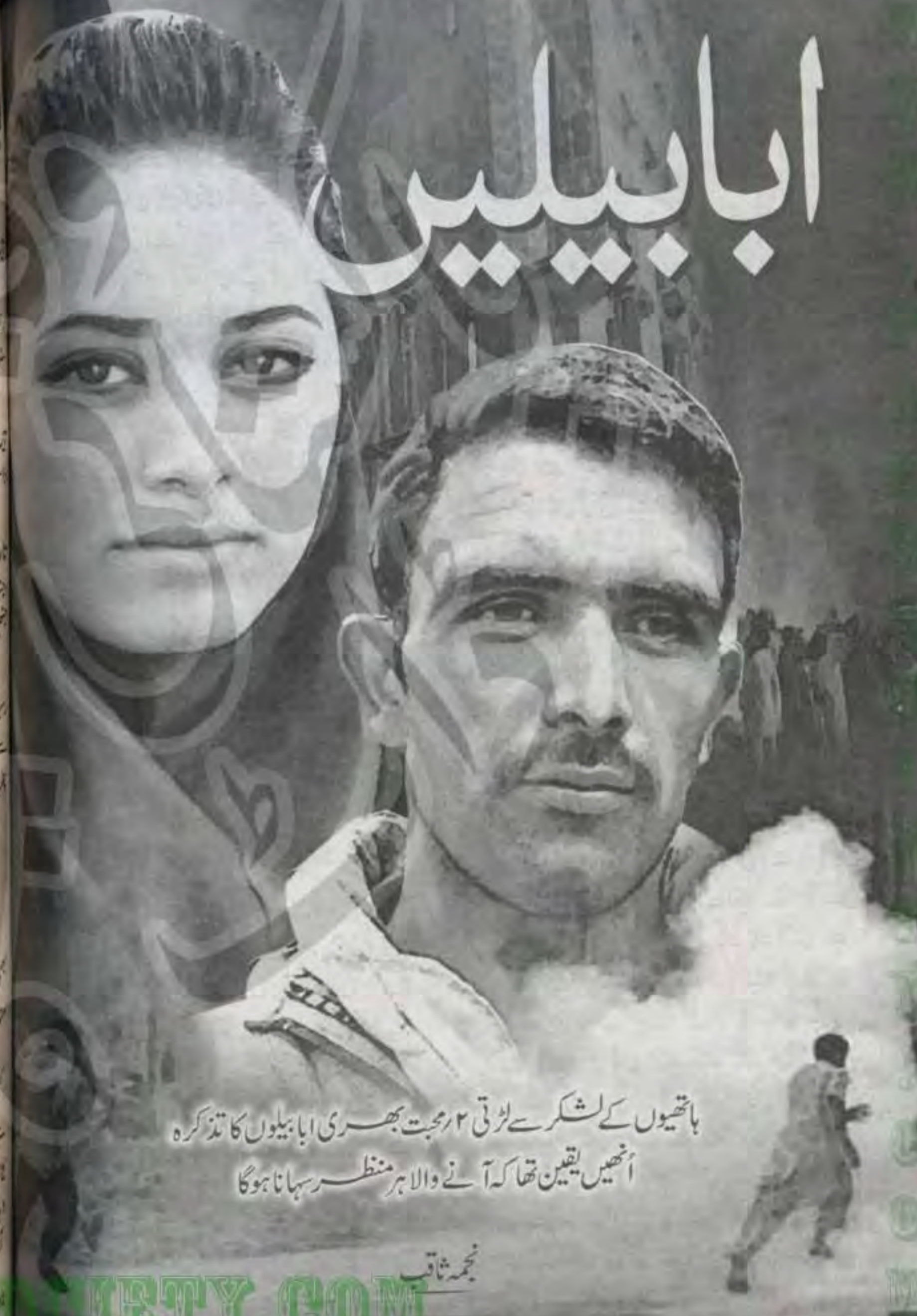
WWW.PAKSOCIETY.COM

کون لوگ ہیں؟ کدھر کو جاتے ہیں؟ جبکہ ان کی جبینوں کا نور ان کی پیشانیوں سے ڈھلکا جاتا ہے۔

یہ مہر و ماہ کی ٹکڑیاں جُوے خاک بسر وجود کس کے ہیں؟

کہ جن پر خوشبو یوں لپکتی ہے گویا بدن صندل کے ...ے گندھے ہوں اور نقشین اطلس و دیبا سے انھیں سنوارا گیا ہو۔

شاخ وقت سے اُترے یہ پتی پتی بکھرے گلاب کیسے ہیں؟ جن کی ہر ہر پنکھڑی پر تتلیوں نے وفا کی وہ ان کہی داستانیں کاڑھی ہیں جنھیں کہنے کی نطق کو تاب نہیں۔

یہ صدیوں پُرانے وہ ان چھوئے نوشتے ہیں جنھیں تاریخ کی کہنہ دیمک نے چاٹ لیا ہے۔ جن پر اپنوں کی اجنبیت، بے گانگی اور بے حسی کی دبیز تہہ جم گئی ہے اور جنھیں اب صرف اہلِ دل ہی پڑھ سکتے ہیں۔

احسن عزیز نے دم رخصت دنیا کو کس زور سے ٹھوکر رسید کی ہوگی؟ عذرا کی پلکوں پر ہمیشگی کے خواب کس شدت سے لرزے ہوں گے؟ احسن کے بدن سے خوشبو کی ...ری کیسے گزری ہوگی؟

اور عذرا کے لبوں پر نازکی کا خرام کیا ہوگا؟

میں کیا جانوں؟

میں جو بونوں کی بستی میں رہتی ہوں۔

اُس مقام کا ادراک کیسے پاؤں۔ جہاں فرشتوں کے ...بھی پر جلتے ہیں۔ میرے ذہن کے دھندلے افق پر کچھ ...مگر کھٹا کھٹ اُبھر رہے ہیں۔

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کا اولڈ گرلز کیمپس ہے۔ کینٹین کے سامنے گڑے سنگی بنچوں پر ایک نوخیز لڑکی بیٹھی ہے۔ اُسے جامعہ میں آئے چند ہی دن ہوئے ہیں۔ مگر یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ عرصہ سے یہاں آ رہی ہے۔ میں وہاں سے شاید کنی کترا کر گزر جانا چاہتی ہوں۔ مگر ایک آواز میرے قدموں کو زنجیر کرتی ہے۔

نجمہ باجی! آج چھٹی کلاس کے بعد ہال میں درسِ قرآن ہے۔ آپ کو زہرا باجی نے بتایا تھا ناں؟

ہاں مجھے یاد ہے۔ مجھے کہنا پڑتا ہے۔

باقی لوگوں کو بھی بتا دیجیے گا۔ گویا مجھے شرکت کا پابند بنایا جا رہا ہے۔

میں سر ہلا کر آگے بڑھ جاتی ہوں۔

پھر اگلا منظر اُبھرتا ہے۔

میں زہرا ترابی کے ساتھ اُس کی گاڑی میں لاہور سے واپس آتی ہوں۔ رات ہوسٹل میں جانے کے بجائے اس کے گھر واقع ۱/۱۰ میں ٹھہر جاتی ہوں۔ صبح عذرا مجھے بروقت جگاتی ہے۔

جلدی تیار ہو جائیے ورنہ بس نکل جائے گی۔

میں اُس کے ہاتھوں کا بنا ناشتہ کرتی ہوں۔ وہ مجھ سے باتیں بھی کر رہی ہے اور ساتھ ساتھ کمرے کی چیزیں بھی ٹھیک کرتی جاتی ہے۔

''تم نہیں جاؤ گی؟'' میں پوچھتی ہوں۔

''نہیں۔ امی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ زہرا باجی کو لے جائیے۔ میں گھر پر ٹھہر جاتی ہوں۔''

پھر ایک اور منظر کھٹ سے سامنے آتا ہے۔

یہ ایک درمیانہ درجہ کا شادی ہال ہے۔ شام کا وقت ہے۔ پروفیسر الیف الدین ترابی کے بڑے بیٹے کی دعوت ولیمہ ہے۔ احباب جمع ہیں۔ یونیورسٹی سے عذرا اور زہرا کی مشترکہ سہیلیاں بھی مدعو ہیں۔ ماحول پر مجموعی طور پر سادگی کا تاثر ٹھہر گیا ہے۔

ہم ایک طرف بیٹھے آنے جانے والوں پر تبصرے کر رہے ہیں۔

عذرا اور زہرا خدیجہ باجی کی نسبت زیادہ سادہ ہیں، کسی نے کہا تھا۔

عائشہ کو بھی جیولری وغیرہ سے دیگر لڑکیوں کی طرح خاصی دلچسپی ہے۔ قریب سے ایک اور آواز آتی ہے۔

عذرا مسکراتی ہوئی ہماری طرف آتی ہے۔

اپنے مخصوص انداز میں عینک ناک پر ٹکائے وہ ہم

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

سے استفسار کر رہی ہے۔
"آپ لوگ ٹھیک بیٹھے ہیں ناں؟ کوئی مسئلہ تو نہیں؟"
اور یہ ایک آخری تصویر جیسے چوکھٹے پر ٹھہر گئی ہے۔ یونیورسٹی ہی کا سبزہ زار ہے۔ ہمجولیوں میں کھسر پھسر ہو رہی ہے۔
"عذرا کی شادی ہے۔"
"ایں! اتنی جلدی......؟ ابھی تو اس کا پہلا سال بھی مکمل نہیں ہوا۔"
"بھئی ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے۔" یہ میں نے زہرا سے کہا تھا۔
"ہاں۔ مگر ابو نے ہم دونوں کے رشتے طے کر دیے ہیں۔ شادی بھی جلدی ہوگی۔ تم نے فلاں فلاں لڑکی کا عبایا دیکھا ہے ناں۔ ہم جہیز میں اُسی طرح کے عبایا سلوانا چاہتی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"
مگر میری توجہ زہرا سے زیادہ اُن بھنبھناہٹوں پر لگی ہوئی تھی جو عذرا کی خوش قسمتی کے تذکروں سے لتھڑی رشک کے جذبوں سے لبریز تھیں۔
"عذرا کی شادی احسن عزیز سے ہو رہی ہے۔"
"احسن عزیز......؟؟"
"ہاں ہاں نوشابہ عزیز کا بھائی۔"
"ارے یہ وہی احسن عزیز تو نہیں جو نظمیں کہتا ہے؟"
"اچھا اچھا۔ میرے ایمان کے ساتھی والی دلپذیر نظم کا خالق احسن عزیز۔"
"بھئی اس کی کتاب ہم نے پڑھی تو تھی۔ کیا بھلا سا نام ہے۔"
"تمھارا مجھ سے وعدہ تھا۔"
اور ہم میں سے سب سے زیادہ خوش الحان اکثر اونچی آواز میں گنگنایا کرتی تھی۔

مرے ایمان کے ساتھی!
تجھے تو یاد ہی ہوگا
کہ ہم نے مصحفِ قرآن میں سورہ دہر پڑھ [illegible]
اِس بستی کے نقشوں کو ان آنکھوں سے تلاشا [illegible]
کبھی نے تو کہا تھا ہاں
کبھی سرما کی راتوں میں
محاذوں پر بھی جاؤ گے
تم اس جنت کے چشموں کو ان آنکھوں میں بساؤ [illegible]
اندھیری رات جب آئے
تو سرِ مشعل بناؤ گے

پھر عذرا بی اے ادھورا چھوڑ کے چلی گئی اور سارے مناظر ایک ایک کر کے ساکت ہوتے گئے۔ ذہنی الجھ [illegible] کٹے رابطوں، نادیدہ مصروفیتوں، زمینی دوریوں اور بے حسیوں کی گدلی گدلی دُھند چھاتی رہی اور میری زندگی کے ۱۵ ر خوبصورت برسوں کو کھا گئی۔
دیوسائی کی سی اس ٹھنڈی دھند میں راستہ اس دن بنا جب عید سے چوتھے روز میرے فون پر ایک پیغام روشنی کی لکیر بن کر جگمگا رہا تھا۔
"عزیز بیٹی عذرا ترابی شہید اور عزیز بیٹے احسن [illegible] شہید کی غائبانہ نمازِ جنازہ ۱۰/۱ کی مسجد سلمان فارسی [illegible] بعد از نمازِ جمعہ ادا کی جائے گی۔ اللہ شہادت قبول فرمائے۔"
اور میرا ہاتھ خودکار مشین کی طرح فون کے بٹنوں [illegible] دباتا چلا گیا۔
عذرا کے والد، کشمیر المسلمہ کے ایڈیٹر پروفیسر الیف الدین ترابی...... وہ بوڑھا شیر...... جس کی [illegible] کشمیر میں باطل سے نبرد آزما جہادی قوتوں کی آبیاری [illegible] گزر گئی۔ جس کا ہاتھ جنگ کی مہیب بھٹیوں میں [illegible] جھلسے جوانوں کے سروں پر دستِ شفقت بنا رہا۔ جس [illegible] اپنے قلم کی نوک سے اُن کی راہوں میں بکھرے [illegible] مغیلاں کو ایک ایک کر کے چُنا اور نتیجہ میں وہ [illegible] نوحے اپنے دلِ فگار میں اُتار کر کسی متاع کی طرح [illegible] بیٹھا ہے۔ جو کشمیر کاز کو سبوتاژ کرنے والوں کے گرسنہ [illegible] اور اندھے مفادات سے عبارت ہیں۔
وہ اس وقت بیٹی کی قربانی پر حوصلہ کی سنگی چٹان [illegible]

[illegible] لوگوں کے لیے "پہاڑی کا چراغ" ہے۔ جس کی [illegible] ٹھنڈی روشنی میں اب عذرا کے لہو کا دیا جلتا ہے۔
عذرا کی ماں...... آج سے نہیں...... سالہا سال سے [illegible] کی مریضہ ہے۔ جس کا میکہ اس سے اُس وقت بچھڑا [illegible] اس نے شوہر سے وفا کا رشتہ قائم رکھتے ہوئے خونی [illegible] کو عبور کیا تھا۔ مقبوضہ کشمیر میں اُس کے خون کے [illegible] بندھن بیوہ کی آہوں کی طرح اُس سے آن ملنے کو [illegible] لاتے ہیں اور وہ جُدائی کی دہلیز پر کھڑی اپنی ساری [illegible] کو کسی سوغات کی طرح باندھے آنے جانے والوں [illegible] عذرا کا وہ آخری خط بانٹ رہی ہے جس میں اُس نے [illegible] آزمائش پر صبر اور اللہ سے جڑے رہنے کی تاکید کے ساتھ [illegible] دعائیں لکھ کر بھیجی ہیں۔ جو ہاتھ میں تسلی اور صبر کی لاٹھی [illegible] تھماتی ہیں۔
اُسے وطن سے دور، گولہ بارود کی بدبو میں، خاک [illegible] اُڑاتے مٹی کے بگولوں کے درمیان ماں کا خیال ہے۔ [illegible] اس جدائی کا ملال نہیں جو اس نے اپنی مرضی سے اپنا [illegible] قصد کی ہے۔ ہاں ماں کا صبر اور اس کے نتیجہ میں ملنے والا [illegible] کا اجر اُسے یاد ہے۔
ماں کا خیال تو اس وقت سے اس کے لہو میں رچا تھا [illegible] جب اس نے ہوش کی آنکھوں سے پہلی مرتبہ اُس کا چہرہ [illegible] تھا۔
جب پہلی مرتبہ اس کا وجود ماں کی گرم گود میں ہمکا تھا۔
بڑے بھائی بچپن میں کہتے۔
"چلو بھئی! کون کون آئس کریم کھانے چلے گا؟"
سب جھٹ میں تیار ہو جاتے۔
اور عذرا کہتی۔
"میں امی جان کے پاس رہتی ہوں۔ وہ اکیلی ہیں [illegible]"
بہنیں اگلی مرتبہ پر کہتیں۔
"اب ہم میں سے کوئی رُک جاتا ہے۔ اب کی بار تم [illegible] جاؤ۔"
[illegible] وہ [illegible] کے رہنے پر مصر رہتی۔ امی کو اکیلا چھوڑنا
اُسے منظور نہ تھا۔
پڑھائی کے دوران گھر کے کام کاج سے کبھی غافل نہ رہی کہ امی پر بوجھ نہ پڑے۔ بلکہ وہ تو اکثر دوسری بہنوں کے حصے کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا کرتی اور اکثر اپنی ضروری اسائنمنٹس اس چکر میں لیٹ کر دیتی۔
میں بارہا اس پر چڑا کرتی تھی۔
"پڑھائی پہلی ترجیح ہونی چاہیے۔"
اور زہرا اس کی ڈھال بن کر کہتی۔
"امی بیمار رہتی ہیں ناں۔ گھر میں بہت کام ہوتا ہے۔ مہمانوں کا آنا جانا اور ابو کا حلقۂ احباب۔ عذرا لگی ہی رہتی ہے۔"
اُسے احسان کرنا مرغوب تھا۔ پھر یہ رغبت اُس کی عادت بن گئی۔ ایسی عادت جو مُنہ سے لگی چھٹتی نہیں۔ حتیٰ کہ شادی کے بعد اپنا جہیز سسرالی رشتہ داروں میں بطور تحفہ بانٹ دیا۔

سفارش

مشہورِ زمانہ ادبی رسالہ "ساقی" کے مدیر شاہد احمد دہلوی کے پاس ایک نئے شاعر نے ایک مشہور شاعر کے سفارشی خط کے ساتھ ایک غزل اشاعت کے لیے بھیجی۔ شاہد احمد دہلوی نے جواباً لکھا "آپ کی غزل تو اچھی ہے لیکن جن صاحب سے آپ نے سفارشی خط لکھوایا ہے، اُن کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں ہے، لہٰذا غزل واپس کر رہا ہوں۔"

(علی اعجاز نظامی، ملتان)

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

ایک نند سے کہا۔
''باجی! آپ یہ صوفہ لے لیجیے۔''
دوسری سے کہا۔
''یہ بیڈ آپ کا ہوا۔''
کسی کو کچھ پکڑا دیا اور کسی کو کچھ اور۔
سب ششدر ہیں۔ حیران ہو ہو پوچھتے ہیں۔
''ارے پاگلو! تم لوگ کہاں سوؤ گے؟ کہاں بیٹھو گے؟ کیا استعمال کرو گے؟''
تو ہنس کے بولی۔
''ہم نیچے سو جائیں گے۔ مجھے اور احسن کو زمین پر بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔''
پھر سب کچھ دے دلا کر، راہِ خدا میں لٹا کر اس اللہ کی بندی نے زمین بچھائی اور آسمان اوڑھنا شروع کر دیا۔

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

شوہر نے اپنے لیے کانٹوں بھرا راستہ چنا تو اسے پھولوں کا بستر سمجھ کر اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ ان کی جوڑی دیکھ کر ''**الطیبات للطیبین والطیبین للطیبات**'' کی عملی تفسیر سمجھ میں آتی ہے۔

سفر میں، حضر میں، گھر میں، ٹارچر سیل میں ہر جگہ اُس کا عملی تعاون احسن بھائی کے لیے حضرِ راہ رہا۔

احسن بھائی روزگار کے پھندوں سے آزاد، فنافی اللہ تھے۔ عذرا بھرے پُرے سسرال میں رہتی تھی۔ میکے آ کر کبھی کسی محرومی کسی تنگی کا کوئی شکوہ اُس کے لبوں پر نہیں آیا۔ اپنا سارا زیور خواہ میکہ تھا یا سسرال سے، شادی کے بعد جلد ہی راہِ خدا میں دے دیا۔ ماں نے ہلکی پھلکی چیزیں دوبارہ بنا کے دیں کہ ہر وقت پہنے رکھو، وہ بھی دے دیں۔

پھر ماں جیسی ساس نے ہلکا زیور بنوا کر دیا وہ بھی لٹا دیا۔

دنیا سے بے رغبتی اور خدا پر بھروسہ کا یہ عالم کہ [illegible] عمری میں شوہر کے لاپتا ہو جانے پر کسی نفسیاتی عارضہ [illegible] شکار نہیں ہوئی، نہ ذہنی بے سکونی سے واسطہ پڑا۔

جب نادیدہ ہاتھوں نے احسن عزیز کو اُٹھایا تو اس [illegible] اپنا دل اللہ اور قرآن (جو اُس کے سینے میں بچپن سے محفوظ تھا) کے بعد اپنی ساس سے لگا لیا۔ وہ بوڑھی اور کمزور عورت ہڈیوں کے ٹیڑھے پن کی بیماری میں مبتلا ہو چکی تھی۔ اُن کی خدمت عذرا کا شعار بن گئی۔ وقت پر انھیں دھوپ میں بٹھانا، اُن کی مالش کرنا، اُن سے باتیں کرنا، اُن کی قلبی تشفی کرنا یہ سب عذرا کا معمول تھا۔

پھر اُن کی یادداشت چلی گئی اور وہ ہر بات بھولنے لگیں۔ ابھی عذرا سے دلیہ کی فرمائش کی ہے وہ بنا کے لائی تو بگڑنے لگیں۔

''لو بھلا! اب میں ہر وقت دلیہ ہی کھاتی رہوں [illegible] کچھ نہ کھاؤں؟ مجھے تو حلوہ کھانا ہے۔''

تو عذرا بغیر تیوری پر بل لائے حلوہ بنانے چل دی۔ اور جب عذرا چلی گئی تو وہ اُسے یاد کرتی تھیں۔ آنے جانے والوں سے پوچھا کرتیں۔

''عذرا کب آئے گی؟ اُس نے تم سب سے بڑھ کر میری خدمت کی ہے۔ تم سب مل کر بھی اُس کی برابری نہیں کر سکتیں۔''

حتیٰ کہ وہ احسن عزیز، جس نے اُن کی کوکھ سے جنم لیا تھا، وہ جو لیفٹیننٹ کمانڈر عبدالعزیز کے بڑھاپے کی لاٹھی اور آنکھوں کا نور تھا۔ وہ جو لفظوں کا کھلاڑی تھا۔ جس [illegible] ان ساری آرزوؤں کو لفظوں میں انڈیلا کرتا تھا جو [illegible] رب کے دیدار سے عبارت تھیں اور اس کے چہرے [illegible] میں ہمکتی رہتی تھیں۔

وہ صالح نوجوان جس کی رگوں میں اپنے خالق [illegible] وفا لہو بن کر دوڑا کرتی تھی۔ جو قرآن کا قاری بنا [illegible] کی بھٹی میں داخل ہوا اور حافظ بن کر لوٹا۔ اس سعادت [illegible] مند بیٹے کو یادداشت کا بگاڑ فراموش کر بیٹھا۔

[illegible] یادداشت کی گٹھڑی کھنگالنے پر احسن کے نام کی مٹھی بھر [illegible] بھی نہ نکلتی۔ مگر عذرا انھیں تب بھی یاد تھی۔ وہ عذرا [illegible] کئی ماہ بعد شوہر کی گھر آمد پر ساس کے کہنے پر، شوہر [illegible] اپنی چارپائی ان کے کمرے میں بچھا لیتی کہ انھیں [illegible] کی عادت ہو گئی تھی اور اب اس کے بغیر انھیں نیند نہ آتی تھی۔

جب احسن عزیز نے اپنے آپ کو مکمل طور پر محاذوں کے حوالے کر دیا تو عذرا کی نند نوشی باجی نے کہا۔

عذرا! تم اگر چاہو، تو آزاد ہو سکتی ہو۔ احسن تو اب آئے گا نہیں۔ تم اپنی زندگی کیوں لٹاتی ہو۔

تو عذرا نے فوراً یہ بات رد کر دی۔

اگر احسن مجھے چھوڑ دیتے، تو مجھ پر کیا بیتتی۔ میں تو احسن کو کبھی نہ چھوڑوں گی۔

اور ٹھیک ایک سال بعد وہ اُس کے ہمراہ وہاں سدھار گئی۔ جہاں سے انھیں اکٹھے جنتوں کے سفر پر نکلنا تھا۔

۶ رسال..... ۶ رسال پر محیط ایک طویل عرصہ عذرا [illegible] احسن نے اکٹھے گھر اور گھر کی آسائشوں سے دور، کچے [illegible] اُڑاتے گھروندوں، وحشی امریکیوں کے ڈرون حملوں، خاک اور خون کی بارشوں میں دل کی پوری آمادگی اور رب کعبہ کے لیے خود سپردگی کے ساتھ اس عالم میں گزارا کہ رونقوں بھری دنیا سے اُن کا رابطہ کبھی کبھار کاغذ کے کسی ٹکڑے کے ذریعہ ہوتا تھا۔

حتیٰ کہ وہ وقت آ گیا جب ربِ عظیم نے ان کی قربانی قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''اور بے شک اللہ محسنوں سے ہی قبول فرماتا ہے۔'' (القرآن)

رمضان المبارک کا آخری روزہ اور افطار کا وقت [illegible]۔ عذرا اور احسن کے ہاتھوں میں کھجور کا ایک ایک ٹکڑا [illegible]۔ ایک مہربان پانی لا رہا ہے کہ گرد و غبار کا ایک طوفان [illegible] کرنے اور پینے والوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ [illegible] ساتھ چھوڑا ہے۔ ایک زوردار دھماکا کی آواز آتی ہے۔

کھجوروں والے معلق ہاتھ گھائل ہو کر نیچے آن گرتے ہیں۔ میں چشمِ تصور سے دیکھتی ہوں۔

شام کے لمبے سائے فضا میں اُڑتے جسموں کو دمِ رخصت کا بوسہ دیتے ہیں۔

مسجد کے میناروں سے نکلتی اللہ اکبر کی صدا قربان گاہ میں پھیل جاتی ہے۔

گھروں کو لوٹتے پرندے جانے والوں کو الوداعی سلام کہتے ہیں اور رب کا فیصلہ لکھ دیا جاتا ہے۔

عذرا ترابی اور احسن عزیز کا مادی وجود ابدی جنتوں کی طرف پرواز کر جاتا ہے۔

انھیں روزہ وہیں جا کر افطار کرنا ہے

علم بردار

یونیسکو کے ایک رپورٹ کے مطابق برٹش میوزیم کی کتابوں کی صحیح تعداد کسی کو معلوم نہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق وہاں ۵۰ رلاکھ کتابیں ہیں۔ وہ جن الماریوں میں رکھی گئی ہیں، اگر وہ الماریاں سیدھ میں کھڑی کر دی جائیں تو ۶۰ رمیل کی لمبائی تک جائیں گی۔ ۱۹۳۱ء میں ان کتابوں کی فہرست تیار کرنے کا کام شروع کیا گیا تھا۔ ۲۳ رسال کی متواتر محنت کے بعد اندازہ کیا گیا کہ یہ کام مکمل ہونے میں ۵۲ رسال لگیں گے۔ آج کل جس رفتار سے فہرست بن رہی ہے، اُسے دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام ۲۰۳۶ء تک مکمل ہوگا اور کتابوں کی الماریاں ۸۰ رمیل کی لمبائی تک پہنچ جائیں گی۔

(ساجد لطیف، لاہور)

WWW.PAKSOCIETY.COM

سفارش

ایک بات میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ غلطی کو کبھی اہمیت نہیں دینا چاہیے۔ یہ بہت معمولی چیز ہے۔ سب غلطیاں کرتے ہیں، بڑے بڑوں نے غلطیاں کی ہیں۔ اولیا اور پیغمبروں نے غلطیاں کی ہیں۔ غلطیاں بھی ترقی میں مد ہوتی ہیں۔ غلطیاں وہ کرتا ہے جو کچھ کرنا چاہتا ہے اور جو کچھ نہیں کرتا وہ غلطی نہیں کرتا۔"

(خرم عزیز، لاہور)

جہاں جگنو چمکتے ہیں
جہاں خوشبو کی برکھا ہے
جہاں عزت کی مسند ہے
جہاں آرام کے تکیے ہیں
جہاں رحمت کے سائے ہیں
جہاں پر سندس واستبرق و دیبا کی خلعت ہے
جہاں چاندی کے کاسے ہیں
جہاں حوروں کی بستی ہے
جہاں سونے کے کنگن ہیں
جہاں ہر چیز سستی ہے
جسے نہ آنکھ نے دیکھا
نہ کانوں سے سنا اُس کو

اور میں جو مادی مفادات کے کیچڑ میں لت پت کم ظرف بونوں کی بستی میں رہتی ہوں
میں کیا جانوں!
جنوں کیا ہے؟
پری کیا ہے؟
حدیثِ دلبری کیا ہے؟

میں کیا جانوں؟ کہ جب عذرا اور احسن عزیز کے جسم ٹکڑے ہو کر فضا میں اچھلے ہوں گے تو آخری لمحوں میں سرخروئی کا خواب کس طور ان کی آنکھوں میں اُترا ہوگا؟

اُس لمحہ ان کے دل کی کیفیت کیا ہوگی؟

احسن نے چلتے سمے دنیا کو کس زور سے ٹھوکر رسید کی ہوگی۔

عذرا کی پلکوں پر ہمیشگی کے خواب کس شدت سے لرزے ہوں گے۔ احسن کے بدن سے خوشبو کی پھوار کیسے گزری ہوگی۔ عذرا کے لبوں پر نازکی کا خرام کیا ہوگا؟ ابدی زندگی نے شہیدوں کے وجود پر کیسے تیشہ زنی کی ہوگی؟

اور فرشتوں کی منڈلی میں کھلبلی کس طور مچی ہوگی؟

میں کیا جانوں۔ یہ دیوانے لوگ کون ہیں؟

جو زمین بچھاتے اور آسمان اوڑھتے ہیں۔

جن کی جبینوں کے نور اُن کی پیشانیوں سے ڈھلے جاتے ہیں۔ جن کے خاک بسر لہو لہو وجود ایسے ہیں گویا صندل کے برادے سے گندھے ہوں۔

میری سماعتوں میں فقط احسن عزیز کی نظم بازگشت بن کر ڈوب ابھر رہی ہے۔

"ابابیلیں ہیں ہم
بس اس قدر ہی فرض ہے ہم پر
کوئی کنکر کوئی پتھر
ذرا ان ہاتھیوں کے لشکروں پر پھینک دیں اور پھر
افق کے پار جا پہنچیں
جہاں ساروں کو جانا ہے
حساب اپنا چکانا ہے
ہمیں لیکن وہاں جا کر
فقطِ زخمِ جگر اپنا
دِکھانا ہے
پھر اس کے بعد کی دنیا کا
ہر منظر سہانا ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

طاہر

کو یہ کارڈ ملے کوئی ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے اسے سیکڑوں مرتبہ پڑھا تھا۔ ہر وقت جیب میں پڑے رہنے کی وجہ سے اس میں بیسیوں شکن پڑ گئی تھیں۔ دفتر کے بڑے بڑے کہنہ رجسٹروں میں شرح پیدائش و اموات کی خانہ پُری کرتے ہوئے اس نے اکثر اس کارڈ کو بڑے آرام سے نکال کر پڑھا تھا اور بے خیالی میں ہر بار روشنائی کے دو تین دھبے اس پر گرا کر پھر جیب میں ڈال لیا تھا۔ آج بھی یہی کارڈ اس کی گود میں پڑا تھا۔ اس پر سیاہی کے دھبے اور تیل کے داغ تعداد میں حروف سے بازی لے گئے تھے۔

شور مچاتی، سڑک چاٹتی ہوئی بس پہاڑیوں پر چڑھ رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ میں نے کیڈٹ اجمل کی عمر کا جھوٹا سرٹیفکیٹ دیتے ہوئے جو ۱۰ر روپے کی رشوت لی تھی وہ جائز تھی یا ناجائز۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بس رکوا کر اتر جائے اور اپنے شہر جا کر میونسپلٹی کے سیکرٹری سے کہہ دے کہ میں نے ۱۰ر روپے رشوت لے کر جھوٹا سرٹیفکیٹ بنا دیا تھا۔ میرے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو دیگر رشوت لینے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو یہ سمجھا کر تسلی دے لی کہ یہ میری پہلی اور آخری رشوت ہی تو ہے۔ اس کے بعد نہ ایسا کارڈ آئے گا نہ میں ایسے جرم کا مرتکب ہوں گا اور پھر میں یہ ۱۰ر روپے تنخواہ ملتے ہی غریبوں میں تقسیم بھی تو کر دوں گا۔ کیا ہوا جو میں نے ایک امیر زادے سے چند روپے لے کر اس کا کام کر دیا۔ میں نے خود تو نہیں مانگے تھے۔ اس نے آپ ہی آپ میرے ہاتھ میں تھما دیے تھے۔ طاہر نے بانی کے کارڈ پر آخری نگاہ ڈالی اور پھر اسے اپنی اچکن کی جیب میں ڈال لیا جس میں ایک ایک روپے والے پانچ نوٹ پڑے تھے۔

غل مچاتی بس مری کی اُونچی پہاڑیاں چڑھ رہی تھی اور گہری سرسبز وادیوں میں سفید دھوئیں جیسے بادل اِدھر اُدھر بے مقصد تیر رہے تھے۔ طاہر نے ایک نظر ننھے منے جھونپڑوں والی عمیق وادی پر ڈالی اور پھر سامنے کے ٹیلے میں سے بل کھاتی کروٹیں بدلتی سرمئی سڑک کو دیکھنے لگا جو چند گز کے فاصلہ پر کسی پہاڑی کے قدموں سے لپٹ کر ختم ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ اب وہ مری سے صرف ۵ر میل دور رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ڈرائنگ روم کے دروازہ کو انگلی سے بجایا اور کندھے پر پڑے ہوئے کمبل کو ٹھیک کر کے انتظار کرنے لگا

بانی نے آ کر پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں، طاہر۔" اور اس کی آواز حلق میں ویزلین کے ملغوبے کی طرح جم گئی۔

بانی دروازہ کھولے بغیر نعیم کو آوازیں دینے لگی۔

"اِدھر آؤ نعیم۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ ابا جان کو پوچھنے آیا ہے۔"

اور جب نعیم نے دروازہ کھولا تو وہ خوشی سے چلا اٹھا۔ "یہ تو طاہر بھائی ہیں۔ میرے طاہر بھیا۔" اور وہ طاہر کو یونہی حیران و پریشان دروازہ میں چھوڑ کر امی امی پکارتا دوسرے کمرا میں بھاگ گیا، بانی دروازہ کی اوٹ میں چھپی رہی۔ اس نے جھری میں سے طاہر کو دیکھا۔ وہ پہلے سے دبلا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب وہ لڑکوں والی بات نہ رہی تھی۔ آنکھوں کی شرارت بھری چمک دھندلا سی گئی تھی۔ چہرے پر خط کا نشان گہرا سرمئی ہو گیا تھا اور ماتھے پر ایک دو نئی سلوٹوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

سامنے دروازہ کا پردہ اٹھاتے ہوئے خالہ ننگے پاؤں ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولیں "یہاں مہمانوں کی طرح کیوں ٹھٹھک گئے ہو۔ اندر آؤ۔ اب خالہ سے بھی شرمانے لگے ہو۔" اور انھوں نے آگے بڑھ کر طاہر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "نعیم بھائی کا بیگ تو ہاتھ سے لے لو۔ تمھیں تو بس تالیاں بجانے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔"

جب وہ دوسرے کمرا میں پلنگ پر بڑے تکلف سے بیٹھ کر چھالیا کترتی خالہ سے باتیں کرنے لگا تو بانی دروازہ کی اوٹ سے کھسک کر غسل خانہ میں جا کر منہ ہاتھ دھونے لگی۔ چینی کے بیسن میں پانی کی دھار شور مچاتی گر رہی تھی اور اس میں چوڑیاں بجنے کی مدھم جھنکار سنائی دے رہی تھی۔

بس ایک دھچکے کے ساتھ رکی اور طاہر نے چونک کر ڈرائیور سے پوچھا "بس ٹھہر کیوں گئی۔"

"ریڈیئٹر کھول رہا ہے" ڈرائیور نے سٹیرنگ پر ماتھا رکھتے ہوئے کہا "چشمہ کا ٹھنڈا پانی ڈال لیں تو پھر چلتے ہیں" اور پھر اس نے کلینر کو پکار کر کہا جلدی کر علی جلدی! پہلے ہی سے لیٹ ہو رہے ہیں۔

ریڈیئٹر شدت سے کھول رہا تھا۔ طاہر نے کھلے ہوئے ڈھکنے سے بھاپ کے دودھیا بادل کو باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"ہاں خالہ اماں! آپ لوگوں سے کچھ ناراض ہی ہیں۔ انھیں ہر گھڑی یہی شکوہ رہتا ہے کہ آپ انھیں بالکل بھول گئی ہیں اور وہ یہ شکایت کرنے میں کسی قدر حق بجانب بھی ہیں۔ آپ لوگ ڈھاکہ میں ۳ر سال رہے اور اس مدت میں ہمیں صرف ۲ر خط لکھے۔ اگر میں بھی خالو جان کی طرح کوئی بڑا افسر ہوتا تو یوں ہوتا کیا؟

یہ بات سُن کر خالہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ انھوں نے جواب دینے کے بجائے ایک دو موٹے قطرے کٹی ہوئی چھالیا میں گرا دینے زیادہ مناسب سمجھے۔ طاہر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "اماں تو میرے ساتھ آ رہی تھیں۔ لیکن میں نے سوچا یہاں سردی ہوگی اور موسم کا اچانک تغیر ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالے گا اس لیے ساتھ نہ لایا ورنہ وہ تو تیار تھیں۔"

"بہت بُرا کیا تم نے" خالہ نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا "ایک دو دن میں کیا ہو جاتا اور پھر یہاں کوئی ایسی خاص سردی بھی تو نہیں کہ بی بی برداشت نہ کر سکتیں۔ تم نے انھیں ساتھ نہ لا کر بڑی زیادتی کی ہے۔"

جب نعیم نے کمرا میں آ کر طاہر بھائی کے بیگ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تو طاہر نے جی ہی جی میں کہا "واقعی میں نے نعیم کے لیے چاکلیٹ اور ٹافی نہ لا کر بڑی زیادتی کی ہے۔ اب میں پہلے سا بھک منگا طالب علم تو نہیں رہا ہوں۔ میونسپل کمیٹی کا ۸۰ر روپے ماہوار پانے والا ایک معزز عہدیدار ہوں۔ واقعی میں نے بہت بُرا کیا۔ خالی ہاتھ ان کے گھر آ گیا۔"

ڈرائیور نے کہا "یہ لوگ بڑی زیادتیاں کرتے ہیں۔ موٹر پاس کرنے کے لیے ذرا بھی جگہ نہیں چھوڑتے۔ اگر میں ایک دم بریکیں نہ باندھ دیتا تو لاری کھڈ میں اتر جاتی۔"

طاہر نے کہا "ایسی زیادتیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن اگر میں اُس کیڈٹ سے ۱۰ر کے بجائے ۱۵ر روپے لے لیتا تو ایسی زیادتی کبھی نہ ہوتی۔ ۵ر روپے میں تو کافی چاکلیٹ آ جاتی ہے۔"

اور جب خالہ اس کمرا سے اٹھ کر باورچی خانہ میں چلی گئیں تو بانی نے اندر جھانک کر دیکھا اور پھر ٹھٹھک گئی۔ طاہر نے اپنی نئی چپل کا بکل کھولتے ہوئے جھک کر اُسے پردوں کی اوٹ میں سے دیکھا اور اس کا دل الٹ کر جیسے حلق میں آ پھنسا۔ بانی ہمت کر کے اندر چلی آئی اور اس کے سامنے کھڑی ہو کر بولی۔ "اب آ گئے بڑے صاحب بن کر۔"

طاہر نے خفت مٹانے کی خاطر پوچھا "کیوں؟"

"ہم ڈھاکہ میں اتنا عرصہ رہے مگر آپ نے ایک خط بھی لکھا؟"

"خط...... ط......" اس نے سوچتے ہوئے کہا "لیکن تم نے کون سا ڈاک کا تانتا باندھ دیا تھا۔"

"آخر میں نے ہی کراچی سے چلتے چلتے آپ کو مری آنے کا کارڈ لکھا نا۔"

"کارڈ کا کیا ہے، آخر یہاں تو میں ہی پہنچا۔ اچھا بتاؤ مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"میں کیوں بلانے لگی۔ میں نے تو اتنا لکھا تھا کہ ہم مری جا رہے ہیں اور ایک غیر معین عرصہ تک وہیں رہیں گے۔ آپ کو کس نے دعوت دی۔"

طاہر نے چٹکی بجا کر جواب دیا "دعوت نہیں دی تو ہم لوٹ جاتے ہیں۔ پلٹنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔"

اتنے میں خالہ پھر اندر آ گئیں۔ انھوں نے اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا "بانی نے اچھی خاصی بنگالی سیکھ لی ہے۔ اس نے وہاں بہت سی بنگالی لڑکیاں سہیلیاں بنا لی تھیں اور اب تو یہ انھیں خط بھی بنگالی میں لکھنے لگی ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''کمال ہے۔'' طاہر نے جھوٹ موٹ کی حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا ''ہم تو ۱۴ رسال تک انگریزی کے پیچھے لٹھ لیے پھرا کیے مگر آج تک ایک لفظ بھی اٹھانا نہ آیا۔ بانی نے کمال کیا ہے جو ۳ رسال میں بنگالی لکھنا بھی شروع کر دی۔''

بانی نے خالہ کی طرف منہ کر کے کہا ''امی سبھی کے دماغ ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں۔ کوئی ذرا کند ذہن ہوتا ہے، کسی کسی کو اللہ میاں ذہین بنا دیتا ہے۔'' اس نے چور آنکھوں سے طاہر کو دیکھا اور اپنی امی کے سامنے بھولا سا منہ بنا کر کھڑی ہوگئی۔

خالہ نے مسکرا کر کہا ''تم دونوں کی تو یونہی ٹھنی رہی اور خدا معلوم کب تک ایسے ہی ٹھنی رہے گی۔''

ڈرائیور کہہ رہا تھا ''تینوں ٹرانسپورٹ کمپنیوں کی آپس میں ٹھنی ہوئی ہے۔ ایک سال کا عرصہ ہوگیا ہے خدا جانے اور کب تک ایسے ہی ٹھنی رہے گی۔'' طاہر نے گھبرا کر پوچھا ''ابھی مری کتنی دور ہے؟''

''بس آیا چاہتی ہے۔'' ڈرائیور نے وقت دیکھا اور سگریٹ جلانے میں مشغول ہوگیا۔

سڑک کے کنارے سبز رنگ کی ایک لمبی سی کار کھڑی تھی، اس کے باہر ایک صاحب، تین چار کلرک اور دفتر کی بے شمار فائلیں بغل میں دابے، سُرخ رنگ کی وردی والا ایک اردلی کھڑا تھا۔ طاہر کو سُرخ رنگ کی وردی دیکھ کر نصرت باجی کا بیاہ یاد آگیا۔ جب وہ اسی رنگ کا جوڑا پہنے صوفہ پر بڑے طمطراق سے بیٹھی تھیں اور ان کے پاس قالین پر لیٹے ہوئے ممتاز بھائی سگریٹ پی رہے تھے، باجی لال جوڑا پہنے بھی افسر دکھائی دیتی تھیں اور ممتاز بھائی وورسٹڈ کا سوٹ پہنے بھی اردلی لگتے تھے۔ اس ایک شادی کے ساتھ بہت سی شادیاں اس کے ذہن میں گھومنے لگیں۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ طاہر نے ریسیور اٹھایا تو بانی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی ''جلدی گھر آئیے ایک نہایت ضروری کام آپڑا ہے۔''

''ایسا کیا کام آپڑا ہے بانی۔ میں دفتر چھوڑ کر کیسے آؤں۔ مجھے ٹیلی فون ہی پر بتا دو۔''

''ٹیلی فون پر بتانے کا ہوتا تو میں پہلے ہی نہ کہہ دیتی۔'' بانی نے روہانسی ہو کر کہا۔ گھر آئیے نہیں تو میں۔''

''نہیں تو میں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھئی میں گھر ہی تو آرہا ہوں۔'' طاہر نے جلدی جلدی ٹیلی فون بند کیا اور اپنے چپراسی کو کھلی ہوئی فائلوں کا دھیان رکھنے کے لیے کہہ کر جلدی جلدی سیڑھیاں اتر گیا۔ سٹاف کار پورچ میں موجود نہ تھی۔ اس نے گیٹ کیپر کو بھیج کر ایک ٹیکسی منگوائی اور گھر پہنچ گیا۔ بانی سیاہ رنگ کے بڑے بڑے پھولوں والی قمیص پہنے بنگلے کے برآمدہ میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ طاہر کو اپنی طرف تیزی سے قدم اٹھاتے دیکھ کر ذرا مسکرائی اور اپنی قمیص کے پہلوؤں میں اسی رنگ کی لٹکتی ہوئی پٹیاں اٹھا کر بولی ''ذرا انھیں میری کمر کے پیچھے باندھ دیجیے۔'' طاہر نے ٹھٹھک کر استعجابیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی ''خوبصورت سی گرہ دیجیے گا۔ پیاری سی ناٹ۔''

طاہر نے پوچھا ''مجھے دفتر سے کیوں بلایا تھا؟''

''اسی لیے بلایا تھا۔ ماما کھانا پکا کر چلی گئی ہے۔ یہاں کوئی بھی نہ تھا، میں گرہ کس سے دلواتی۔''

طاہر نے جھنجھلا کر کہا ''میں حضور کا اردلی تو نہیں ہوں۔ ایک بڑے دفتر کا بڑا صاحب ہوں مجھے......'' لیکن بانی نے بات کاٹ کر کہا ''صاحب تو صاحب ہی رہتے ہیں، گرہ دینے سے اردلی تو نہیں بن جاتے۔''

طاہر نے طنزیہ لہجہ میں پوچھا ''اچھا تو اب میں جا سکتا ہوں؟''

''شوق سے!'' بانی نے بڑے صاحبوں کی طرح کہا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اندر چلی گئی۔

طاہر اپنے دفتر پہنچ کر ابھی کرسی پر ٹھیک سے بیٹھا بھی نہ تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اس نے جھنجھلا کر ٹیلی فون پرے دھکیل دیا اور بولا ''اب چاہے یہ گھنٹی جتنی دیر تک بجتی رہے میں ہرگز ریسیور نہ اُٹھاؤں گا۔''

ڈرائیور نے چلا کر کہا ''چاہے یہ گھنٹی رات تک بجاتے رہو میں موٹر کھڑی نہیں کروں گا۔'' کلینر نے پکارا ''استاد سواری اترنی ہے، اس ذخیرے کے پاس۔''

''تو میں کیا کروں؟'' ڈرائیور نے کھج کر کہا ''مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ڈھلوان پر بس نہیں رک سکتی۔ پتا نہیں اس کی بریکیں خراب ہیں؟''

طاہر نے کہا ''ٹھیک ہے ڈرائیور صاحب! اب یہ بس مری جا کر ہی روکیے گا۔ راستہ میں خواہ مخواہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔''

رات کو خالو جان نے طاہر سے اس کی موجودہ تنخواہ پوچھ کر کہا ''میاں صاحبزادے تم نے میونسپلٹی کی نوکری کر کے اپنا وقت ہی ضائع کیا۔ اس میں عہدہ کی ترقی ہے نہ تنخواہ کی اور آخری عمر میں پنشن سے بھی صاف جواب ہے۔ اس وقت تم نے میرا کہا نہ مانا۔ اگر میرے دفتر میں عرضی دے دیتے تو میں تمھیں ڈائریکٹ اسسٹنٹ رکھ لیتا۔ اب سوچو کل خدانکردہ تمھاری اماں تمھاری شادی کے درپے ہو جائیں تو ان اسی روپوں میں اپنا، اپنی اماں کا اور اس بدبخت بیوی کا پیٹ کیسے پال سکو گے؟ واقعی تم نے بڑی غلطی کی۔ میں تمھیں ڈائریکٹ اسسٹنٹ رکھ لیتا۔ یہ کمیٹی کی نوکری کر کے تو تم نے اپنا وقت ہی ضائع کیا۔''

خالہ نے طاہر کی جگہ جواب دیتے ہوئے کہا ''کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ آپ ہی ترقی ہو جائے گی۔ ہاتھ آئی ہوئی روزی چھوڑ کر دوسرے روزگار کی طرف بھاگنا کون سی عقلمندی ہے۔ اللہ خود ہی ترقی کر دے گا۔''

طاہر نے جھینپتے ہوئے کہا ''ہاں جی اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ اسی نوکری میں مرتبہ دے دے گا۔''

''سبحان اللہ!'' خالو نے ہنستے ہوئے کہا ''آپ بھی اپنی خالہ کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ میاں اگر اس خیال میں رہے ہو کہ یہ نوکری کرتے کرتے تم ایک دن تحصیلدار بن جاؤ گے تو اس نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگے اور کسی نے بھی ان کی ہنسی کا جواب نہ دیا۔

سونے سے پہلے جب طاہر دانت صاف کر رہا تھا تو بانی غسل خانہ میں ہاتھ دھونے آئی۔ اس نے صابن کا جھاگ ہاتھوں سے لپیٹتے ہوئے کہا ''آپ گھبرائیں نہیں۔ ابا جان کی باتوں پر نہ جائیں۔ وہ ایسے ہی کرتے ہیں۔ دیکھ لینا ایک دن تم ابا جان سے بھی بڑے آفیسر بن جاؤ گے۔'' طاہر نے برش منہ سے نکال کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ بانی کی آنکھوں میں خلوص اور یقین کے اشارے اندھیاروں کے جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔

ڈرائیور بلند قامت کلینر سے کہہ رہا تھا ''دیکھ لینا بچو آج لیٹ پہنچیں گے۔ جواب طلبی ہوگی۔ تو میں تمھارا نام لے دوں گا کہ جگہ جگہ رکواتا آیا ہے۔''

کلینر نے پکار کر کہا ''کوئی بات نہیں استاد میں منشی سے آپ ہی نپٹ لوں گا۔''

پہاڑیوں کی اونچی چوٹیوں پر مری دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ سڑک کے کنارے ڈھلوان چھتوں والے بنگلے ایک دوسرے کے آگے پیچھے آ کر آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ وادی کے سرسبز کھیتوں پر سفید بادل تیر رہے اور اوپر سیاہ ابر چھایا ہوا تھا۔ بارش ابھی برس کر تھمی تھی لیکن سرد ہوا کے تیز جھونکوں سے درخت ابھی تک برس رہے تھے۔ طاہر نے اپنی اچکن کے سارے بٹن بند کر لیے اور کمبل کو ٹھیک سے تہہ کر کے گود میں ڈال لیا۔

کسی سواری نے ملتجیانہ لہجہ میں کہا ''ایک منٹ کے لیے یہاں نہیں روک سکتے۔''

ڈرائیور نے جواب دیا ''اگلا موڑ مڑنے کے بعد اڈہ آرہا ہے۔ یہاں روک کر کیا لیں گے۔'' جب اگلا موڑ آیا تو ایک اور بس پاں! پاں!! کرتی ان کے قریب سے گزری۔ طاہر نے دیکھا اگلی سیٹ پر بانی، نعیم، خالہ اور خالو کمبل گھٹنوں پر ڈالے واپس جا رہے تھے۔

ڈرائیور نے پکار کر کہا ''لے بچو! آخری بس بھی نکل گئی۔''

طاہر نے گھبرا کر پوچھا ''اور اب کوئی بس نیچے نہیں جائے گی؟''

''اونہوں'' ڈرائیور نے بے پروائی سے کہا ''اب کل میلے ہوں گے لیکن ٹیکسی جا سکتی ہے۔ سالم ٹیکسی۔ ۳۰ روپے کی'' پھر وہ ''یہ زندگی کے میلے'' گانے لگا۔ طاہر نے اپنی اچکن کی جیب سے پانچوں روپے اور کارڈ نکال کر مٹھی میں بھینچ لیے۔ بادل زور سے گرجا اور بارش ہونے لگی۔ ■

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ بانشا کا دوسرا جنم تھا۔

جب میرن خان ۱۷ سال کا تھا تو اس زمانے میں بھی اس نے شکار کے لیے تازی کتا سدھایا ہوا تھا، جسے اس نے بانشا یعنی برق رفتار کا نام دیا تھا۔ وہ محاورتاً نہیں عملاً اسے مکھن کھلایا کرتا اور اسے عزیز از جان رکھتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے اماں زہرو سے نظریں بچا کر نعمت خانہ کھلا چھوڑ دیا، بانشا سمجھ جاتا کہ مالک نے اس کے لیے خوراک کا بندوبست کر دیا ہے۔ وہ جونہی مکھن والی مٹکی میں منہ ڈالتا، اماں میرن اور بانشا کو کوسنے دیتی، پاؤں پٹختی آتی اور غصہ سے مٹکی نعمت خانہ سے نکال کر زمین پر لڑھکا دیتی اور کہتی:

"لو اب زہر مار کرو، اب یہ میرے کس کام کا۔"

میرن خان اماں کی بے بسی اور غصہ پر کھسیانا ہو کر رہ جاتا اور بھوسے کے پلّے میں چھپ جاتا۔ بانشا دم ہلاتا مکھن کھانے میں جت جاتا، اس کو پروا نہیں تھی کہ اماں کے ہاتھوں مالک کی کیا درگت بنی۔

میرن خان اور بانشا ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اسے اپنے کھانے پینے کی کبھی پروا نہ ہوتی مگر بانشا کے لیے وہ خاص خوراک کا اہتمام کرتا۔ اسے گرمیوں میں چھاؤں، ٹھنڈی جگہ اور جاڑوں میں نرم اور گرم بستر دیتا۔ بانشا اس کا دوست، غم گسار اور محافظ تھا۔ ہر وقت اس سے چپکا رہتا۔ کئی بار اسے ایک بے زبان کو انسانوں پر ترجیح دینے کی پاداش میں اپنوں پرایوں سے ناخوشگوار جملے سننے کو ملتے۔ لوگ کہتے کہ میرن خان انسانوں سے زیادہ اپنے کتے سے پیار کرتا ہے۔ حالانکہ میرن خان گھر میں ایک آدھ گائے ضرور رکھتا تھا، وہ بانشا کی طرح اس کا بھی خاص خیال رکھتا مگر اس کی اِس نیکی کا کوئی ذکر نہ کرتا۔ اس خیال پر وہ تلملا کر رہ جاتا۔

جنگ عظیم دوم میں ملایا کے محاذ سے واپسی کے بعد اس نے ایک بار پھر تازی کتا سدھا لیا جسے اس نے بانشا کا نام دیا۔ سپاہی ایک بار پھر بازدار بن گیا۔

میرن خان شاہی محل سے لوٹنے کے بعد، ریتیلے بیابانوں میں نکل جاتا، تیتر، تلور اور ہرن کے شکار کے لیے، کندھے پر بندوق لٹکائے۔ اس کا پالتو شکاری کتا بانشا اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا۔ ادھر اس کی ہرن پر نظر پڑی اور اس نے اشارہ دیا "شاباش......"

بانشا پلک جھپکتے ہی شکار پر جھپٹ پڑتا۔ اسے صرف شکار کو گرانے اور بھاگنے سے روکنے کی ہدایت اور تربیت تھی۔ زخمی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ پھرتی سے شکار پر جھپٹتا اور اس کے ساتھ گتھم گتھا ہو کر اس سے اس وقت تک لپٹا جھپٹتا رہتا جب تک کہ مالک شکار کو قابو نہ کر لیتا۔ میرن خان جھٹ سے چاقو نکال کر ہرن کی گردن پر پھیر دیتا۔

"بسم اللہ، اللہ اکبر......"

ہرن کچھ دیر تڑپنے کے بعد ٹھنڈا پڑ جاتا۔ جب کبھی شکار بانشے کے قابو میں نہ آتا تو میرن خان ایک ہی فائر میں اسے گرا لیتا۔ بچپن سے ہی اس کا نشانہ کمال کا تھا۔ بانشا جھینپ سا جاتا اور مالک کے پاؤں چاٹنے لگتا۔ میرن خان عباسیوں کے شاہی محل میں دن میں دوسرے سے چوتھے پہر تک پہریداری پر پابند تھا۔ رات اس کی اپنی تھی۔ رات کو وہ اور اس کے دوست بڑی دیر تک گاؤں کے ٹیلوں میں چور سپاہی، چھپن چھپائی، پکڑن پکڑائی، باندر کلا، ہڈی جھار اور کبڈی کھیلتے رہتے یا پھر بڑے ٹیلا پر آلتی پالتی مار کر ایک بڑے دائرہ کی شکل میں مجلس جما لیتے اور تاروں بھری رات میں باہم قصے کہانیوں کا تبادلہ کرتے رہتے۔ راتیں چاہے آگ برساتی گرمیوں کی ہوں یا کپکپا دینے والے جاڑے کی، یہ ان کا معمول تھا۔ موسم ان کی مستیوں میں کبھی حائل نہ ہو سکا۔ جوں ہی رات اپنی کالی چادر گاؤں کے جسم پر پھیلاتی یہ سب ایک ایک کر کے بڑے ٹیلے پر جمع ہو جاتے۔ اس ٹیلے کو انھوں نے "دربار" کا نام دے رکھا تھا۔ وہ یہاں جمع ہوتے تو رات ان کی خوش گپیوں کے خوب صورت رنگوں میں ڈھل جاتی۔ چاندنی راتوں میں تو یہ سلسلے اور بھی نکھر سنور جاتے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس زمانہ میں روہی میں شکار عام تھا۔ محراب والا سے نکلتے ہی جنگلوں میں ہر طرف ہرن ہی ہرن مل جاتے تھے۔ روزانہ لوگ ابھی اپنے بستروں میں دبکے ہوتے کہ پَو پھٹتے ہی میرن، بانشا کو لے کر گاؤں سے چند کوس دور چھوٹی روہی نکل جاتا اور دوسرے پہر سے پہلے ہی وہ ہرن کندھے پر لادے نمودار ہوتا تو سب رشتے داروں کی باچھیں کھل جاتیں۔ آناً فاناً ہرن کا سارا گوشت قریبی عزیزوں کے گھروں میں بٹ جاتا۔ شکار کے حوالے سے چھوٹی عمر میں ہی میرن خان کی ہر طرف دھوم ہو گئی۔ اس کی تربیت کی وجہ سے بانشا بھی اب شکار کو پلک جھپکتے ہی قابو کر لینے کے ہنر میں تاک ہو گیا تھا۔

میرن خان کے لیے گرمی سردی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ ہر روز روہی کی طرف نکل جاتا اور دوپہر سے پہلے ہی شکار سے لدا پھندا گھر لوٹتا۔ اس روز بھی سورج ابھی ٹیلوں کی اوٹ سے سر نکالنے کی کوشش میں تھا کہ میرن خان اپنی بھارتو بندوق اور مختصر سا زادِ راہ لیے گھر سے نکلا اور تھوڑی ہی دیر میں بڑے ٹیلے "دربار" پر چڑھا اور پھر نظروں سے غائب ہو گیا۔ اسے روزانہ شاہی محل جانا ہوتا تھا اس لیے منہ اندھیرے گاؤں سے نکلتا اور سورج سر پر آنے سے پہلے ہی لوٹ آتا تا کہ سہ پہر کو اپنی نوکری پر جا سکے۔ وہ نوکری کے معاملے میں بہت زیادہ پابند تھا۔

ہاڑھ کا مہینا تھا، سورج چڑھتے ہی ہر طرف تپش کا راج ہو گیا۔ سخت گرمی میں زندگی نڈھال ہو رہی تھی۔ اچانک چلنے والی گرم لُو جسموں کو بھسم کیے دے رہی تھی۔ بکریوں اور مویشیوں کے لاؤ لشکر اور چرواہے بھی گرمی کی تاب نہ لا کر بھٹوں، سرکنڈوں اور جال کے جھنڈوں میں دبکے ہوئے تھے۔ سورج کی تپش سے ان کی بھوک مر گئی تھی۔ اس وقت تو انھیں گھاس پھونس چرنے سے زیادہ ہلکی ہلکی چھاؤں غنیمت محسوس ہو رہی تھی۔ بانشا بھی آج تو گرمی کے مارے مضمحل ہو رہا تھا۔ میرن خان کافی آگے آ چکا تھا۔ اب وہ چھدرے جنگل سے چٹیل میدان میں نکل آئے تھے۔ وہ جوں ہی ٹنڈی سے چیلاں والے ڈہر کی راہ پر نکلا ایک خوبصورت بک اچانک ایک بھٹ سے تقریباً جست لگا کر باہر نکلا اور مٹھوے کی طرف لپکا۔ ہرن پر نظر پڑتے ہی اس نے بانشا کو ہرن کا پیچھا کرنے کے لیے ہلا دیا اور چیخا "شاباش بانشا، شاباش ....."

بانشا چوکڑیاں بھرتے ہوئے شکار کے پیچھے لپکا۔ چیلاں والے ڈہر کا چٹیل میدان ختم ہو چکا تھا۔ آگے چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور بھٹوا پھیلی ہوئی تھی اور جا بہ جا لائی اور لانوں کے چھوٹے بڑے بوٹے اگے ہوئے تھے جن کی آڑ لے کر ہرن زقند بھرتا ہوا، بانشا اور میرن خان کی نظروں سے نکل گیا۔ ہرن، بانشا اور میرن خان کے درمیان یہ آنکھ مچولی بڑھتی ہی گئی اور پتا ہی نہ چلا کہ دوپہر ہو گئی۔ دہکتا سورج سر پر آ چکا تھا۔ اب میرن خان کی تشویش بڑھنے لگی لیکن ہاتھ آئے شکار کو یوں چھوڑ دینا اس کی بازدارانہ شان کے خلاف تھا۔ اس لیے اس نے بانشا کو واپس بلانے کے بجائے اسے شکار کا پیچھا جاری رکھنے کے لیے مزید ہلا دیا اور چیخ کر کہا:

"شاباش بانشا.....اور دم لگا، اسے چھوڑنا نہیں جگر۔"

مالک کی شہ پا کر بانشا ہرن کے تعاقب میں بہت آگے نکل گیا، میرن خان بھی اس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہا تھا۔ وہ بہت دور تک نکل گئے۔ یہاں کوئی ریوڑ تھا نہ کوئی چرواہا، ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ صحرا میں آگ میں لپی ہوئی لُو کے تھپیڑوں اور ویرانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ بھاگتے بھاگتے میرن خان کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ بگڑاؤ والے ڈہر سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ ہرن نے انھیں صحرا میں بھٹکا دیا تھا، وہ اب ان کی پہنچ سے دور نکل گیا تھا۔ دھیرے دھیرے شام کے سائے بھی ڈھلنے لگے۔ سارے دن کے تھکے ہارے سورج نے ٹیلوں کے دامن میں نرم ریت میں منہ چھپا لیا۔ انھیں احساس ہی نہیں ہوا کہ دن ڈھل گیا۔

رات نے روہی کے بدن پر اپنی کالی زلفیں پھیلا دیں اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ میرن خان کو وسوسے دامن گیر ہو گئے، اس کا دل ڈوبنے لگا۔

شکار چالاک نکلا تھا اور جھٹپٹے میں وہ لائی، لانوں، جال، کریہہ کے صحرائی درختوں اور پودوں کی آڑ لے کر نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا۔ ہرن بانشا کو چکما دینے میں کامیاب رہا تھا۔ ہرن کی بو صحرائی ہواؤں میں بھٹک گئی تو بانشا بھی بھٹک گیا۔ پہلی بار اسے کسی نے شکست سے دوچار کیا تھا۔ وہ غصہ میں غرانے اور پنجوں سے ریت اڑانے لگا۔ اس کی آواز کا پیچھا کرتے ہوئے، رات کے اندھیرے میں گرتے پڑتے میرن خان بھی وہاں جا پہنچا۔ دونوں کی حالت دیدنی تھی۔ دونوں پسینے میں بھیگے اور بری طرح سے ہانپ رہے تھے۔ بانشا کے منہ سے تو جھاگ بھی بہہ رہی تھی۔ اس کی لمبی زبان باہر نکل آئی۔ وہ اپنی ناکامی پر حسرت و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا۔ مالک کو قریب دیکھ کر اس نے سر شرم سے جھکا لیا، جیسے کہہ رہا ہو، مالک معاف کرنا شکار ہاتھ سے نکل گیا۔ ان کی زبانیں خشک ہو چکی تھیں۔ پیاس کے مارے دونوں کا دم گھٹنے لگا مگر میرن خان کی گگی خالی ہو چکی تھی اور شاید وہ ٹوبھے سے بھی دور نکل آئے تھے۔ اس نے بانشا کو پچکارا اور اس کی دلجوئی کرنے کے لیے اس پر جھک گیا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہا:

"کوئی بات نہیں دلبر...... تو نے اپنے تئیں بہت کوشش کی شکار پر جھپٹنے کی، اس کے نصیب اچھے تھے کہ وہ نکل گیا...... تیرے ہاتھوں سے۔ چل اُٹھ کہیں چل کر روٹی پانی کا بندوبست کرتے ہیں۔" عام حالات میں بانشا مالک کے اشارے پر پھدکنے لگتا مگر آج لگتا تھا کہ وہ بانشا ہمت ہار چکا ہے۔ میرن خان نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھانے کی کوشش کی تو بانشا نیم جان ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً گگی کا ڈھکنا کھول کر بانشا کے منہ پر الٹا دی مگر اس میں ایک بوند بھی پانی نہیں تھا۔ اس کی مایوسی بڑھ گئی اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ موت ان کے سر پر منڈلا رہی تھی۔

صبح سے ہی اس کی بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔ اماں زہرو کہتی رہتی تھی کہ بائیں آنکھ پھڑکے تو اچھا شگون نہیں ہوتا لیکن وہ ان چیزوں کو ڈھکوسلے سمجھتا۔ آج وہ بری طرح سے پھنس گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ شاید اماں ٹھیک ہی کہتی تھی۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ آئندہ جب بھی اس کی بائیں آنکھ پھڑکے گی تو وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جس سے مشکل میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

بانشا سخت جان تھا لیکن سارے دن کی مشقت اور گرمی نے اسے لاغر کر دیا تھا۔ وہ جاں بہ لب تھا، اس کی یہ حالت دیکھ کر میرن خان سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کیا جائے۔ اسے اندھیرے میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذرا سانسیں بحال ہونے پر اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں، دور تک کسی آبادی کے آثار نہیں تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بھونپو بنا کر زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں "کوئی ہے.....کوئی ہے؟"

اُس کی آواز خاموشی کا سینہ چیر کر صحرا میں گونجنے لگی لیکن کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ آبادی سے کوسوں دور تھے۔ اب اس کے لیے گھر واپسی سے زیادہ اہم بگڑاؤ والے ٹوبھے تک پہنچنا تھا، تاکہ اپنی اور بانشا کی پیاس بجھائی جا سکے۔ وہ جھکا اور اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر بانشا کو لپکا لیا، امداد طلب نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور تیزی سے ایک سمت چل پڑا۔ اسے بگڑاؤ کا راستہ

کیا آپ جانتے ہیں؟

بیشتر والدین اور اساتذہ کے لیے یہ بات شاید حیران کن ہوگی کہ انسانی دماغ کا ۸۰ فیصد عمر کے ابتدائی ۳ سال میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے بچے کی نشوونما اور تعلیم کے حوالے سے یہ سال بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔

(صائمہ اختر، لاہور)

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

سوجھ گیا تھا۔

رات کی تاریکی اور گہری ہوگئی تھی اور آسمان پر تارے چمکنے لگے تھے لیکن ماحول میں بہت زیادہ خوف گھلا ہوا تھا۔ اودھم مچاتے گیدڑوں کے غول رات کو اور بھیانک بنا رہے تھے۔ اب تو اس کا ایک حل تھا۔ اسے تاروں کی راہنمائی میں بگڑاؤ والے ٹوبھے تک پہنچنا تھا۔ یہ خطرناک علاقہ تھا، سرکنڈوں، جالوں، لائیوں، لانوں اور چھوٹے بڑے ٹیلوں اور بھٹوں سے گھرا ہوا۔ رات کو یہاں حشرات الارض اور زہریلے سانپوں کا راج رہتا تھا۔ یہاں اس کے لیے ہر قدم پر خطرہ موجود تھا۔ وہ چلتے چلتے ہلکی سی سرسراہٹ پر بھی ٹھٹک جاتا۔ میرن خان ڈرپوک نہیں تھا لیکن خواہ مخواہ اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا۔ راستے میں کہیں کسی جھاڑی سے اچانک کوئی خرگوش پھدکتا ہوا اس کے سامنے سے گزر جاتا تو اس کا دل مٹھی میں آجاتا۔ اندھیرے میں وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔

گرمیوں میں ریت دن میں اوپر سے انتہائی گرم اور نیچے انتہائی ٹھنڈی اور رات میں اوپر سے ٹھنڈی اور نیچے کافی گرم ہوتی ہے۔ جھوکوں اور بستیوں کے قریب ٹیلوں پر رات بتانے کا مزہ ہی الگ ہے۔ ریشم جیسی نرم نرم ٹھنڈی ریت پر روہی کا دن جتنا بھی قیامت خیز ہو، ٹھنڈی رات سارے دن کے جھلسے ہوئے جسموں کو بڑا قرار دیتی ہے۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا، ایک لمحے کے لیے اس کے جی میں آیا کہ یہیں کہیں کسی ٹیلے پر رات بسر کرلے، صبح دیکھی جائے گی۔ تھکاوٹ، بھوک اور پیاس کی وجہ سے میرن خان کے قدم ڈگمگانے لگے لیکن بانشا کی زندگی کا سوال تھا۔ بانشا اس کے دکھ سکھ کا ساتھی تھا، اسے اس حال میں چھوڑ دینے کے خیال پر اس نے خود کو ملامت کی اور بگڑاؤ کی جانب قدم تیز کر دیے۔

صحرا میں شب کے مسافروں کی راہنمائی کرنے والا قطبی تارا اب اس کے سر پر آچکا تھا۔ میلوں پھیلے بگڑاؤ کے چٹیل میدان میں پختہ زمین پر بارشوں کے دنوں میں رُکے ریت کے ذرے تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ میرن خان قریب پہنچا تو کتوں کے بھونکنے کی آوازوں پر اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اس کی منزل قریب آگئی تھی۔ ڈاہر کے شمال مشرق میں سرسبز جالوں، کنڈوں اور بیریوں سے گھرا بگڑاؤ کا ٹوبھہ اس سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ اُس علاقے کے کتے، جنگلی جانور، مویشی اور انسان اپنی پیاس اسی سے تالاب کے گدلے پانی سے مٹاتے ہیں۔ گزشتہ ساون میں جم کر بارشیں ہوئیں تو یہ لبالب بھر گیا تھا۔ اگلے ساون تک اب یہاں رونق رہے گی۔ ٹوبھے چند قدموں پر مٹی اور ریت کی بھٹوں پر جتوالوں کے گوپے اسے دور سے ہی دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ تالاب سے سو دو سو قدموں کے فاصلے پر قدآور کنڈے کے کئی قدآور درخت تھے جن کے نیچے قطار میں درجن کے قریب اونٹ بندھے تھے۔ قریب ہی بکریوں، بھیڑوں کا ریوڑ تھا جسے سرکنڈوں کی چار دیواری میں بند کیا گیا تھا۔

اس کے چہرے پر مسکان پھیل گئی۔

اونٹوں کے قریب رکھوالی پر بیٹھا کتا غراتے ہوئے اچھل کر ان پر جھپٹا لیکن میرن خان کے روہیلے انداز میں پچکارنے پر وہ دم ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ میرن خان دوزانو ہو کر قدموں کے بل ٹوبھے پر جھکا اور بانشا کا سر پانی کی طرف جھکایا لیکن بانشا کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ میرن خان کی آنکھوں سے چھم چھم پانی برسنے لگا۔

اس کا ہمدم، اس کا دوست بانشا مر گیا تھا۔

یہ کہانی ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کے خالق صحرانورد سعید خاور کی کتاب ''پاکزہ کے آنسو'' میں شامل ہے
افسانہ نگار آج کل روزنامہ نوائے وقت کراچی کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ہیں

ایک چودھری اور
اُس کی بیوی کی کہانی

کرماں والی

وہ اپنے لیے بہو کی تلاش میں تھے
اور تلاش ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی

اعجاز احمد ڈنگہ

اِک تے کرماں والیے تیری وی کوئی سمجھ نہیں آوندی!''

چودھری قدرداد نے اپنے گھر پہنچ کر اپنے کمرا میں داخل ہوتے وقت دہلیز پر زور زور سے جوتے پٹختے ہوئے کہا۔ معلوم نہیں چودھری اپنے جوتوں سے گرد اُتار رہا تھا یا اپنی بیٹا کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف کا غصہ اُتار رہا تھا۔

چودھری قدرداد اور اُس کی بیوی صُغراں اپنے بیٹے چودھری نورداد کے لیے بیوی اور اپنے لیے بہو تلاش کرنے نکلے تھے اور حسبِ معمول ناکام لوٹے تھے۔ وہ کئی مہینوں سے بہو کی تلاش میں تھے لیکن صُغراں کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آرہی تھی۔ ہر لڑکی میں وہ کوئی نہ کوئی نقص تلاش کر لیتی۔ کسی کا قد چھوٹا نکل آتا اور کسی کا بڑا۔ کسی کا رنگ سانولا نظر آتا اور کسی کے دانت لمبے، کسی کے بال پتلے ہوتے اور کسی کی چال بے ڈھنگی نکل آتی۔ چودھری نورداد علاقہ کا سب سے بڑا زمیندار تھا اور نورداد اُس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لیے اُس کی ماں چودھرانی صُغراں اگر اُس کے لیے رشتہ کی تلاش میں خوب چھان پھٹک کر رہی تھی تو یہ ایک فطری بات تھی۔

پہلے تو صُغراں بی بی نے اپنے گاؤں پھر اردگرد کے دیہات پر نظر دوڑائی۔ اپنی ذات برادری کا جائزہ لیا۔ بیسیوں گھروں کی خاک چھانی لیکن جب گوہرِ مقصود ہاتھ نہ لگا تو دور دراز دیہات میں رہائش پذیر اپنے خاندان سے وابستہ افراد کے گھروں میں جانے کی ٹھانی۔ اسی سلسلہ میں وہ گزشتہ روز ۵۰ رکلومیٹر دور ایک گاؤں میں پہنچے۔ انھوں نے لڑکی دیکھی۔ بچی بڑی پیاری تھی، گھربار اور خاندان بھی اچھا تھا۔ وہ لوگ بھی اپنے گاؤں کے نمبردار اور چودھری قدرداد کی ٹکر کے تھے۔ اُن لوگوں نے مہمانوں کی خاطر تواضع بھی بہت کی۔ صُغراں بچی کی شکل و شباہت سے بھی مطمئن ہوگئی اور گھر والوں کا طور طریقہ، سلیقہ بھی اُنھیں پسند آیا۔ وہ اگرچہ اپنی گاڑی پر گئے تھے اور رات تک اپنے گاؤں واپس آسکتے تھے لیکن میزبانوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے اصرار پر وہ رات کو وہیں رُک گئے۔
صُغراں کی لڑکی میں دلچسپی اور گھر والوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے سے چودھری قدرداد کو اندازہ ہوگیا کہ کام بن گیا ہے۔ لڑکی چودھرانی کو پسند آگئی ہے۔ وہ مطمئن ہوکر رات کا کھانا کھا کر سوگیا۔

چودھری تو سوگیا لیکن صغراں جاگ رہی تھی۔ بہو کی تلاش کی اصل ذمہ داری تو اُسی پر تھی۔ چودھری تو اُس کے اسسٹنٹ کے طور پر اس کے ہمراہ بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نتیجہ کی ذمہ داری اُسی پر ہے۔ اگر شادی کے بعد بات نہ بنی، کوئی گڑبڑ ہوگئی، تو سارا اُس کے سر ہوگا۔ اُس نے بچی کو دیکھتے ہی پسند کرلیا تھا۔ بچی ماشاء اللہ ہزاروں میں ایک تھی۔ بچی کا خاندان بھی اچھا تھا۔ ناپسند کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اُسے خوش اور مطمئن ہونا چاہیے تھا۔ بچی کے خاندان والے انھیں اور اُن کے بیٹے کو جانتے تھے۔ دیہی رسم و رواج کے مطابق زمیندار گھرانے ایک دوسرے کی زمین کا حساب لگاتے تھے۔ اگر زمینداری برابر کی ہوتی تو کسی فریق کو رشتہ استوار کرنے میں انکار نہ ہوتا تھا۔ صُغراں جانتی تھی کہ لڑکی والوں کو اُنھیں رشتہ دینے میں کوئی عار نہ ہوگی لیکن رشتہ ملنے کی خوشی کے ساتھ ساتھ وہ کچھ مضطرب سی تھی۔ اُس کے دل میں کوئی کھٹکا سا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ، اُس کا خاوند، اُس کا بیٹا اور لڑکی کا خاندان اس رشتہ پر خوش ہوں گے اور لڑکی...... لڑکی کو اتنا بڑا گھرانہ، ۷ رمربع کا اکلوتا مالک دولہا مل رہا تھا۔ اُسے بھی خوش ہی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن کیا لڑکی واقعی خوش ہوگی؟ یہی سوچتے سوچتے صُغراں بہت دور بہت پیچھے تقریباً ۳۰ رسال پیچھے چلی گئی۔

چودھری بہاول بخش اُن کے گاؤں ہی کا نہیں علاقہ بھر کا سب سے بڑا زمیندار، سب سے زیادہ بارُعب اور اثرورسوخ کا مالک تھا۔ وہ ۷ رمربع زمین کا اکلوتا مالک تھا۔ اُس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ اللہ میاں ایک شخص کو بہت سی نعمتوں سے نوازتے ہیں لیکن کوئی نہ کوئی ایسی کسر رہ جاتی ہے کہ آدمی ساری عمر ایک عجیب سی اُلجھن اور پریشانی کا شکار رہتا ہے۔ مالکِ حقیقی نے چودھری بہاول بخش کو بہت سی نعمتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک عملی مسلمان گھرانہ میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا خاندان اپنے علاقہ کا بادشاہ تھا۔ اُس کا اچھا قد بت، اچھا رنگ، اچھی شکل تھی۔ اُسے اپنے زمانہ کے لحاظ سے اچھی تعلیم ملی تھی۔ اُسے ہر حال میں بہت خوش ہونا چاہیے تھا لیکن اُسے ایک محرومی بھی ساتھ ہی ملی تھی۔ اُس کا اکلوتا بیٹا قدرداد خوش شکل نہیں تھا۔ قدرداد کا چہرہ پیدائشی طور پر ٹیڑھا تھا۔ اُس کے ۲ ردانت بھی منہ کے ایک طرف سے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ اپنے ماں باپ کے برعکس اُس کا رنگ بھی سانولا تھا۔ چودھری بہاول بخش بڑے بڑے ڈاکٹروں سے ملا اور مشہور ہسپتالوں میں گیا لیکن کسی ڈاکٹر، کسی سرجن نے اُس کے بیٹے کا چہرہ ٹھیک کرنے کی حامی نہ بھری۔ آج سے ۳۰ رسال پہلے پاکستان میں پلاسٹک سرجری کا شعبہ موجود نہ تھا۔ اس لیے چودھری بہاول بخش کی اُمید پوری نہ ہوئی۔ چودھری قدرداد ٹیڑھے چہرے کے ساتھ جوان ہوا اور اَب اُس کی شادی ایک مسئلہ بن گئی تھی۔

چودھری بہاول بخش نے بڑی کوشش کی کہ اُس کی ذات برادری سے اُس کے مقابلہ کے کسی گھرانہ سے اُس کے بیٹے کو رشتہ مل جائے لیکن اُسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اپنے ہم پلہ گھرانوں سے مایوس ہوکر اُس نے اپنے سے کمتر خاندانوں کی طرف جھانکنا شروع کردیا اور نظرِ انتخاب صُغراں کے گھر آن ٹھہری۔

صُغراں کا باپ بھی زمیندار تھا لیکن چھوٹا زمیندار تھا۔ اُس کے پاس صرف ۵/۱ ایکڑ زمین تھی لیکن کہلاتا وہ بھی چودھری تھا۔ چودھری احمد خاں، اُس کے ۲ ربیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ تھے تو وہ چودھری لیکن اُن میں چودھریوں والی کوئی خُوبُو نہ تھی۔ وہ بڑا مسکین گھرانہ تھا۔ تھوڑی سی آمدن تھی۔ تنگی ترشی سے گزارا کرتے تھے۔ زمیندار تو زمیندار، کمی کمین بھی اُن پر رُعب ڈال لیتے تھے اور وہ صبر کرکے وقت گزار لیتے تھے۔ جب چودھری بہاول بخش نے اُن سے رشتہ مانگا تو انھوں نے ہاں کرنے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہ کی۔ کہاں اُن کے ۵/۱ ایکڑ اور کہاں چودھری بہاول بخش کے ۷ رمربعے وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھنے لگے کہ ایک بڑے چودھری کے ساتھ اُن کی رشتہ داری پکی ہونے والی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ اُن کی بیٹی راج کرے گی اور چودھری بہاول بخش سے رشتہ داری کرکے اُن کی سماجی حیثیت بلند ہوجائے گی۔ اب کوئی کمی کمین تو کیا کوئی زمیندار بھی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھ سکے گا۔ چودھری احمد خاں خوش ہوگیا۔ اُس کی بیوی خوش ہوگئی، اُس کے بیٹے خوش ہوگئے اور اُس کی بیٹی، اُس کی لاڈلی، خوش شکل صُغراں...... وہ...... وہ بھی شاید خوش ہی تھی۔ اُس نے کوئی حرفِ انکار تو زبان سے نہیں نکالا تھا۔ جب اُس نے انکار نہیں کیا تھا تو کوئی کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ اُس رشتہ سے خوش نہیں تھی۔

بات پکی ہوگئی تو دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ چودھری بہاول بخش نے چودھری احمد خاں سے ملاقات میں کہا کہ شادی دھوم دھام سے ہوگی لیکن سارا خرچہ وہ خود برداشت کرے گا۔ چودھری احمد خاں کے پاس انکار کی کوئی وجہ نہ تھی۔ شادی اتنی دھوم دھام سے ہوئی کہ سارا علاقہ دنگ رہ گیا۔ ۷ ردن آتش بازی ہوتی رہی۔ دُلہن کو ایک سیر طلائی زیورات پہنائے گئے۔ ۱۰۱ جوڑے کپڑے تیار ہوئے۔ سارے گاؤں کے ساتھ ساتھ ضلع بھر کے معززین کو بارات اور ولیمہ کا کھانا کھلایا گیا۔ شادی ہوگئی۔ صغراں کی نئی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ وہ ایک معمولی زمیندار کی بیٹی کے بجائے گاؤں کی سب سے بڑی چودھرانی بن گئی۔ بڑی حویلی، بیسیوں ملازم، بہترین کھانا، اعلیٰ لباس، پیار کرنے والے ساس اور سُسر، تابع فرمان شوہر اور زندگی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ اللہ نے صُغراں کو ایک بیٹا دیا۔ ۳۰ رسال میں یہ واحد اولاد نوررداد اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ قدرداد اور دادا بہاول بخش بھی اکلوتے ہی تھے۔ لپکتے جھپکتے ۳۰ رسال گزر گئے۔ جب نوررداد کے لیے دُلہن کی تلاش شروع ہوگئی۔

گزشتہ ۲ ربرس سے نزدیکی علاقہ میں دُلہن تلاش ہوتی رہی۔ من پسند دُلہن نہ ملنے پر دور دراز کے رشتہ داروں کی باری آئی اور صُغراں اپنے میاں کے ساتھ میزبانوں کے گھر پہنچ گئی۔ بچی اُسے پسند آگئی لیکن ایک مسلسل اضطراب نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

دونوں میاں بیوی اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ بلب بجھا دیا گیا۔ گھپ اندھیرے میں صُغراں بستر پر لیٹی اپنی زندگی کے اوراق پلٹنے لگی۔ ماں باپ کے گھر اُس نے تنگی تُرشی سے زندگی بسر کی لیکن وہ مطمئن تھی۔ سسرال آکر اُسے دنیا جہان کی نعمتیں اور علاقہ پر حکومت ملی۔ اُسے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن کیا وہ خوش تھی؟ ایک طرف دنیا جہان کی نعمتیں تھیں اور دوسری طرف چودھری قدرداد جیسا جیون ساتھی۔ کیا اُس نے گزشتہ ۳۰ ربرس خوشی کے گزارے تھے؟ اُس نے اپنے میاں کو خوش رکھا، اپنے سسرال کو خوش رکھا، اپنے میکے کو خوش رکھا لیکن کیا کبھی کوئی خوشی کی کونپل اُس کے دل میں بھی پھوٹی؟ دو آنسو اُس کی آنکھوں سے نکلے اور اُس کے گالوں پر بہنے لگے۔ اُس کا بیٹا نوررداد بھی خوش شکل نہ تھا۔ اُس کا رنگ گہرا سانولا اور ایک ٹانگ میں لنگ تھا۔ وہ ایک خوبصورت دُلہن کا انتخاب کر بیٹھی تھی۔ کیا دُلہن بھی خوش رہے گی؟ یا اُس کی طرح ساری زندگی گھٹ گھٹ کر جیے گی۔ وہ ایک ماں تھی۔ اُسے ایک خوبصورت بہو درکار تھی لیکن وہ ایک عورت بھی تھی۔ اُس کی اپنی زندگی تو انگاروں پر گزری تھی کیا وہ ایک اور عورت کو اسی اذیت سے دوچار کردے؟

”نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ جوڑی مناسب نہیں۔“ اُس نے سوچا اور سوگئی۔

صبح اُٹھتے ہی اُس نے چودھری قدرداد کو بتا دیا کہ اُسے لڑکی پسند نہیں۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنے کی تیاری کرے۔ چودھری قدرداد حیران رہ گیا لیکن حسب معمول وہ کچھ کہہ نہ سکا اور گھر پہنچ کر بھی اُس نے صرف یہی کہا:

”کرماں والیے اِک تے تیری وی کوئی سمجھ نمیں آوندی۔“ ■

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

بارش تھمی تو میں خیمہ سے باہر نکل آیا۔ آدھے سفید اور آدھے کالے بادل ٹھنڈی ہوا کے دوش پر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ مجھے کافی بھوک لگی تھی، اس لیے میں نے سوچا کہ کھانا تیار کر لیا جائے۔ یہ سوچ کر میں خیمے میں گیا، جہاں میرے ماموں جان ابھی تک خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ میں نے خیمے سے کچھ لکڑیاں لیں اور باہر آگ جلا کر مچھلی کا سالن پکانے لگا۔

سالن پکنے اور لکڑیاں جلنے کی آواز سُن کر ماموں بھی جاگ اٹھے اور جمائیاں لیتے ہوئے خیمے سے باہر نکل آئے۔ پھر ہاتھ مُنہ دھو کر میرے ساتھ آگ کے قریب بیٹھ کر ہاتھ پاؤں سینکنے لگے۔

اتنے میں ۲ سفید بگلے اڑتے ہوئے ہمارے اوپر سے گزرنے لگے۔ میں دوڑتا ہوا خیمے میں گیا اور بندوق اٹھا کر اُن پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ ماموں نے بندوق زور سے پکڑ لی۔ وہ بڑی معصومیت سے ان دونوں پرندوں کو اُڑتے دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا "مگر کیوں ماموں جان......؟ آج تو کافی سردی ہے۔ ان کے گوشت کی یخنی تو بڑے مزے کی ہوتی ہے۔"

"نہیں...... نہیں" انھوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "میں تمھیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

میں نے بندوق خیمے کے اندر بستر پر پھینک دی اور پوچھا "ماموں! یہ بگلے ہمارے گاؤں میں کیوں نہیں آتے؟ میں نے تو کبھی ان کو نہیں دیکھا۔"

"ہاں بیٹا! ان بے چاروں نے ہمارے گاؤں میں آنا چھوڑ دیا ہے۔" ماموں کی آنکھیں بھر آئیں۔

"مگر کیوں ماموں جان......؟" میں نے پوچھا۔

"ان کو میں نے ہی ستایا تھا۔ یہ باہر کی طرح اندر سے بھی اتنے ہی سفید ہیں۔ یہ بڑے معصوم ہیں، کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے۔ ان کو دکھ پہنچتا ہے تو خود کہیں اور چلے جاتے ہیں۔"

ماموں کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹپکنے لگے اور مجھے ایسے گھورنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ میں بات سمجھا یا نہیں۔

"ماموں...... سنائیں تو...... آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا......" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"اس بات کو ۴۰ برس گزر چکے ہیں......" ماموں نے بتانا شروع کیا، "ایک مرتبہ میں سکول سے واپس آیا تو نانی اماں نے کہا کہ بیٹا بگلے بھاگ والے ہوتے ہیں۔ یہ اگر ہمارے ساتھ رہیں گے تو ہم مالدار ہو جائیں گے۔ آؤ تو ان کو سدھائیں۔"

پھر میں نے بیل گاڑی کا ایک پہیہ لیا اور چھت پر رکھ کر اس کے اوپر چند پرانے کپڑوں کے ٹکڑے ڈال دیے۔ شام ہوئی تو چھت کے اوپر سے گزرتے ہوئے ایک بگلے کی نظر اس بنے بنائے گھونسلے پر پڑی۔ وہ کافی دیر اس کے اوپر چکر لگا کر چھت پر اُترا اور اس گھونسلے کو گھورنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اُڑ گیا اور دوسرے دن شام کو اپنی مادہ کے ساتھ چھت پر اترا۔

پھر دونوں نے تنکے اور گھاس پھوس جمع کر کے ایک بڑا گھونسلا بنایا اور مزے سے رہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد مادہ نے گھونسلے میں ۴ انڈے دیے اور ان کو سینے کے لیے بیٹھ گئی۔ نر بگلا سارا دن باہر رہتا تھا اور جب وہ واپس آتا تو مادہ بے چاری اُڑ کر قریب والے کھیتوں میں سے کیڑے مکوڑے کھا کر اور پانی پی کر واپس آجاتی تھی۔ اتنی دیر بگلا انڈوں پر آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہتا تھا۔

ایک دن مجھے شرارت سُوجھی اور مادہ کو گھونسلے سے اُڑا کر اس کے انڈوں کے ساتھ مرغی کا ایک انڈا بھی رکھ دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ کچھ ہوا ضرور ہے، لیکن یہ نہیں جان سکی کہ کیا ہوا ہے اور اُسے یہ پتا بھی نہیں چل سکا کہ اس کے گھونسلے میں ۴ کی بجائے ۵ انڈے پڑے ہیں۔

ایک دن ۴ سفید بچے انڈوں سے نکلے۔ ان کی

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

ایک دفعہ بہت سے امیر اپنی نذروں کے روپے ہیکل کے بیت المال میں ڈال رہے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ایک مفلس بیوہ کو بھی اس میں ۲؍ دمڑیاں ڈالتے دیکھا تو فرمایا ''دیکھو! اس مفلس بیوہ نے سب سے زیادہ حصہ ڈالا کیونکہ ان سب امیروں نے اپنے مال کی بہتات سے تھوڑا سا حصہ ڈالا مگر اس نے اپنی ناداری کی حالت میں جتنا سرمایہ اس کے پاس تھا، سب کا سب ڈال دیا۔''

چونچیں اور پاؤں گلابی تھے۔ باقی ایک انڈا رہ گیا تھا اور ٹھیک اکیسویں دن ایک ننھا چوزہ اس انڈے سے نکل آیا اور چیں...... چیں...... کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو، ''امی بھوک لگی ہے...... امی بھوک لگی ہے۔'' مادہ کو یہ چوزہ دیکھ کر حیرت تو ہوئی، لیکن چوزے کے جسم پر اپنی چونچ گھما کر اسے پیار کرنے لگی۔

بگلا جب شام کو آیا تو چوزے کو دیکھ کر آگ بگولا ہوگیا اور مادہ کی طرف نفرت سے دیکھنے لگا۔ اس نے مادہ کو کچھ دیر گھور کر دیکھا اور پَر پھڑ پھڑا کر کھیتوں کی طرف اُڑ گیا اور ساری رات باہر رہا۔

دوسرے دن صبح بگلا اپنے چھ سات ساتھیوں سمیت چھت پر اُترا۔ ساروں نے باری باری اپنی چونچ سے بے چاری مادہ کو زخمی کردیا۔ وہ بے چاری اپنے بچوں کو پَروں میں چھپا کر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ جب بگلا اپنے ساتھیوں کو لے کر اُڑ گیا تو مادہ اُٹھی اور قریب والے تالاب سے ۲؍ بڑے کیڑے اپنے بچوں کو کھلانے کے لیے لائی۔ کھانا کھانے کے بعد جب وہ اپنے بچوں سے کھیل رہی تھی، تب میں نے چھت پر چڑھ کر اُسے گھونسلے سے اُڑا دیا اور چوزہ اُٹھا کر بھاگنے لگا تو وہ میری طرف بڑی تیزی سے لپکی۔ ڈر کے مارے چوزہ میرے ہاتھ سے گر کر مر گیا اور میں مرا ہوا چوزہ اُٹھا کر چھت سے نیچے اُتر آیا۔ وہ بے چاری چیخ و پکار کرنے لگی اور ہمارے گھر کے اوپر چکر کاٹ کاٹ کر جب تھک گئی تو اپنا سفید جسم بیل گاڑی کے پہیے سے رگڑنے لگی اور پھر اپنے ۴؍ بچوں کے ساتھ گھونسلے میں بیٹھ گئی۔

اکیلی ماں صبح سے شام تک اپنے بچوں کے لیے کھانا لانے میں مصروف رہتی تھی۔ جب تک بچے اُڑنے کے لائق نہ ہوئے، اس بے چاری نے بڑے بڑے دُکھ جھیلے۔ جب چاولوں کے کھیت کٹ گئے اور راتیں ٹھنڈی ہونے لگیں تو اس نے اپنے بچوں کو ایک لمبے سفر کے لیے تیار کیا۔

ایک دن صبح کو بگلوں کا ایک بڑا غول گرم علاقوں کو جانے لگا تو اس نے اپنے بچوں کو پیار کرکے رخصت کیا۔ وہ غول کو کافی دیر تک گھورتی رہی اور جب آخری پرندہ بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تو وہ اوپر اُڑ گئی اور اپنے گھونسلے کے اوپر آخری بار چکر لگا کر چیخنے چلانے لگی۔ پھر اس نے اپنے پَر بند کیے اور اپنے آپ کو کسی پتھر کی طرح چھت پر وہاں گرا دیا، جہاں چوزہ میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر مر گیا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر بے چاری مادہ کو اُٹھانا چاہا، لیکن اس نے دم توڑ دیا تھا۔

وہ دن اور آج کا دن...... ان بگلوں نے ہمارے گاؤں میں بسیرا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جب بھی سردیوں کا موسم آتا ہے تو بگلے اپنے پُرانے گھونسلوں کو دیکھ کر اپنے گھونسلوں کی طرف چیختے چلاتے چلے جاتے ہیں۔ پرانے گھونسلے اور پرانے زخم انھوں نے نہیں بھلائے ہیں۔''

یہ کہہ کر ماموں جان آنسو پونچھتے ہوئے خیمے میں چلے گئے۔ میں بھی دیگچی اُتار کر ان کے پیچھے چل دیا...

افسانہ نگار ان دنوں پی ٹی وی کراچی میں پروڈیوسر ہیں

نفاست کی واپسی

جنوبی سوڈان کے دور افتادہ گاؤں میں
کینٹینرز میں آباد بستی میں مقیم
ایک پاکستانی افسر کی جنونی محبت کا ماجرا

اس کی ہمسائیگی میں ایک روز یوگنڈا کی
'خوش جمال' خاتون آن بسی تھی

ناصر محمود ملک

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنوبی

سوڈان کے دور افتادہ اور انتہائی پسماندہ گاؤں میں اقوام متحدہ نے امن مشن کے ایک کیمپ قائم کیا تھا۔ یہ دراصل ایک چھوٹی سی بستی تھی جو ''کنٹینرز'' پر مشتمل تھی۔ کنٹینر درحقیقت، ایئر کنڈیشنر، ضروری فرنیچر اور دوسرے لوازمات سے آراستہ ایک کمرا تھا۔ چار چار کنٹینرز کو ایک گروپ کی شکل میں یوں رکھا گیا تھا جیسے ایک پھول ہو جس کی چار پتیاں ہوں۔ ان کے درمیان صحن کے لیے خالی جگہ چھوڑی گئی تھی۔ سوڈان کے اس حصے کی زمین کا رنگ سرخی مائل ہے۔ سرخی مائل زمین پر یہ سفید کنٹینرز گروپ کی شکل میں رکھے گئے تھے۔ ساری بستی اسی طرز پر بنائی گئی تھی، چنانچہ ہیلی کاپٹر پر آتے جاتے جب ہم اس کیمپ کا فضائی نظارہ کرتے تو یوں لگتا جیسے بہت سے کنول ایک جھیل میں کھلے ہوئے ہیں۔

اس بستی میں پچاس ساٹھ ممالک کے کوئی ۵۰۰ر کے قریب باشندے آباد تھے، جو یہاں امن مشن کے لیے آئے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کو سنگل کنٹینر الاٹ کیا گیا تھا۔ رہائش مخلوط تھی یعنی آپ کے سامنے والے کمرے میں کوئی خوش جمال، خوش گفتار حسینہ بھی رہائش پذیر ہوسکتی تھی اور دوسری طرف ڈارون کی تھیوری کو تقویت دینے والا کوئی ۷ر فٹا کالا بھجنگ افریقی بھی ہوسکتا تھا۔ سارا کھیل قسمت کا تھا۔

امن مشن کے لیے متذکرہ بالا کیمپ میں ہماری پوسٹنگ ہوئی تو ہم یو۔ این کے ہیلی کاپٹر کے ذریعے یہاں پہنچے۔ کیمپ میں لینڈ کیا تو دوپہر کا عمل تھا۔ رسمی کارروائیوں سے فارغ ہوئے تو ایک صاحب ہمیں ہمارا رہائشی کنٹینر دکھانے لے گئے۔ سامان وغیرہ سیٹ کرنے کے بعد ذرا محل وقوع کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے سامنے اور قریب ترین کمرے میں جو صاحب رہائش پذیر ہیں وہ کوئی اور نہیں اپنے پاکستانی بھائی ہی ہیں، جن کا اسم شریف نجمی صاحب ہے۔ ہمیں بڑی عجیب سی حیرت ہوئی۔ وطنِ عزیز پر جان بھی قربان ہے لیکن وطنِ پاک سے ہزاروں میل دور اس بے آب وگیاہ افریقی صحرا میں ہم سے پہلے موجود اپنے ایک ہم وطن کو پڑوسی پاکر نجانے کیوں ہماری کیفیت اس دیہاتی کے مانند تھی جو کئی روز مسلسل 'ساگ' کھا کھا کر اکتا جاتا اور گھر سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے لیکن سارا دن میلوں سفر کرنے اور راستے میں جنگل اور دریا عبور کرنے کے بعد جب رات وہ کسی دور دراز کے دیہات میں کسی کا مہمان بنتا ہے تو اسے اس وقت شدید دھچکا لگتا ہے جب رات کے کھانے میں اسے ''ساگ'' پیش کیا جاتا ہے۔ وہ سخت حیران ہوکر ساگ سے سوال کرتا ہے، ''اوہ نیک بختا......! یہ بتا تو مجھ سے پہلے یہاں کیسے پہنچ گیا؟ ہم بھی نجمی صاحب سے یہی سوال پوچھنا چاہتے تھے کہ جناب آپ یہاں کیسے؟ مگر ابھی اس کا موقع نہیں تھا۔

کنٹینر میں ذرا ستانے کے بعد، ہم ذرا ''کرٹسی کال'' کے لیے نجمی صاحب کی طرف چلے گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو قدرے توقف کے بعد اندر آنے کی اجازت ملی۔ اندر داخل ہوکر ہم نے بڑے پُرجوش انداز میں سلام کیا لیکن دوسری جانب سے انتہائی سردمہری سے جواب دیا گیا۔ اپنا مختصر تعارف کرایا جس کے بعد ہمیں ایک پرجوش معانقے کی توقع تھی لیکن صاحب! یہ کیا! معانقہ تو درکنار، صاحب تو ڈھنگ سے ہاتھ ملانے کو بھی تیار نہ تھے۔ بیٹھے بیٹھے بڑی مشکل سے مصافحے کے لیے اُنھوں نے ۳ر اُنگلیاں بڑھائیں۔ اس اُدھورے سے مصافحے کے بعد ہم نے ابھی رسمی گفتگو کا آغاز ہی کیا تھا کہ اُنھوں نے ہمیں تقریباً روکتے ہوئے سوال پوچھا کہ آپ کا 'امن مشن' کب ختم ہوگا؟ مشن میں یہ ہمارا پہلا دن تھا، بلکہ ہمیں یہاں پہنچے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ ایسے میں ہمیں یہ غیر متوقع سوال انتہائی غیر اخلاقی اور بڑا بے ہودہ سا لگا۔ بہرحال ہم نے جواب دیا کہ صاحب ہمارا مشن آپ کے بعد شروع ہوا ہے جب بھی ختم ہوگا آپ کے بعد ہی ختم ہوگا۔ یوں نجمی صاحب سے ہماری پہلی ملاقات ختم ہوئی۔

نجمی صاحب سے پہلی ملاقات مختصر اور مایوس کن تھی۔ آگے چل کر جب ان کی شخصیت ذرا کھلنا شروع ہوئی تو ہم گویا حیرتوں میں گم ہوتے چلے گئے۔ نجمی صاحب ایک دھان پان سے آدمی تھے۔ سرخ و سپید رنگت، عمر یہی کوئی ۵۵ر کے قریب۔ پاکستان میں سینئر عہدے پر فائز تھے، اک عرصے تک وہاں اپنی ''قابلیت'' کے جھنڈے گاڑنے کے بعد اب یو۔ این میں اپنا لوہا منوانے امن مشن پر ادھر سوڈان آئے تھے۔ نجمی صاحب ''آبِ حیات کو بھی اُبال کر'' پینے والے آدمی تھے۔ نفاست آپ کی شخصیت کی امتیازی صفت تھی۔ ہم نے ان جیسا نفیس انسان زندگی بھر نہیں دیکھا۔ بخدا اس قدر نفاست کہ دیکھنے والے کو 'گھن' آتی تھی۔ ان کی شخصیت اس ''نفاست'' کی دبیز، بلکہ ''کثیف'' تہہ کے نیچے دب کر رہ گئی تھی۔ ہاتھ دھونا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ چنانچہ دفتری معاملات اور چند دیگر امور نمٹانے کے بعد ہم نے انہیں صرف ہاتھ دھوتے ہی دیکھا ہے۔ ہمارے کمروں سے کوئی ۵۰ر گز دور مشترکہ باتھ رومز بنائے گئے تھے۔ دن رات کے کثیر اوقات میں ہم نے انہیں اسی راستے پر پایا، ہاتھ دھونے جارہے یا دھوکر واپس آرہے ہیں۔ کئی مرتبہ ہم نے مشاہدہ کیا کہ ہاتھ دھونے کے بعد جو سب سے پہلا کام انھوں نے کیا وہ یہ تھا کہ دوبارہ ہاتھ دھونے جارہے ہیں۔ اتنی کثرت سے ہاتھ دھونے پر تو گماں گزرتا کہیں اپنے ہاتھوں سے ہی ''ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔'' معروف ڈراما نگار شیکسپیئر کے شاہکار ڈراما ''Macbeth'' میں ایک کردار لیڈی میکبتھ کا ہے جو ہمہ وقت ہاتھ دھوتی رہتی ہے۔ قارئین جانتے ہیں کہ اس کرم جلی کے ہاتھ تو کسی کے خون میں رنگے تھے لیکن نجانے نجمی صاحب کے ہاتھوں پر کون سی ''آلائشیں'' تھیں جو کسی طور دُھلنے میں نہیں آتی تھیں۔ لیجیے! نجمی صاحب ہاتھ دھوکر واپس آگئے ہیں تو اب اپنے کمرے کا دروازہ کھولنا اک دوسری مصیبت ہے۔ اب آپ کی پوری کوشش ہے کہ ہاتھ کی سیدھی سائیڈ کسی چیز سے چھونے نہ پائے (کیونکہ ہر چیز آلودہ جو ہے) آپ نے ایک ہاتھ میں ٹشو پیپر کی مدد سے صابن دانی ایسے تھامی ہوئی ہے جیسے مائیں بچوں کے استعمال شدہ پیمپر پکڑتی ہیں۔ دوسرے ہاتھ سے ٹشو کی مدد سے اپنی جیب سے کمرے کی چابی نکال کر لاک کھولتے ہیں۔ پھر ہاتھ کی پشت سے دروازہ کا ہینڈل نیچے کرتے اور کہنی یا گھٹنے کی مدد سے دروازہ کو ہلکی ٹھوکر لگا کر کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی کشمکش میں اکثر ایسا ہوتا کہ صابن دانی سے ''منحوس'' صابن لڑھک کر نیچے گر جاتا اور یہ گویا مصیبت کی انتہا ہوتی۔ آپ سر پیٹتے، کسی نامعلوم مخاطب کو گالیاں دیتے ہوئے گرد آلود صابن دوبارہ اُٹھاتے اور پھر وہیں سے "U TURN" لے لیتے اور یوں پھر صابن اور ہاتھ دھونے کے تمام تکلیف دہ مراحل دوبارہ شروع ہو جاتے۔ ہم یہ ''ابنارمل مشق'' روزانہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا کرتے۔

نجمی صاحب کو ہر طرف میل اور جراثیم نظر آتے تھے۔ اپنی ذات سمیت ہر چیز کو آلودہ گردانتے تھے۔ کسی کے ساتھ مصافحہ کرنا ان کے لیے بڑی مصیبت تھی اور معانقہ تو موت کے برابر تھا۔ عموماً مصافحہ سے حتی الوسع گریز کرتے لیکن اگر کبھی کرنا پڑتا تو خاصے پریشان ہو جاتے۔ لیکن اگر اُنھیں کبھی اس وقت مصافحہ کرنا پڑتا جب وہ ہاتھ دھوکر واپس آرہے ہوتے تو ان کی بے بسی و بے چینی دیدنی ہوتی۔ پہلے تو وہ کسی کو آتا دیکھ کر مصافحے کے ''اذیت ناک'' مرحلے سے بچنے کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشتے۔ وہ اپنا رستہ بدل لیتے، وہیں رخ پھیر کر رک جاتے یا موبائل فون پر فرضی کال سننا شروع کردیتے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ بعض لوگوں کو ہر صورت مصافحہ کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ، ان کے نزدیک اگر کوئی ایسا ''ضدی'' ملاقاتی باقاعدہ ''ہوم ورک'' کرکے ان کا تقریباً ''محاصرہ'' کرتے ہوئے انہیں مصافحے پر مجبور کرتا تو وہ آخری حربے کے طور پر اپنے ہاتھ گیلے ہونے کا ظاہر کرکے کلائی اور کہنی کا درمیانی حصہ (جو کہ شرٹ سے ڈھکا ہوتا) آگے کردیتے کہ چل یہیں کہیں اپنی خواہش مصافحہ پوری کرلے اور چلتا بن۔ اس پر بھی اگر اس منچلے ملاقاتی کی تسلی نہ ہوتی اور وہ ان کی تمام احتیاطیں اور ''پیچ بچے'' کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مصافحے کے لیے ان کا ہاتھ تھام لیتا تو، یقین جانیے، ان کے اوپر گویا موت طاری ہوجاتی، ان کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آتی جس کے پیچھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بے پناہ کرب ہوتا۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس کی مثال صرف مونالیزا کی تصویر میں ملتی ہے۔ روایت ہے کہ مونالیزا کی کمر میں خنجر گھونپا گیا، بے پناہ کرب کا اظہار اس نے اپنی لازوال مسکراہٹ سے کیا جسے مصور نے کینوس پر اتار کر اَمر کر دیا۔ اس زبردستی کے مصافحے کے بعد، وہ "ستم ظریف" تو اپنی راہ لیتا جبکہ اپنے نجمی صاحب وہیں سے "یوٹرن" لیتے اور دوبارہ ہاتھ دھونے چلے جاتے۔ بعض اوقات ایک دن میں ہم کئی 'یوٹرن' دیکھتے۔ مصافحے کا یہ نظریہ بے چارے افریقی کالوں کے ساتھ کچھ اور بھی سخت تھا۔ ان کے ساتھ کبھی مصافحے کا "حادثہ" پیش آجاتا تو مسئلہ اور بھی سنگین ہو جاتا۔ فرماتے تھے "ان سے مصافحہ کرنے سے جو آلائشیں لگتی ہیں وہ صابن وغیرہ سے صاف نہیں ہوتیں۔ ہاتھ کو گھنٹہ بھر پھٹکری اور عرقِ گلاب میں ڈبو کر رکھتا ہوں تو تسلی ہوتی ہے۔"

لیکن مصافحہ کرنے میں ایک استثنائی صورت بھی تھی، اور وہ یہ کہ اگر کوئی صنفِ نازک نجمی صاحب سے مصافحہ کرتی تو ان کا "نظریۂ طہارت" فوری طور پر کسی "نظریۂ ضرورت" کے تحت دب جاتا۔ وہ اس خاتون سے نہ صرف بڑے تپاک سے ہاتھ ملاتے بلکہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے دیر تک "سہلاتے" رہتے۔ اس ضمن میں ان کے مردوں کے ساتھ "امتیازی سلوک" کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک دن ہم نے عرض کیا کہ صاحب "کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟" فرمانے لگے "حضرت! اول تو خواتین کے ہاتھوں پر جراثیم کم ہوتے ہیں اور اگر ہوں بھی تو وہ ان کی طرح نحیف و نازک سے ہوتے ہیں جو دورانِ مصافحہ آگے "شفٹ" نہیں ہوتے۔

نجمی صاحب کو صفائی ستھرائی کے متعلق جس واحد چیز پر بھروسا تھا وہ تھی "ٹشو پیپر"۔ چنانچہ ٹشو پیپرز کا بے دریغ استعمال کرتے۔ ٹشو کے مقابلے میں وہ اپنے ہاتھوں کو بھی آلودہ سمجھتے جنھیں سنبھالنے کی وہ ہزار احتیاط کرتے۔ اپنے ننگے ہاتھ سے صرف ٹشو کو چھوتے اور باقی کسی بھی صاف یا خراب چیز کو پکڑنا، چھونا ہو تو ٹشو استعمال کرتے۔ صاف چیز کے لیے ٹشو کا استعمال اس خیال کے تحت تھا کہ کہیں "آلودہ ہاتھ" اسے خراب نہ کر دے اور خراب چیز کے لیے یوں کہ کہیں وہ "صاف ہاتھ" کو خراب نہ کر دے۔ یو این کے متفرق سٹور سے ہر ہفتے ہمیں ٹشو کے ۲/۲ بڑے "رول" ملتے تھے۔ نجمی صاحب دو تین دنوں میں ہی وہ ختم کر لیتے اور پھر مانگے تانگے پر گزارا ہوتا۔ ایسے میں ان کا پہلا اور پکا "شکار" میں تھا۔ تیسرے دن ہی وہ ہاتھ میں ٹشو پکڑے آن دھمکتے اور ایک ہی مخصوص جملہ بولتے "ملک صاحب! آپ کے پاس ٹشو پیپر ہوں گے؟ ذرا دکھائیے گا۔" میں ان کو ٹشو پیپر لا کر دکھاتا اور پھر خود دیکھتا رہ جاتا۔ میرے علاوہ اور لوگ بھی اس "کارِ خیر" میں شامل ہوتے تھے۔ کچھ عرصے سے میں نے روٹین بنالی تھی کہ چند ٹشو رکھ کر باقی دونوں رول ان کے حوالے کر دیتا کہ انہیں کوفت نہ ہو۔ دوسری جدید ایجادات کے برعکس وہ ٹشو کو بہترین ایجاد قرار دیتے۔ ایک دن ہم نے ٹشو کے اس قدر استعمال اور اس پر ان کے اعتماد کی طرف توجہ دلائی اور ان سے بڑے ادب سے پوچھا "حضرت! کیا پتا ان کا میٹریل صحیح ہوتا ہے یا نہیں اور "پراسس" ٹھیک کرتے ہیں یا نہیں۔ اس پر انھوں نے پہلے تو ٹشو پیپر کی "مینوفیکچرنگ" کے دوران صفائی ستھرائی پر بڑی طویل و گمبھیر تقریر کی، جس سے میں جلدی متاثر ہو گیا تا کہ تقریر مزید لمبی نہ ہو۔ پھر میرے ذرا قریب ہو کر انھوں نے ٹشو پیپر میں لپٹا ہوا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا اور فرمانے لگے "ملک صاحب! "وہم کا کوئی علاج نہیں ہے۔ صفائی ستھرائی کے بارے میں اس قدر بھی احتیاط نہیں کرنی چاہیے کہ زندگی اجیرن ہو جائے۔ کام اللہ توکل چلتا ہے۔ بابا......! آپ تو بہت ہی وہمی ہیں۔" میں نے فوراً اعتراف کیا کہ میں زیادہ "وہمی" ہو گیا تھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس دن میری اصلاح پر نجمی صاحب بہت خوش تھے۔

ہمارے گروپ کے ۴/کنٹینرز کی صورتِ حال یہ تھی کہ میرے سامنے نجمی صاحب کا کنٹینر تھا۔ دائیں طرف کے کنٹینر میں برازیلین آرمی کا ایک میجر، ڈینئل رہائش پذیر جبکہ بائیں جانب والا کنٹینر کچن کے طور پر استعمال ہو رہا تھا جس میں الیکٹرک چولھے اور واش بیسن وغیرہ موجود تھا۔ چاروں کنٹینرز کے درمیان میں کوئی تین چار مرلے جگہ خالی

تھی جو صحن کا کام دے رہی تھی۔ تھوڑا وقت گزرا تو نجمی صاحب سے میل ملاپ بھی قدرے بڑھتا گیا۔ یو این کی اس پوری بستی میں ہم صرف ۲/ پاکستانی تھے۔ مزاجوں میں 'بُعدِ مشرقین' ہونے کے باوجود ملاقاتوں کا ایک معمول خود بخود بن گیا تھا۔ روزانہ سرِشام ہم اپنی اپنی کرسیاں کھینچ کر مشترکہ صحن میں بیٹھ جاتے اور گفتگو شروع ہو جاتی۔ گفتگو عموماً بے سروپا اور "لایعنی ٹائپ" ہوتی یعنی نہ مناسب آغاز نہ منطقی انجام۔ کسی موضوع پر اتفاق تو دور کی بات ہم تو ڈھنگ سے اختلاف بھی نہیں کرتے تھے۔ بس اپنی اپنی بات اور اپنا اپنا موضوع، میں نے اگر ہم پاکستانیوں کے "فیورٹ" موضوع "سسٹم کی بدحالی" پر گفتگو شروع کی تو موصوف نے اپنے گھٹنے پر لگی پرانی چوٹ کا تذکرہ چھیڑ دیا جس کا ذکر وہ پہلے بھی اتنی بار کر چکے تھے کہ اب مجھے بھی اپنی اسی جگہ پر درد محسوس ہونے لگا تھا۔ دوسری طرف وہ اگر لوگوں میں شعور و فہم کی شدید کمی کا خدشہ ظاہر کرتے (جبکہ لوگوں کو موصوف میں مذکورہ کمی کا یقین تھا) تو مجھے نجانے کیوں پاکستان کی کرکٹ میں آخری شکست یاد آجاتی۔ لیکن اس بے ربط، بے جوڑ، "سوال گندم جواب چنا" ٹائپ گفتگو کے باوجود ہم دونوں کو شام کی "بیٹھک" کا انتظار رہتا۔

دائیں طرف والے کمرے میں رہائش پذیر برازیلین میجر ڈینئل ایک "پلے بوائے" ٹائپ افسر تھا۔ آفس کے بعد سہ پہر کو وہ یو این کیمپ کے ٹریک پر تادیر 'جوگنگ' کرتا اور پھر سرِشام نہا دھو کر اپنے کمرے میں آبیٹھتا۔ اس کا کمرا ہمیشہ آباد اور بارونق رہتا۔ شام کے بعد یہ رونق اپنے عروج پر ہوتی۔ کیمپ کی خوبصورت لڑکیاں کسی مقناطیسی قوت کے تحت اس کمرے کی طرف کھنچی چلی آتیں۔ کمرے میں ایک محفل کا سماں رہتا۔ باہمی خورونوش کا اہتمام ہوتا۔ چائے کافی کے بعد آخر آخر مشروبِ مغرب کا دور چلتا۔ دیر تلک جام چھلکتے رہتے۔ دوسری طرف ہمارے کمروں میں ہمہ وقت "اداسیاں بال کھولے سوئی رہتیں"۔ شام ذرا گہری ہوتی تو کمرے سے جام ٹکرانے اور نقرئی قہقہوں کی دلنشیں آواز کے ساتھ ساتھ لیپ ٹاپ پر کسی بدیسی نغمے کی مدھر دھنیں ہماری سماعتوں سے ٹکراتیں تو ہماری اداسی اور بے کلی اور بھی بڑھ جاتی۔ "کوہ قافی پریوں" کے اُترنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ ایسے میں جب کوئی گل بدن ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے مسکراتے چہرے اور اک ادائے دل رُبا سے ہمیں "ہائے" کہتی تو جواب میں نجمی صاحب کے سینے کے اندر کہیں بہت گہرائی سے آہِ سرد میں لپٹی "ہائے" نکلتی۔ ایسے موقعے پر اکثر یہ شعر پڑھتے۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن! کچھ تو ادھر بھی

ایک دن اچانک خبر سنی کہ میجر ڈینئل "چیک آؤٹ" کر رہا ہے۔ خاصی "امید افزاء" خبر تھی۔ ہم نے سوچا چلیں وہ "بے ہودہ" محفلِ شبانہ تو ختم ہوگی جو ہماری بے سکونی کا ایک بڑا سبب تھی۔ اس شام میجر ڈینئل کے کمرے میں الوداعی محفل کا اہتمام تھا۔ آج معاملہ بڑا الٹ تھا۔ اندر کی فضا خاصی اداس تھی۔ لیپ ٹاپ پر کوئی غمگین دھن بج رہی تھی جبکہ دوسری طرف نجمی صاحب کے اداس چہرے پر پہلی مرتبہ خوشی کے آثار بڑے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ڈینئل کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے "کمبخت راجہ اندر ہوا تھا۔ ملک صاحب! نجانے کیوں مجھے تو اس کی موجودگی میں احساسِ کمتری ہونے لگا تھا حالانکہ آپ جانتے ہیں میں بالکل نارمل سا انسان ہوں۔ اس کا جانا اچھا شگون ہے۔ "خس کم جہاں پاک"۔ مجھے نجمی صاحب کی بات سے ۵۰/فیصد اتفاق تھا۔ (اور اس قدر اتفاق بھی پہلی اور آخری مرتبہ ہی ہوا) احساسِ کمتری کی حد تک تو ان کی بات ٹھیک تھی لیکن یہ جو ماحول سازگار دیکھ کر وہ اپنے آپ کو "نارمل" کہہ گئے تھے اس پر میرے شدید تحفظات تھے۔

میجر ڈینئل کے چیک آؤٹ کرتے ہی کسی طرف سے پتا چلا کہ یو این ہیڈ کوارٹرز خرطوم سے ایک خاتون تشریف لا رہی ہیں جو ڈینئل کے "واگزار" کمرے میں قیام کریں گی۔ خاتون کا تعلق یوگنڈا سے بتایا گیا تھا۔ اس بیابانی بستی میں کسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوش جمال خاتون کا پڑوس میسر آجانا یقیناً باعثِ تسکین ہوتا لیکن ہم نے جب خاتون کے ساتھ ''یوگنڈا'' کا نام سُنا تو جیسے اُمیدوں پر اُوس سی پڑ گئی۔ شام کی ملاقات میں نجمی صاحب نے اس خبر کی تصدیق کی بلکہ متذکرہ خاتون کے متعلق کچھ تفصیلات بھی فراہم کیں...... یہ کہ خاتون کا نام ''مارٹا'' ہے۔ پہلے بھی امن مشن کر چکی ہیں اور نجمی صاحب کے یونٹ میں اُن کی ماتحتی میں کام کریں گی وغیرہ وغیرہ۔ نجمی صاحب آدم بیزار ٹائپ آدمی تھے۔ اُن کے منہ سے کسی کے بارے میں ایسی تفصیلات خلافِ معمول تھیں۔ چنانچہ مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ لیکن اگلے دن مجھے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب پتا چلا کہ صاحب اُس خاتون کا باقاعدہ استقبال کرنے کیمپ کے ایک جانب بنے ہیلی پیڈ کی طرف گئے ہیں۔ پھر دیکھا کہ تمام رسمی کارروائی کے بعد وہ اپنی گاڑی میں موصوفہ کو نہ صرف اُس کے کمرے تک لے کر آئے بلکہ اس کا سامان اُتارنے اور اُسے سیٹ کرنے میں اُس کی ''یک طرفہ'' مدد بھی کر رہے ہیں۔ اس دوران مارٹا ہر بات پر قہقہے لگا رہی تھی اور صاحب زیرِ لب مسکراہٹ سے مسلسل اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ منظر تھوڑا حیران کن تھا۔ مزید برآں رات کے کھانے کا اہتمام صاحب نے کیا تھا جو دونوں نے مارٹا کے کمرے میں کھایا۔ خیر میں نے کہا کہ اس 'پذیرائی' کی وجہ اگلے دن پوچھیں گے۔

اگلے دو تین دن نجمی صاحب مارٹا کے ساتھ خاصے مصروف رہے۔ دن بھر وہ دفتر میں اکٹھے ہوتے، سہ پہر کو وہ اپنی گاڑی میں اسے شاپنگ کے لیے قصبے کی مارکیٹ میں لے جاتے۔ شام کو وہ کچن میں کوئی کھانا تیار کر رہے ہوتے جسے بعد میں مارٹا کے کنٹینر میں کھایا جاتا اور پھر وہاں سے نجمی صاحب رات گئے کہیں واپس لوٹتے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ حقِ ہمسائیگی کے ضمن میں خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے (جو، لوگوں کے بقول، ان میں مفقود تھی) لیکن جب کافی دن بعد بھی یہ روٹین کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی تو مجھے کھٹکا سا لگا۔ نجمی صاحب کی مارٹا میں دلچسپی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

مارٹا ۲۶/۲۷ سالہ افریقی لڑکی تھی۔ تعلق یوگنڈا سے تھا۔ رنگ ڈھنگ عام افریقی لڑکیوں جیسا تھا۔ رنگ اگرچہ ''شاہ کالا'' تو نہیں تھا لیکن پھر بھی کافی کالا تھا۔ گال بے حد پھولے ہوئے بلکہ یوں سمجھیں پورے چہرے پر صرف گال ہی پھیلے ہوئے تھے اور گالوں کی ''Encroachment'' کی وجہ سے آنکھیں اندر کو اتنی دھنس گئی تھیں کہ ان سے شاید دکھائی تو دیتا ہوگا لیکن وہ دکھائی نہیں دیتی تھیں، بالکل ''انڈس ڈولفن'' کی آنکھوں کی طرح جو صرف اندھیرے اُجالے میں تمیز کرنے کے کام آتی ہیں۔ ناک بالکل چپٹی کسی افریقی باکسر کی ناک کی طرح، چہرے پر یوں ''چپکی'' ہوئی جیسے کوئی مینڈک کالے فرش پر ٹانگیں پسارے آرام کر رہا ہو۔ بھاری بھر کم وجود نے اپنے ''خدوخال'' خود ہی چھپا رکھے تھے۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ موصوفہ موٹی زیادہ ہیں یا کالی، کیونکہ ہر دو ''خصائص'' ''ہم وزن'' موجود تھے۔ شاید یہی ''آئیڈیل سراپا'' ہی نجمی صاحب کی بے پناہ توجہ کا باعث تھا، کہ جب سے موصوفہ ''وارد'' ہوئی تھیں حضرت کو کچھ اور نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ ہر طرف سے کٹ کر صرف مارٹا کے ہو کر رہ گئے تھے۔ یہاں تک کہ ہماری شام کی نشست بھی تقریباً موقوف ہو کر رہ گئی تھی۔ سارا دن دفتر میں وہ مارٹا کے ساتھ ہوتے۔ شام کو اُس کے پہلو بہ پہلو ''واک'' کر رہے ہوتے۔ پھر رات دیر تک مارٹا کے کمرے میں ان کی محفل رہتی، جس میں غالباً وہ آنے والے حسین دنوں کی صورت گری کرتے رہتے۔ اِدھر میری اُداسی قدرے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لان میں شام کے وقت اب صرف میری اکیلی کرسی ہوتی۔ سامنے کمرے میں نجمی صاحب کی دبی دبی آواز آرہی ہوتی اور دوسری طرف مارٹا کے بلند اور غیر نسوانی ٹائپ قہقہے سنائی دیتے رہتے۔ (نجانے وہ کم بخت قہقہے کس بات پر لگاتی تھی ورنہ نجمی صاحب کی باتوں پر تو صرف رونا آتا تھا) اکیلا کرسی پر بیٹھا میں اُن شاموں کا سوچتا رہتا جب میں اور نجمی لان میں بیٹھک کرتے تھے جبکہ سامنے کمرے میں میجر ڈینئل رنگین محفل سجایا کرتا تھا۔ موازنہ کرنے پر مجھے وہ شامیں کم تکلیف دہ محسوس ہوتی تھیں۔ اگرچہ مارٹا کے ساتھ تعلق ہونا

کسی طور بھی قابلِ رشک نہیں تھا اور ایسی کوئی خواہش بھی نہیں تھی لیکن نجانے کیوں مجھے ان دونوں کا تعلق بھی ہرگز اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

نجمی اور مارٹا دونوں، مزاجاً اور طبعاً ایک دوسرے کی ضد تھے۔ نجمی صاحب ایک سنجیدہ، کم گو اور انتہائی کم آمیز آدمی تھے، جبکہ مارٹا ایک شوخ، سوشل اور بات بے بات قہقہے لگانے والی ''چٹاخ پٹاخ'' ٹائپ لڑکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کا تعلق روز بروز بڑھ رہا تھا اور اس میں زیادہ اور واضح ہاتھ اپنے نجمی صاحب کا تھا۔ دوسری طرف، اس ''وارداتِ عشق'' سے قبل نجمی صاحب کنجوسی کی حد تک کفایت شعار واقع ہوئے تھے۔ لیکن اب حالات کافی مختلف تھے۔ تقریباً ہر شام وہ مارٹا کے لیے چائے کافی کا انتظام کرتے، پھر رات کو کیمپ کے واحد لیکن انتہائی مہنگے ریستوران میں ڈنر کیا جاتا ان کی مصروفیات بھی کافی بدل گئی تھیں۔ دفتر کے بعد ان کا وقت یوں گزرتا کہ شام کو مارٹا کے ساتھ واک، پھر چائے کافی، رات کو اکٹھے ڈنر اور پھر رات گئے تک، ماحول سے بے خبر، مارٹا کے کمرے میں ایک لمبی نشست۔

ان دنوں نجمی صاحب سراپا عشق میں غرق دکھائی دیتے تھے۔ ان کے معمولات میں بڑی واضح تبدیلی آچکی تھی۔ اُن کی ''Chronic'' نفاست بھی اب ان کی ''ترجیحِ اول'' نہیں رہی بلکہ کافی حد تک معدوم ہو چکی تھی۔ ٹشو پیپر کا استعمال بھی اب نارمل لوگوں کی طرح تھا اور دوسروں سے مستعار لینے کی نوبت بھی نہیں آتی تھی۔ اُن کی شیو کسی قدر بڑھ آئی تھی۔ بات بے بات بے موقع شعر پڑھتے اور خود ہی سر دھنتے رہتے۔ میرے لیے انتہائی حیرت کی بات تو یہ تھی کہ انہیں ہمہ وقت قربتِ ''محبوب'' میسر تھی بلکہ اس قدر قربت کہ آس پڑوس والے بھی اُوب جاتے تھے لیکن پھر بھی موصوف صدیوں کے بچھڑے عاشق کی تصویر بنے پھرتے تھے۔ سنا ہے سچے عاشقوں کی راہِ عشق میں ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں فراق بھی وصال سی لذت دینے لگتا ہے لیکن یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ تھا کہ موصوف اچھے خاصے ''وصل میں ہجر کے مزے'' لوٹ رہے تھے۔ معاملہ سمجھ سے باہر تھا، شاید یہ

تصورِ عشق سے عشق کیا جا رہا تھا جہاں وصل وغیرہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس عشق سے پہلے نجمی صاحب اچھے خاصے ''کام'' کے آدمی تھے۔ فیض صاحب نے زندگی ''کچھ عشق کیا کچھ کام کیا'' کے اُصول پر گزاری تھی لیکن نجمی صاحب کی پوری زندگی کام اور صرف کام کی تصویر لگتی تھی۔ چنانچہ کبھی میں سوچتا کہ مسلسل کام اور عشق وِشق کی دوری سے جو خلا اُن کی زندگی میں رہ گیا تھا مارٹا کے ساتھ عشق میں اسی کو پُر کرنے کی ''بے طرح'' کوشش کی جا رہی تھی۔ لیکن شاید ان کی ''ازلی محرومی'' کی شدت اس قدر تھی کہ وصال کی گھڑیاں بلکہ ''گھڑیال'' بھی ''فرقت کے صدمے'' کم کرنے سے قاصر تھا۔ حفیظ جالندھری کو شاید ایسی صورتِ حال درپیش تھی جب اُنھوں نے کہا تھا۔

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تیری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

نجمی صاحب کا عشق بھی دراصل پچاس ساٹھ کی دہائی کی پاکستانی فلموں جیسا تھا۔ ناکامی کا خوف اور رسوائی کا ڈر بھی ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتا تھا۔ نجمی صاحب اپنی طرف سے سات پردوں میں عشق فرما رہے تھے۔ شام کی واک کے دوران وہ مارٹا سے تین چار قدم آگے چلتے کہ دیکھنے والے گمان کریں کہ علیحدہ علیحدہ چل رہے ہیں۔ اُنھیں شاید خبر نہیں تھی کہ اُن کے ''بھونڈے عشق'' کا ''بھانڈہ'' کب کا بیچ چوک میں پھوٹ چکا تھا۔ وہ اپنے تئیں اب بھی سمجھتے تھے کہ بات ''اپنے تک'' ہی ہے۔ شام کے وقت ملاقات کی غرض سے وہ جب مارٹا کے کمرے میں جانے لگتے تو ان کا انداز انتہائی مضحکہ خیز ہوتا۔ وہ اپنی ہی آنکھیں بند کرتے اور یہ گمان کرتے ہوئے کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا، چپکے سے کمرے میں داخل ہو جاتے جہاں ان کی سرگوشیوں اور مارٹا کے قہقہوں کا سلسلہ شروع ہوتا جو رات گئے تک جاری رہتا۔

بہرحال نجمی صاحب کا عشق عروج پر تھا۔ بارگاہِ ''حُسن'' کی مجاوری مسلسل جاری تھی۔ کئی بار میں نے (جی

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk نومبر 2012

کڑا کر کے) اُس "یوگنڈوی حسینہ" کی شخصیت کا جائزہ لیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے موصوفہ کی شکل وصورت، خد وخال، چال ڈھال غرض کوئی "کل" بھی سیدھی نہ تھی۔ اس پر مستزاد محترمہ کی حرکات وسکنات اور "مصروفیات" کچھ بھی تو نارمل نہیں تھا۔ بخدا اُن کے دیکھے سے خدا خوفی اور ترس کے علاوہ کوئی جذبہ اُبھر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن صاحب! اپنے نجمی صاحب کو کون سمجھائے۔ اُن کی فریفتگی تو آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ سراپا لٹو ہوئے پھرتے تھے۔ خود سپردگی کی جس منزل پر محترم متمکن ہو چکے تھے، اس کا جواز ان سمیت کسی کے پاس نہیں تھا۔ یواین کی اس بستی میں ان کے علاوہ واحد پاکستانی ہونے کے ناطے، بعض اوقات، میرے لیے صورتِ حال "Embarrassing" ہو جاتی تھی۔ کئی مرتبہ میں نے، بڑے ادب سے ان کی توجہ ان کے اس "واہیات عشق" کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی جس سے ان کی "عزتِ سادات" تو خیر "رل" ہی چکی تھی، مجھ غریب کی ساکھ بھی خراب ہو رہی تھی۔ کئی مرتبہ یہ بھی عرض کیا کہ حضور والا! اس ٹائپ کا "بے ہودہ عشق" تو کسی عمر میں بھی "Recommended" نہیں ہے چہ جائیکہ آپ جیسا پختہ عمر، سنجیدہ طبع انسان اس طرف جائے۔ لیکن نجمی صاحب ہر مرتبہ بگڑ جاتے اور ہماری گستاخی کو دخل در معقولات گردانتے۔ ایسے میں ان کا غصہ انتہا پر ہوتا۔ پھر تھوڑے ٹھنڈے پڑتے تو "آنجنابہ" کی تعریف میں شعر پڑھنے لگتے۔ اس "حادثے" سے پہلے ان کا شعری ذوق کمال کا تھا اور وہ بڑے برجستہ شعر پڑھتے۔ لیکن جب سے خود بہکے تھے ان کے شعر بھی بے موقع سے ہوتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر، ایک دن مارٹا کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے۔

یاد آئے تیرے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی

میں عام طور پر ان کے ایسے تعریفی شعروں پر کوئی تبصرہ وغیرہ نہیں کرتا تھا لیکن اُس دن جب یہی شعر اُنھوں نے دادطلبی کے انداز میں مکرر پڑھا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت شعر میں تھوڑی سی تحریف کر لیجیے کہ "پیکر" کی جگہ "ڈبل ڈیکر" پڑھا جائے اس سے حقیقت پسندی کے علاوہ شعر "باوزن" بھی ہو جائے گا۔ اس پر ایسا بگڑے کہ اگلے کئی روز بات نہ ہو سکی۔ مارٹا کا چلنے کا انداز بھی باقی معاملات کی طرح قدرے عجیب تھا، چلتے ہوئے پاؤں ذرا کھلے ہوتے تھے۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے ہم نے اس "بطخ سٹائل" چال کا تذکرہ کر دیا۔ موصوف نے حسب توقع مارٹا کی چال پر تنقید کو ہماری کوتاہ بینی پر محمول کیا۔ پھر اپنی دُھن میں اس 'نرالی چال' کی تعریف کرنے لگے اور پھر اس چال کی دل نشینی کی مزید وضاحت کے لیے اُنھوں نے غالب کا یہ شعر پڑھا۔

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کہ جا کرے کوئی

"ہم ساری زندگی اپنا شمار حضرت غالبؔ کے طرف داروں" میں کرتے رہے ہیں لیکن اس دن نجانے کیوں غالبؔ بھی ہمیں پھیکے پھیکے سے لگے۔

اس خانہ خراب عشق کے بعد حضرت پہلی مرتبہ C.T.O (یو۔این۔او کی چھٹیاں) پر پاکستان گئے تو واپسی پر ایک عدد بھرا ہوا سر بمہر بریف کیس مارٹا کے لیے لے کر آئے۔ اگلے چند روز موصوفہ کے لباس اور خوشبو وغیرہ کے استعمال سے پتا چلا کہ اس بریف کیس میں خوبصورت زیورات، انتہائی مہنگے ملبوسات اور اعلیٰ پائے کے پرفیومز کا تحفہ لایا گیا تھا۔ ان دنوں وہ اپنی کفایت شعارانہ طبیعت کے برعکس، بے دریغ پیسا خرچ کر رہے تھے۔ اظہارِ محبت کے علاوہ اپنے تئیں ان کی یہ کوشش بھی تھی کہ مارٹا کا "مسحور کن روپ رنگ" اور بھی نکھر آئے، لیکن وہ کہتے ہیں: 'Beauty needs no Paint'، لیکن میرے خیال میں ایک حد سے بڑھی ہوئی بدصورتی کو بھی کسی "پینٹ" وغیرہ کی حاجت نہیں رہتی، کیونکہ ایسی صورت میں اس کا "اُلٹا" پڑتا ہے۔

ایک دن اچانک خبر اُڑی کہ یہ "عجیب وغریب" جوڑا مصر کی سیر کو جا رہا ہے۔ (مصر، سوڈان کا سرحدی ملک ہے۔ یواین مشن پر یہاں آئے اکثر لوگ مصر سیر کی غرض سے جاتے ہیں) مصر یاترا کے متعلق بھی "فریقین" کی مختلف آراء سامنے آ رہی تھیں۔ میڈم تو (قہقہوں کے درمیان) اسے "ہنی مون ٹور" قرار دے رہی تھیں جبکہ صاحب اسے "تجی ومطالعاتی" دورہ بتا رہے تھے۔ بہرحال سفر والے دن صاحب کے "وفورِ شوق" کا عالم یہ تھا کہ ہیلی کاپٹر کی روانگی سے کوئی ڈھائی تین گھنٹے پہلے ہی تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ مجھے ہیلی پیڈ پر "ڈراپ" کرنے کا کہا گیا تو میں کڑکتی دوپہر میں حکم کے مطابق وقت سے کافی پہلے ہی اُنھیں وہاں چھوڑ آیا جہاں سے انہوں نے پہلے خرطوم (سوڈان کا دارلحکومت) اور پھر قاہرہ روانہ ہونا تھا۔

اطلاع کے مطابق یہ ۱۰ روزہ ٹرپ تھا لیکن بمشکل پانچ چھ دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک روز جب دوپہر کے وقت میں اپنے کمرے کی صفائی کر رہا تھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر دیکھا تو نجمی صاحب موجود تھے۔ اُن کے ہاتھ میں بیگ تھا اور وہ سیدھے ہیلی پیڈ سے ہی آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ ڈسٹ میں اَٹے ہوئے تھے اور بدن پسینے سے شرابور۔ نجمی صاحب کی نفاست پسندی اور مصافحے سے "الرجی" کو مجھ سے بہتر کون جانتا تھا۔ لہٰذا میں نے دور ہی سے سلام کا جواب دیا لیکن صاحب! یہ کیا! نجمی صاحب نے مجھے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا اور ایک طویل معانقے کے بعد پیچھے ہٹے۔ پہلے روز کے "۳ رانگلی" والے مصافحے کے بعد مجھے ان کی طبیعت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے لیے مصافحہ وغیرہ کسی طور باعثِ تسکین نہیں ہے لہٰذا ایک لمبی رفاقت کے باوجود بھی ہم نے صرف متذکرہ بالا ٹائپ مصافحہ ہی دو چار بار کیا ہو گا۔ چنانچہ ان کا معانقہ اور وہ بھی اس حال میں سمجھ سے باہر تھا۔ میں نے حال چال پوچھا تو کہنے لگے تم اس کو چھوڑو، آج رات ہم ڈنر اکٹھے کریں گے۔ اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ "یا اللہ خیر! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ گرم جوش معانقہ اور پھر ڈنر کی دعوت......! واللہ اپنے نجمی صاحب تو ایسے نہیں تھے"۔ تھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ مارٹا ابھی تک مصر میں تھی اور صاحب اکیلے ہی تشریف لائے ہیں۔ معاملہ قدرے عجیب لگ رہا تھا۔ بہرحال شام تک اُنھوں نے دو تین بار مزید ڈنر کی تاکید کی۔ رات کیفے میں ڈنر انتہائی پُرتکلف تھا۔ کشادہ میز کیفے کی مشہور ڈشز سے گویا بھر گئی تھی۔ نجمی صاحب سے اک عرصہ رفاقت کے باوجود نوبت کبھی سادہ چائے سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ بات کافی خلافِ معمول تھی۔ نجمی صاحب کی مردم بیزاری اور لاپروائی کی عادت اپنی جگہ تکلیف دہ تھی لیکن آج اُن کا اس قدر "التفات" اور بھی زیادہ پریشان کن تھا۔ دورانِ ڈنر مجھے بار بار چچا غالب یاد آ رہے تھے۔ میری کیفیت کو کس خوبصورتی سے بیان کر گئے تھے۔

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

بہرحال، یہ "سسپنس" زیادہ دیر برقرار نہ رہا۔ اُس "ناگہانی التفات" کی "شانِ نزول" جلد ہی معلوم ہو گئی۔ ابھی چند لقمے ہی لیے ہوں گے کہ صاحب اچانک بولے "ملک صاحب......! مارٹا ایک گھٹیا اور نیچ لڑکی ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں ان کے اس اچانک اور استفہامیہ ریمارکس پر چونکا۔ دل نے کہا کہ ہمیں تو یہ سب بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا مگر میں نے پوچھا "کیا معاملہ ہوا ہے؟"

"اچھا کیا آپ نے اسے منہ نہیں لگایا" نجمی صاحب نے منہ نیچے کر کے کہا۔ میں نے سوچا کہ حضور نے کسی اور کو منہ لگانے کا موقع ہی کب دیا تھا۔

"بہرحال مجھے مارٹا کے خلاف آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" نجمی صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے دوبارہ چونکتے ہوئے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
urdudigest.pk

''اُس بدذات نے مجھ سے ۱۰ر ہزار ڈالر لیے تھے، اب واپس نہیں کر رہی۔'' نجمی صاحب نے انکشاف کیا۔

''لیکن وہ تو اسے آپ نے تحائف وغیرہ لے کر دیے ہوں گے۔'' میں نے استفسار کیا۔

''بھئی ملک صاحب! کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ میں اُسے تحفے کیوں دُوں گا۔ میرا اس بدقماش سے کیا رشتہ جو میں اسے تحفے لے کر دوں۔ بس یہی ناں کہ ایک دفتر میں کام کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ملاقات رہتی ہے۔''

نجمی صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ رات گئے تک مارٹا کے کمرے میں ''دفتری امور'' ہی تو طے ہوتے تھے اور آدھی آدھی رات کی ''آفیشل میٹنگ'' کا تو میں خود عینی شاہد تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ مارٹا نے یہ رقم لی ہے تو اب اس کی واپسی کی کیا سبیل تھی اور اس میں میرا کیا کردار ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے عرض کیا کہ متذکرہ رقم کی واپسی میں میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟

صاحب بولے ''میں اس کے خلاف ''Conduct & Discipline Unit'' میں درخواست دے رہا ہوں۔ آپ بطور گواہ اُنھیں بتائیں گے کہ مارٹا نے ۱۰ر ہزار ڈالر مجھ سے لیے تھے۔''

''لیکن نجمی صاحب......! میرے سامنے تو یہ سب نہیں ہوا۔'' میں کسمسایا۔ ''یہ تو سراسر جھوٹ ہوگا۔''

''دیکھیں ملک صاحب......! اس غریب الوطنی میں اگر آپ ہی میرا ساتھ نہیں دیں گے تو میں کسی اور سے کیا توقع رکھ سکتا ہوں۔ اس بے حیا عورت نے اس سے کہیں زیادہ رقم مجھ سے بٹوری ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ آپ کا جھوٹ نہیں ہوگا۔ میرے علاوہ آپ یہاں پر واحد پاکستانی ہیں، اگر آپ کے نزدیک ہی میں جھوٹا ہوں تو میں نے لڑ لیا کیس''۔ نجمی صاحب ایک لمحے کو رُکے اور پھر اُنھوں نے ۹/۱۱ کے بعد کا مشہور امریکی ڈائیلاگ بولتے ہوئے کہا ''ملک صاحب آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ آپ میرے ساتھ ہیں یا مارٹا کے ساتھ۔''

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نکلوں کہ نجمی صاحب دوبارہ گویا ہوئے اور اب کے ان کے لہجے میں واضح جذباتیت تھی ''ملک صاحب......! آپ تو پاکستان سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن اب کہاں گئی آپ کی حب الوطنی؟ ایک پاکستانی کے ساتھ فراڈ ہوا ہے اور آپ اُس کی مدد کے بجائے سوچ میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو صاف کہتا ہوں کہ اگر آپ کو پاکستان سے محبت ہے تو آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

تو نجمی صاحب نے گویا میری حب الوطنی اپنی حمایت کے ساتھ مشروط کر دی تھی۔ اب کے نجمی صاحب کا انداز بالکل ویسا ہی لگ رہا تھا جیسے ایک مرتبہ ہمارے ہاں ایک صاحب نے ریفرنڈم میں قوم کے سامنے اس ٹائپ کی ایک بڑی عجیب سی ''چوائس'' رکھ دی تھی کہ ''اگر آپ اسلام کو مانتے ہیں تو میں آپ کا صدر۔'' کھانے کے دوران میں صاحب شدید اضطراب میں تھے اور میرے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ میں ''چِتا جواب'' دینے سے مصلحتاً گریز کر رہا تھا۔ بہرحال میں نے اطمینان سے کھانا ختم کیا اور ''اللہ تعالیٰ بھلی کرے گا'' ٹائپ جواب دے کر واپس آگیا۔

صاحب! بنیادی طور پر میں کینہ پرور انسان نہیں ہوں اور اذیت پسندی کا تو مجھ میں شائبہ تک نہیں ہے لیکن نجانے کیوں نجمی صاحب کے ساتھ جو ''ہاتھ'' ہوا تھا اس سے مجھے اندر کہیں بے حد خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے نجمی صاحب کو بروقت آگاہ کر دیا تھا کہ اس ''بِل بتوڑی'' کے ساتھ اُن کا ''سفرِ محبت'' کسی مثبت انجام کی طرف نہیں جائے گا۔ ''اوائلِ عشق'' ہی میں مَیں نے اس کے مضمرات اور اپنے خدشات کا اظہار کر دیا تھا، لیکن صاحب پر اُن دنوں عجیب جنون طاری تھا۔ وہ اُلٹا طنزیہ ہنسی میں ہمارا تمسخر اُڑاتے اور ہمارے مخلصانہ مشورہ کے جواب میں اکثر یہ شعر پڑھتے۔

لُطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت! تو نے پی ہی نہیں

ہم پر طنز اور تمسخر کا ایک اور واقعہ بھی ملاحظہ ہو اور وہ یہ کہ

''مارٹا دیوی'' کے چرنوں میں شام کی حاضری نجمی صاحب کے معمولات کا لازمی ترین حصہ تھی۔ ایک شام قدرے تاخیر ہو گئی تو گھبراہٹ اور عجلت میں جب دروازہ پر پہنچے تو لڑکھڑا کر گر پڑے۔ سامنے صحن میں بیٹھے جب میں نے یہ منظر دیکھا تو میری ہنسی چھوٹ گئی۔ صاحب نے اُٹھ کر ہاتھ، کپڑے جھاڑے اور برہمی کا اظہار کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

کیا قیامت ہے کہ ہم اہلِ تمنا کو فرازؔ
وہ جو محرومِ تمنا ہیں، بُرا کہتے ہیں

ہم نے مزید ''گستاخی'' کرتے ہوئے عرض کیا کہ صاحب آپ جس ''تمنا'' کی بات کر رہے ہیں ہم اُس سے محروم ہی بھلے لیکن صاحب تب تک اندر جا چکے تھے۔ ان دِنوں صاحب اپنا شمار ''اہلِ جنوں''، ''اہلِ شوق'' وغیرہ میں کرتے تھے جبکہ ہمیں ''اہلِ خرد'' اور ''محرومِ تمنا'' کے القابات سے نوازا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی نجمی صاحب کی موجودہ کیفیت میرے لیے کسی قدر باعثِ تسکین تھی۔ لیکن دوسری طرف اُنھیں بالکل تنہا چھوڑنا بھی مناسب نہیں تھا کہ آخر تھے تو وہ اپنے ہی نجمی صاحب۔ چنانچہ میں نے دل میں سوچا کہ ان کے ساتھ میں ''کنڈکٹ اینڈ ڈسپلن یونٹ'' ضرور جاؤں گا اور اگر ضرورت پڑی تو ایک طرح کے گول مول سے جواب کے ذریعے لاٹھی کو بچاتے ہوئے سانپ کو مارنے کی کوشش بھی کروں گا۔

اگلے دن نجمی صاحب نے مارٹا کے خلاف ایک درخواست ڈال دی جس میں الزام تھا کہ اُس نے ''ہیرا پھیری'' سے ۱۰ر ہزار ڈالر ''بٹور'' لیے ہیں اور اب واپسی کے تقاضے پر ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے۔ یہ یو این کے ''CODE OF CONDUCT'' کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ لہٰذا میرے پیسے واپس دلا کر مجھے انصاف فراہم کیا جائے۔ اس کے علاوہ ''یونٹ'' جو مناسب ''Relief'' سمجھے وہ بھی عنایت کیا جائے۔ درخواست میں مجھے بطور گواہ رکھا گیا تھا۔

اگلے دن یونٹ نے مجھے بطور گواہ اپنا تحریری بیان داخل کرنے کو کہا۔ میں نے بیان میں اِدھر اُدھر گھما کر آخر میں لکھا کہ ''بندہ'' پیشی والے دن تفصیلات زبانی عرض کرے گا۔ ۲ر دن بعد پیشی تھی۔ یہ ۲ر دن یو۔این کے امن مشن میں ہمارے قیام کے بہترین دن تھے۔ ہم ہمہ وقت نجمی صاحب کے مہمان تھے۔ ہماری آؤ بھگت بالکل ویسے ہی ہو رہی تھی جیسے ہمارے ہاں مری کے ''ریسٹ ہاؤسز'' میں اُن ارکانِ اسمبلی کی ہوتی ہے جن کا ایک طرف تو ووٹ درکار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس ''خطرے'' سے بچنا ہوتا ہے کہ کہیں وہ ''لوٹا'' نہ بن جائیں۔ اسی دوران ''فریقین'' اپنا تحریری بیان جمع کرا چکے تھے۔

پیشی والے دن میں اور نجمی صاحب مقرّرہ وقت سے پہلے ہی ''ڈسپلن یونٹ'' کے دفتر پہنچ گئے تھے۔ ''یونٹ'' والوں نے گواہ کے رُوبرو ''فریقین'' کی بالمشافہ گفتگو کا اہتمام کیا تھا اور یہ اہتمام بالخصوص مارٹا کی درخواست پر کیا جا رہا تھا۔ یونٹ کا ''چیف'' ایک کیم شحیم افریقی تھا۔ ''ڈیل ڈول'' اور ''حرکات و سکنات'' کے اعتبار سے وہ مارٹا کا بڑا بھائی لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مارٹا بھی پہنچ گئی۔ ''جیوری''، یونٹ کے ''چیف'' اور اُس کے ایک نائب پر مشتمل تھی۔ لیجیے......! کارروائی کا آغاز ہوا۔ چیف نے سب کے سامنے نجمی صاحب کا استغاثہ حرف بحرف پڑھا، جس میں صاحب نے مارٹا کے ساتھ اپنی ''معمولی دوستی'' اور ''سرسری تعلق'' ظاہر کرتے ہوئے مارٹا پر الزام لگایا تھا کہ اس نے ان سے ۱۰ر ہزار ڈالر ''بٹورے'' ہیں اور اب واپس نہیں کر رہی۔ (الزام سن کر مارٹا نے چونکتے ہوئے نجمی صاحب کو گھورا) بیان پڑھنے کے بعد چیف نے نجمی صاحب سے پوچھا کہ اس کے علاوہ کوئی بات جو وہ زبانی کرنا چاہتے ہوں۔ صاحب نے مارٹا کی طرف ایک نظر ڈالی اور نفی میں سر ہلا دیا۔ میرا ذہن تھا کہ بطور گواہ مجھ سے کچھ پوچھا گیا تو گول مول سا جواب دوں گا۔ لیکن ابھی تک بھی وہ جواب مجھے سوجھا نہیں تھا۔ اللہ بھلا کرے اس چیف کا کہ اُس نے مجھے در

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوراعتناء نہیں سمجھا اور استغاثہ پڑھنے اور نجمی صاحب سے مزید استفسار کرنے کے بعد اُس نے مارٹا سے اپنا موقف بیان کرنے کو کہا۔

صاحبو......! اس موقع پر مارٹا نے اپنی صفائی میں جو تقریر نُما بیان دیا وہ اب "Conduct & Discipline Unit" کی تاریخ کا حصہ ہے۔ نجمی صاحب کا استغاثہ میں دعویٰ تھا کہ اُن دونوں کے بیچ بس "سرسری" سا تعلق تھا۔ مارٹا نے پہلے اسی بات کو پکڑ لیا۔ تعلقات کی "نوعیت" واضح کرنے کے لیے اس نے اُن کی پہلی ملاقات سے لے کر قاہرہ (مصر) کے ایک ہوٹل سے آدھی رات کو نجمی صاحب کے "فرار" تک تمام کہانی بیان کرنا شروع کی۔ ادھر نجمی صاحب چونکے کہ یہ کس طرف چل پڑی ہے۔ اچانک مارٹا نے اُن دونوں کے بیچ تعلقات کی "باریکیوں" اور "گہرائیوں" سے پردہ اُٹھانا شروع کر دیا۔ اب کے نجمی صاحب کے چہرے پر پریشانی کے آثار بڑے واضح ہوگئے۔ دراصل نجمی صاحب کا اندازہ تھا (اور جو کہ حسبِ معمول غلط تھا) کہ مارٹا کے خلاف رقم کے لین دین کی شکایت ہے، لہٰذا بحث لین دین کی حد تک محدود رہے گی اور بحث "Bargaining" وغیرہ کے بعد اُن کی رقم پوری یا معمولی کمی بیشی کے ساتھ واپس مل جائے گی۔ اِدھر مارٹا ایک آزاد کلچر کی "کھلی ڈُلی" لڑکی تھی۔ یعنی اپنی عزت کا احساس نہ پردہ پوشی کا خیال۔ جبکہ اپنے نجمی صاحب بیچارے "ازمنہ قدیم" کے "جھیمپو" قسم کے عاشق تھے۔ مارٹا نے جان بوجھ کر ایسی گفتگو شروع کی تھی جس سے نجمی صاحب متوقع طور پر "Back Foot" پر آگئے تھے۔ اس صورتِ حال سے مارٹا کو مزید شہہ ملی تو اُس نے تعلقات کی "نزاکتوں" کے تذکرے میں مزید "مرچ مسالہ" لگاتے ہوئے بات چیت کو اُن "علاقوں" میں پہنچا دیا جو ہمارے ہاں انتہائی "ممنوعہ" ہوتے ہیں۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مارٹا نے نجمی صاحب کی کچھ ایسی "اندرونی کمزوریوں" کا قصہ بھی چھیڑا جن کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ نجمی سمیت کسی کو علم نہیں تھا۔ اس "Below The Belt" وار پر ہمارے ساتھ بیٹھے نجمی صاحب پر کپکپی سی طاری ہو رہی تھی۔ نجمی صاحب نے "دخل در غیر معقولات" دینے کی کوشش کی لیکن 'جیوری' نے مارٹا کو "بیان" جاری رکھنے کو کہا۔ اس کے بعد مارٹا نے اُن کے حالیہ دورۂ مصر کا ذکر چھیڑ دیا جہاں اُن کی "داستانِ عشقِ ناکام" اختتام پذیر ہوئی تھی۔ دورے کے دوران اُن کی "مصروفیات" کا ذکر اس قدر تفصیلات کے ساتھ تھا کہ مجال ہے کسی لمحے کا تذکرہ تشنۂ بیاں رہ گیا ہو۔ "مصروفیات" کا اس قدر مفصل تذکرہ شروع ہوا تو نجمی صاحب کے پسینے چھوٹ گئے۔ اب کے وہ بڑے واضح اشارے کر رہے تھے کہ کارروائی روک دی جائے۔ لیکن مارٹا کب رُکنے والی تھی وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کرکے آئی تھی کہ آخری حد تک جائے گی۔ چنانچہ اب مارٹا نے "پینل" سے کہا "جنابِ والا......!! ہمارے درمیان تعلق کی نوعیت کو ظاہر کرنے کے لیے اور اپنے بیان کو تقویت دینے کے لیے اب میں آپ کو چند تصاویر اور وِیڈیو کلپس دکھاؤں گی جن کو دیکھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارا تعلق کتنا "سرسری اور عام" سا تھا۔ یہ کہہ کر اُس نے بڑی "LCD" والا ایک جدید ماڈل کا کیمرا نکالا، اُس کا "Slide Show" آن کیا اور سامنے ٹیبل پر کھڑا کر دیا۔ کیمرے نے تصاویر دکھانی شروع کر دیں۔ صاحب! کیمرا کیا چلا گویا "سہاگ رات باتصویر" ٹائپ کوئی کتاب کُھل گئی۔ ہر تصویر "قرب و وصال" کی ایک کہانی تھی۔ بڑھتی نزدیکیاں" دکھاتا یہ کیمرا نجمی صاحب پر "دُوہری مار" کر رہا تھا۔ ایک تو اُن کے "سرسری تعلق" کا پول کھولتے ہوئے اُن کے بیان کے پہلے حصے کو جھوٹ ثابت کر رہا اور دوسرے اُن کی پچھلی داستانِ عشق کو "اوپن ایئر تھیٹر" میں دکھا کر اُن کو شرم سے پانی پانی کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ بے چارے "مرغِ بسمل"، "ماہیِ بے آب" بنے بے بسی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب مارٹا نے تصویریں دکھانے کے لیے کیمرا آن کیا تو نجمی صاحب کے حلق سے نکلنے والی مہمل سی "غوں غاں" بھی بند ہوگئی۔ ہاتھوں کے اشاروں سے مارٹا کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ دراصل اُس مقتول کی طرح لگ رہے تھے جو اپنے قتل سے

ایک لمحے پہلے بندوق کے سامنے کھڑا گولی نہ چلانے کی بے سُود التجا کر رہا ہو۔ نجمی صاحب بطور مدعی تشریف لائے تھے، لیکن صاحب! کیسا دعویٰ، کہاں کی شکایت۔ وہ بیچارے تو کب کے اپنے دعوے سے دستبردار ہو چکے تھے لیکن اب اُن کی اپنی جان نہیں چھوٹ رہی تھی۔ گویا وہ "کمبل" کو چھوڑنا چاہ رہے تھے لیکن اب "کمبل" اُنھیں نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اُن پر ہارٹ اٹیک، برین ہیمبرج یا فالج وغیرہ ہونے سے ذرا پہلے کی کیفیت طاری تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ۱۰ ہزار ڈالر کی بات ضرور کرتے اگر اُنہیں سانس ٹھیک طرح سے آ رہا ہوتا۔ مارٹا نے "رِنگ" میں اُترتے ساتھ ہی اُن کے کمزور ترین حصے پر "پنچ" مارا تھا جس سے وہ بُری طرح تلملا اُٹھے تھے اور اب مارٹا اسی "دُکھی حصہ" کو مسلسل "ٹارگٹ" بنا رہی تھی۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ تھی کہ نجمی صاحب بے چارے کب سے "ناک آؤٹ" ہونا چاہ رہے تھے لیکن انہیں یہ "سہولت" بھی میسّر نہیں تھی۔

یونٹ چیف کا آسٹریلین نائب 'جیف' ایک عجیب بے ہودہ سا انسان تھا۔ وہ "بدتمیز" مارٹا کی کہانی کے دوران مسلسل "کھی کھی" کرتا رہا اور جیسے ہی "مخفی تصاویر" کا "سلائیڈ شو" چلا اُس نے باقاعدہ قہقہے مارنے شروع کر دیے۔ وہ بدمعاش ہر تصویر پر مجھے آنکھ مارتے ہوئے جناب نجمی صاحب کی طرف واہیات قسم کے اشارے کرتا۔ مارٹا تصویریں دکھانے کے ساتھ ساتھ زبانی 'تیر' بھی چلا رہی تھی۔ اچانک اُس نے "جیوری" کو مخاطب کرکے کہا "میں یہ بات تو جیوری کو ابھی بعد میں بتاؤں گی کہ مسٹر نجمی مختلف تحائف اور اشیاء کس قدر اصرار سے مجھے دیا کرتے تھے، پہلے آپ ہمارے پڑوسی مسٹر ملک! سے یہ پوچھیں کہ مسٹر نجمی میرے کمرے میں روز آتے تھے کبھی مجھے بھی اُن کے کمرے میں جاتے دیکھا تھا؟ اس پر چیف نے میری طرف استفہامیہ نظر سے دیکھا تو میں نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس پر نجمی صاحب نے میری طرف یوں دیکھا جیسے "کمین گاہوں میں اپنے ہی دوستوں سے ملاقات" کر رہے ہوں۔

مارٹا کی "لغویات" ابھی جاری تھیں لیکن اپنے نجمی صاحب کو اس حالت میں مزید دیکھنے کے لیے کسی "گوانتا نامو بے جیل" کے جیلر کا سا دل چاہیے تھا جو میرے پاس تو بہرحال نہیں تھا۔ سو میں نے نجمی صاحب سے 'پنجابی' میں پوچھا کہ کیا میں چیف سے "کیس" واپس لینے کی بات کروں؟ اُن کے چہرے پر "ریلیف" (Relief) کے تاثرات نمودار ہوئے اور اُنہوں نے کچھ بولے بغیر مجھے مثبت اشارہ دے دیا۔ میں نے "چیف" سے ایسے ہی کہا اور اُس نے کندھے اُچکاتے ہوئے ہمیں 'کیس' واپس لینے کی اجازت دے دی۔ ہم دونوں یونٹ کے دفتر سے باہر نکلے تو پیچھے سے مارٹا کا وہی مخصوص قہقہہ سنائی دیا جسے کبھی نجمی صاحب پہاڑی جھرنوں کی مترنم آواز سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ ماحول سازگار نہیں تھا ورنہ اس بارے میں اُن کی موجودہ رائے ضرور لیتا۔ ہم دونوں بالکل خاموش جا رہے تھے۔ میرے کمرے کے پاس پہنچ کر نجمی صاحب ایک لمحے کو رُکے اور بولے "ملک صاحب! آپ کے پاس 'ٹشو پیپرز' ہوں گے ذرا دکھائیے گا پلیز۔" اُن کی "نفاست" ایک بار پھر عود کر آئی تھی۔ میں نے اندر سے 'ٹشو پیپرز' کا ایک بڑا 'رول' لا کر اُنھیں دکھایا اور پھر خود دیکھتا رہ گیا۔ نجمی صاحب ٹشو لے کر اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوئے تو وہ "میاں صاحب" کا یہ آفاقی شعر گنگنا رہے تھے ؎

نیچاں دی آشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا
کیکر تے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

کہانی کار ناصر ملک ان دنوں پنجاب پولیس ٹریننگ سنٹر چوہنگ کرنیاز بیگ میں تعینات ہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

رفیقِ سفر

ٹرین کے سفر میں پیش آنے والا ایک پُراثر واقعہ

شکیل احمد

ٹرین صحرا (سینا) سے گزر رہی تھی۔ گڑگڑاہٹ کی مسلسل آواز اور بے ہنگم شور کی وجہ سے پولینڈ کے اس مسافر کے لیے رات بھر سونا ممکن نہ ہو سکا۔ یورپ سے آنے والے اس غیر مسلم (یہودی) نوجوان مسافر کے لیے ماحول اجنبی اجنبی تھا، اسی لیے وہ اردگرد کی تمام ہی چیزوں کا دلچسپی اور توجہ سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کے سامنے والی سیٹ پر بڑی سی عبا میں لپٹا بیٹھا عرب مسافر اپنے حلیے سے عام مسلمان (بدو) معلوم ہوتا تھا۔ سردی شدید تھی، اگرچہ اس کے پاس مفلر موجود تھا لیکن اس کے باوجود وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔

ٹرین صبح سویرے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ عرب مسافر نے اسٹیشن پر موجود خوانچہ فروش سے ایک روٹی خریدی۔ اپنی جگہ بیٹھ کر روٹی کے ۲ ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑا اپنے پاس رکھ کر دوسرا سامنے والے مسافر کو پیش کر دیا۔

اجنبی مسافر سے روٹی کا ٹکڑا لیتے ہوئے اسے کچھ تردد تو ہوا، لیکن عرب مسلمان کی جانب سے اشاروں اشاروں میں پیہم اصرار پر اسے وہ قبول کرنا ہی پڑا۔

قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک اور مسافر نے یہ معاملہ دیکھا تو رضاکارانہ طور پر ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔ دریافت کرنے پر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مترجم نے عرب مسلمان کے بارے میں بتایا کہ یہ کہتا ہے ''تم بھی مسافر ہو اور میں بھی! ہم دونوں کا راستہ بھی ایک ہی ہے۔ تم پھر میری دعوت قبول کیوں نہیں کرتے؟'' اجنبیت کی تمام دیواروں کے باوجود اپنے رفیق سفر کو اصرار کے ساتھ اپنی آدھی روٹی دینے کا یہ عمل تصنع اور تکلف سے بالکل پاک تھا۔

غیر مسلم مسافر پر اس اخلاق کا گہرا اثر ہوا۔ گاڑی منزل مقصود (غزہ) پہنچی تو اس عرب مسافر نے سامان سمیٹا اور باوقار مسکراہٹ کے ساتھ سر کے اشارے سے سلام کرتے ہوئے باہر چلا گیا۔ پلیٹ فارم پر استقبال کے لیے آنے والوں سے اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور وہ سب لوگ روانہ ہو گئے۔

اجنبی غیر مسلم مسافر اُس عرب مسلمان کے اخلاق سے تو پہلے ہی متاثر ہو چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر ملاقاتوں کے حوالے سے خلوص اور محبت کے مجموعی ماحول نے اس کے اندر خواہش پیدا کی کہ ان بااخلاق، مخلص اور ہمدرد لوگوں کی زندگی کا مزید مطالعہ کیا جائے۔

مطالعے کا سلسلہ شروع ہوا تو محض ۴ سال بعد اس غیر مسلم نوجوان نے اسلام قبول کر لیا۔ آج کی دنیا اس نوجوان مسافر کو نامور مصنف اور ممتاز عالم ''علامہ محمد اسد'' کے نام سے جانتی ہے۔ علامہ اسد نے نہ صرف اسلام پر کئی دعوتی کتب تحریر کیں بلکہ قرآن پاک کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے علاوہ صحیح بخاری کے مختلف حصوں کو انگریزی زبان میں منتقل بھی کیا۔

ٹرین کے سفر کے دوران پیش آنے والے مذکورہ واقعے کو علامہ محمد اسد نے اپنی کتاب ''اے روڈ ٹو مکہ'' میں بیان کیا۔ ان کے مطابق یہ واقعہ ۱۹۲۲ء میں پیش آیا تھا جب ان کی عمر محض ۲۲ سال تھی۔ ۱۹۲۶ء میں ۲۶ سال کی عمر میں انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد سے ۱۹۹۲ء تک، جب سپین میں ان کی وفات ہوئی، وہ مسلسل اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف رہے۔ بلاشبہ علامہ محمد اسد نے سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا تھا لیکن اسلام کی جانب ان کی توجہ مبذول کرانے میں بہت سے واقعات کا دخل رہا۔

ٹرین کے اس سفر میں شریک عرب مسافر کو، جو علامہ اسد کے قبول اسلام میں ایک اہم ذریعہ بنا، شاید کبھی علم بھی نہ ہوا ہو کہ اس کے اخلاق اور اخلاص کے نتیجے میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا کتنا بڑا کام ہوا ہے۔ اس کے باوجود اللہ کی جانب سے اس کے لیے اَجر کی توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ صرف نیک نیتی سے کیا جانے والا ہر انسانی عمل محفوظ ہو جاتا ہے، بلکہ اس عمل کے جو اثرات بھی دنیا میں ہو رہے ہوں، وہ صدقہ جاریہ کی صورت میں اس کے نامہ اعمال میں شمار ہوتے ہیں۔

ہماری تاریخ میں 2 گورنرز

پنجاب کے ایک ''عالی شان'' گورنر کا ماجرا
اس نے کمشنر سے ایک فرمائش کر دی تھی

کرنل (ر) مبشر احمد

قومیں

اپنے افکار کی بنا پر دنیا میں عروج پاتی ہیں۔ تاریخ میں کسی ایسی قوم کا ذکر نہیں جس نے اپنے اسلاف، اقدار یا دیانت کے بغیر مقام پایا ہو۔ آج کے ملکی حالات دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے۔ اگر ہم نے اپنے حالات کو ٹھیک نہ کیا تو خدانخواستہ بقول علامہ اقبال ''ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں'' اور ہمارا حال ویسا ہی ہوگا جس کی طرف سورۂ بنی اسرائیل میں اشارہ کیا گیا ہے۔

''واذا آردنا ان تھلک قریۃ امرنا مترفیھا ففقو فیھا فحق علیھا القول ذرمرنھا تدبیر''

''اور جب ارادہ کرتے ہیں کہ ہلاک کر دیں کسی بستی کو تو وہاں کے رؤسا و اشرافیہ کو فواحش پر مامور کر دیتے ہیں وہ نافرمانیاں کرتے پھرتے ہیں۔ اس (بستی) میں پس واجب ہو جاتا ہے ان پر عذاب کا حکم پھر ہم اس بستی کو جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

محترم حقی حق نے اپنی کتاب ''زوال عصر، کوفہ اور کربلا'' میں بالکل ٹھیک کہا ''مملکت خداداد کو مملکت بے خداداد میں بدل دینے والے حکمرانوں اور اشرافیہ نے ایک طرف تو حکمرانی کی ایک ایسی طرز خاص ایزاد کی کہ جس میں احتساب نہیں۔ دوسری طرف جرائم پیشہ، خائن اور ناپاک سورۃ الانفعال کے ثبوت میں متحد ہو گئے۔ چور چوروں کے تحفظ پر مامور اور ناپاک دوسرے ناپاک سے متصل ہو جانے میں سرگرم ہو گیا۔ جب چور، ناپاک، بددیانت اور ڈاکو اکٹھے ہو گئے اور حاکم اور اشراف قرار پائے تو غریب مملکت کا خزانہ کیسے بچ سکتا تھا۔ سو نہ خزانہ رہا اور نہ خلقِ خدا محفوظ رہی نہ مملکتِ خداداد رہی نہ مملکت اسلامیہ۔ فرمانِ الٰہی ہے۔

''السمیز اللہ الخبیث من الطیب و یجعل الخبیث بعضہ می بعض فیر کمہ''

تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک لوگوں سے الگ کر دے اور (ان سے الگ کر کے ناپاکوں کو ایک دوسرے سے ملا دے یعنی ان سب کو متصل کر دے۔) (سورہ الانفعال)

ہمارے ملک کا آخری معرکہ دھڑوں اور پارٹیوں کے درمیان نہیں بلکہ ایک دوسرے سے متصل ناپاک اور پاک لوگوں کے درمیان ہوگا۔ مملکت خداداد میں اس خط کا کھینچا جانا واجب ہو چکا ہے۔ ہمیں خدشہ ہے کہ یہ خط

WWW.PAKSOCIETY.COM

خون سے کھینچا جائے گا۔ اس خط امتیاز کے واقع ہونے کی ۱۰۱ر وجوہات موجود ہیں۔ اگر کسی چشم خمار آلودہ چشم پوش کو یہ خط کشیدہ نظر نہیں آتا تو ڈاکٹر رشید امجد کا یہ اقتباس (تمنا بے تاب ص ۳۲۶) مکرر پڑھنا چاہیے۔

''پنجاب کے ایک گورنر کو جو صاحبان عالی شان تھے۔ بہاولپور کے علاقہ میں مربعے الاٹ ہوئے۔ ایک دن گورنر نے کمشنر بہاولپور سے پوچھا کہ ان مربعوں کی مالیت کیا ہوگی۔ کمشنر نے یوں ہی نمبر بنانے کے لیے کہہ دیا ''سر تقریباً ایک کروڑ'' گورنر نے کہا ''تو ایک ہفتہ میں مربعے بیچ کر کروڑ روپے انھیں بھجوا دیے جائیں۔'' کمشنر کو مصیبت پڑ گئی۔ اس نے یونہی نمبر بنانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ مربعے چند لاکھ سے زیادہ کے نہ تھے۔ انھوں نے اپنے ماتحتوں کو بلایا کہ اب کیا کریں! میٹنگ میں ایک ایس پی بھی تھا۔ اس نے کہا ''سر آپ اجازت دیں تو میں ایک راستہ بتاتا ہوں۔'' کمشنر نے پوچھا ''وہ کیا ہے؟'' ایس پی نے کہا ''مقامی نیشنل بینک کی شاخ میں ۳، ۴ر کروڑ ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو آج رات اس پر ڈاکہ پڑوا دیتے ہیں۔ رات کو بینک پر ڈاکا پڑا اور ۲ر کروڑ لوٹ لیے گئے۔ ایک کروڑ تو گورنر کو بھیج دیے گئے اور ایک کروڑ متعلقہ انتظامیہ میں بٹ گئے۔ صبح چوری کا پرچہ درج ہوگیا کچھ عرصہ ذکر اذکار رہا پھر داخل دفتر۔''

(گورنر صاحب کو اس کی اطلاع مل گئی مگر وہ خاموش رہے)

ہماری تاریخ میں ایک اور گورنر کا قصہ بھی درج ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے گورنر حمص سعید ابن عامرؓ کا یہ واقعہ اپنی مسند میں اس طرح لکھا ہے۔

''سیدنا حضرت عمرؓ ابن خطاب سے ملنے کے لیے اسلامی ریاستوں کے جو وفود مدینہ منورہ آتے رہتے تھے ان وفود کو رخصت کرتے وقت حضرت عمرؓ ابن خطاب ان سے فرماتے کہ اپنے علاقہ کے ایسے مستحق و نادار افراد کے نام لکھ دو جنھیں امداد کی اشد ضرورت ہو۔ اس طرح سیدنا عمرؓ ابن خطاب دور دراز کے مستحقین کی امداد فرماتے رہتے۔ ایک بار حمص سے بھی ایک وفد مدینہ منورہ آیا۔ حضرت عمرؓ نے حسبِ معمول اس وفد سے بھی مستحق افراد کی فہرست طلب فرمائی۔ فہرست میں سب سے پہلا نام لکھا تھا...... سعید ابن عامرؓ...... فہرست دیکھ کر حضرت عمرؓ ابن خطاب نے فرمایا کہ سعید ابن عامرؓ نامی تو گورنر حمص بھی ہیں۔ جواب ملا کہ یہ وہی سعید ابن عامرؓ ہیں جو حمص کے گورنر ہیں۔ خدا کی قسم تنگ دستی کی وجہ سے کئی کئی دن ان کے گھر چولہا نہیں جلتا۔ سعید ابن عامرؓ کا احوال جان کر حضرت عمرؓ ابن خطاب آزردہ ہوئے اور آبدیدہ ہوگئے۔ سعید ابن عامرؓ کی حالتِ زار پر اس قدر روئے کہ ان کی ریشِ مبارک آنسوؤں سے تربتر ہوگئی۔ حضرت عمرؓ ابن خطاب نے ایک ہزار دینار کی تھیلی سعید ابن عامرؓ کو بھجوائی جو انھوں نے فوراً خیرات کر دی اور امداد کا ایک دینار بھی رکھنا گوارا نہ کیا۔''

ہماری روایت اور ورثہ جس قدر تابناک تھا ہماری یافت اور ترکہ اس قدر شرمناک ہے۔ ہمیں ملا کیا تھا اور چھوڑے کیا جاتے ہیں۔ ہے کوئی تعزیر جو ایسے کھلے ڈاکے اور ڈاکوؤں پر عائد ہوتی ہے لگتا ہے ہمارے رب نے ہماری تقصیر ہمارے ماتھوں پر لکھ دی ہے جہاں عدم احتساب ہمارا جرم اور عدم استغاثہ ہماری سزا کے طور پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ ہمارا عہد سلامت صاحبان عالی شان گیلانی، زرداری، چودھری، میاں، مرزا، ملک، مخدومین اور ڈاکوؤں سے جانا جائے گا۔ ہمارا آغاز گورنر حمص جیسا صالح قانع اور عزت نفس کا امین اور ہمارا انجام مذکورہ گورنر پنجاب، خائن، طمع آلودہ اور عزت نفس سے عاری۔ زیاں ہائے زیاں کہ ہماری شناخت کیا تھی اور ہم پہچانے کن سے گئے۔

دعا ہے ''اے اللہ ہم پر رحم فرما اور اس مملکت خداداد کو ایسا حاکم عطا فرما جو خائن، جھوٹا، شعبدہ باز، اقربا پرور، عزت نفس سے عاری اور محض جہنم کا ایندھن ہونے کے بجائے خوش بخت، شجاع عدل آمادہ، مخلص، نیک اور دیندار ہو۔''

آمین

ذہن کھلا رکھیں

کچھ نیا سوچنے کا مرحلہ کیسے آسان بنایا جائے؟
اچانک سوجھنے والا نادر، شگفتہ اور اعلیٰ خیال کہاں سے آتا ہے؟
کیا ہمارا تخلیقی کارنامہ ایک طویل عرصے کی ذہنی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے؟

عاطف مرزا

WWW.PAKSOCIETY.COM

چند

بچے کھیل رہے تھے کہ ان کے ہاتھ ایک جادوئی چابی آگئی۔ چابی نے چمکنا شروع کردیا اور بچے چھوٹے بونوں میں تبدیل ہوگئے۔ بچوں نے خوفزدہ ہونے کے بجائے اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہونا شروع کردیا۔ وہ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے لیکن ان کی اصل حیرت کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ باہر باغ میں پہنچے۔

انھیں چھوٹے چھوٹے پودے بہت بڑے دکھائی دے رہے تھے۔ مٹی کا ایک ڈھیر ان کو پہاڑ کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسٹرابری کے پھلوں تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھے۔ جب وہ کھڑے ہوکر اس کے پھلوں کو زبان سے چاٹ رہے تھے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ہر چیز ان کے لیے بدل چکی تھی۔ وہ چیزوں کے ایسے پہلو دیکھ رہے تھے جو عام زندگی میں ان کی نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتے تھے۔

باغ کے عنوان سے بچوں کے لیے لکھی گئی یہ کہانی بہت دلچسپ ہے لیکن اس میں بڑوں کے لیے دلچسپی کا سامان بھی موجود ہے۔ یہ کہانی ہماری توجہ نئی یا تخلیقی سوچ کی اصل کی طرف دلاتی ہے۔ جب ہم چیزوں کے ایسے پہلو دیکھ رہے ہوتے ہیں جو عام زندگی میں ہم سے اوجھل ہوتے ہیں تو ہم اپنی تخلیقی صلاحیت استعمال کررہے ہوتے ہیں۔ جب ہم اپنی اس صلاحیت سے کام لیتے ہیں تو دراصل ہمارے ہاتھ میں ایک جادوئی چابی آجاتی ہے۔

ذہن کچھ مختلف اور اچھوتا سوچنے میں کامیاب ہو جائے تو اس لمحے سے ملنے والی خوشی کا مقابلہ شاید ہی کوئی اور انسانی سرگرمی کرسکتی ہے۔ ہمیں اپنے اردگرد نظر آنے والی ساری انسانی ترقی دراصل ایسے ہی تخلیقی لمحوں سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ فلسفہ، ادب، آرٹ، سائنس کے سارے کارنامے چیزوں کو کچھ مختلف اور بہتر انداز سے دیکھنے کی خواہش کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم اپنی تخلیقی سوچ سے کام لیں تو اپنی ذاتی زندگی میں بے شمار خوشگوار تبدیلیاں لاسکتے ہیں۔ ہم دوسروں سے اپنے تعلقات کو بہتر بناسکتے اور اپنے کام یا کاروبار میں تیزی سے ترقی کرسکتے ہیں۔

تاریخ کے عظیم مصور پکاسو کا کہنا تھا کہ تمام بچے آرٹسٹ پیدا ہوتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کے آرٹسٹ کو بچا کر رکھیں۔ نفسیات دان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ تھوڑی سی توجہ اور کوشش سے ہم کچھ نیا سوچنے کی اپنی صلاحیت کو بہتر بناسکتے ہیں۔ تخلیقی صلاحیت کو کیسے بہتر بنایا جائے؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ نئے خیالات کے پیدا ہونے کے عمل (Process) کو سمجھا اور ان باتوں کو اپنایا جائے جو تخلیقی سوچ کو فروغ دیتی ہیں۔ ادیب، شاعر، آرٹسٹ، انجینئر، سائنسدان اور وکیل، سب کے لیے تخلیقی عمل ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

ایک نیا خیال پہلے سے موجود چیزوں کی نئی ترکیب (Combination) ہوتا ہے۔ نئی ترکیب اس وقت وجود میں آتی ہے جب ہم پرانی چیزوں کے مابین کوئی تعلق (Relationships) دیکھ سکیں۔ جو ذہن چیزوں کے مابین کوئی تعلق دیکھ سکے وہ کئی نئے خیالات پیدا کرسکتا ہے۔

نفسیات دان جب ایڈورٹائزنگ کے لوگوں کو سوشل سائنس یا نفسیات جیسے مضامین پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں تو ان کا اشارہ اس طرف ہوتا ہے کہ ۲ مختلف چیزوں کے درمیان کوئی نیا تعلق دیکھا جائے۔ ان کے خیال میں پہلی نظر میں شاید نفسیات اور ایڈورٹائزنگ میں کوئی تعلق نظر نہ آئے لیکن ایڈورٹائزنگ کے بے شمار آئیڈیاز نفسیات کے میدان سے مستعار لیے گئے ہیں۔

درپیش مسئلے کے تخلیقی حل کے لیے سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اس مخصوص مسئلے، شے یا پراڈکٹ کے بارے میں پوری معلومات حاصل کی جائیں۔ اگر آپ ایڈورٹائزنگ سے تعلق رکھتے ہیں تو سب سے پہلے اپنی پراڈکٹ اور اپنے کسٹمرز کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کریں۔

بڑوں کے لیے سیکھنے کے مواقع

بچوں کی تعلیم میں تخلیقی سوچ پیدا کرنے کے لیے جن طریقوں کو اختیار کیا جاتا ہے ان میں بڑوں کے لیے بھی سیکھنے کے مواقع موجود ہیں۔ جرمن ماہر تعلیم فروبل (Frobel) نے ۱۸۳۷ء میں دنیا کا پہلا کنڈرگارٹن (Kindergarten) بنایا۔ اس نے بلاک، بیڈز (Beads) متعارف کروائے تاکہ بچے انھیں چیزیں بنانے، ڈیزائن کرنے اور تخلیق کرنے کے لیے استعمال کرسکیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کی تخلیقی صلاحیت ترقی کرے تو اس کے لیے ہمیں انھیں تخلیق کرنے کے مواقع دینا ہوں گے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اٹلی سے آغاز ہونے والی ابتدائی تعلیم کی مقبول فلاسفی Reggio Emilia ہے۔ اس کے تحت قائم ہونے والے سکولوں میں مختلف طرح کا میٹریل مہیا کیا جاتا ہے۔ مل کر کام کرنے کے مواقع دیے جاتے ہیں۔ بچے مختلف پروجیکٹس پر کام کرتے ہوئے Drawings اور ڈایاگرام بناتے ہیں۔ وہ جو کچھ کررہے ہوں اس پر انھیں غور وفکر کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ کلاس میں بچوں کی ڈرائنگز دیواروں پر لگادی جاتی ہیں تاکہ وہ اپنے کام کے ابتدائی مرحلوں پر غور کریں اور انھیں مزید بہتر Refine کرسکیں۔

۱۹ ویں صدی میں پیدا ہونے والے جدید افسانوں کے بانی فرانس کے ادیب موپساں کو ایک بڑے ادیب نے کچھ مختلف سوچنے کے لیے یہ مشورہ دیا کہ پیرس کی گلیوں میں جاؤ۔ ایک ٹیکسی چلانے والے کو منتخب کرلو۔ وہ تمھیں دوسرے ٹیکسی چلانے والوں جیسا ہی دکھائی دے گا لیکن اُسے اُس وقت تک غور سے دیکھتے رہو جب تک کہ اسے دنیا کے تمام ٹیکسی چلانے والوں سے مختلف شخصیت کے طور پر نہ دیکھ لو۔

Specific معلومات کے ساتھ ساتھ اپنی عمومی معلومات میں بھی اضافہ کرتے رہیں۔ جو لوگ نئے خیالات کی تلاش میں ہوتے ہیں ان کے لیے زندگی کا ہر رنگ کشش (Fascination) رکھتا ہے۔ آپ کو ان کے پاس سکریپ بک (Scrapbook) نظر آئے گی جس میں اخبارات اور میگزینوں کے تراشے نظر آئیں گے۔ اس میں وہ اپنے روزمرہ کے مشاہدات بھی نوٹ کرتے ہیں۔ ان کے پاس کمپیوٹر فولڈر ہوگا جس میں آپ کو بے شمار تصویریں (Images) اور آرٹیکلز نظر آئیں گے۔ اکثر اوقات وہ اپنی سکریپ بک یا کمپیوٹر فولڈر سے کوئی شاندار آئیڈیا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے جب وہ اس کی توقع نہیں کررہے ہوتے۔

مطالعۂ تاریخ کے عظیم ماہر وِل ڈیورانٹ نے عمومی معلومات بڑھانے کے لیے طالب علموں کو نصیحت کی تھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تمام بچے آرٹسٹ پیدا ہوتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کے آرٹسٹ کو بچا کر رکھیں

کہ جب آپ کی رسمی تعلیم مکمل ہو جائے تو ہفتے میں ۲ر گھنٹے انسانی علم اور تمدن کے سرچشموں سے فائدہ اٹھانا اپنا معمول بنا لیجیے۔ عظیم شاعروں، آرٹسٹوں، کمپوزروں، سیاست دانوں، مفکّرین، موٌرخین اور انسانیت کے عظیم معلموں کی فکر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وِل ڈیورانٹ کا کہنا تھا کہ میں اس وقت تک آپ کو تعلیم یافتہ نہیں سمجھوں گا جب تک ان میں سے اکثر کو اپنا دوست نہیں بنا لیتے۔ انھیں زندہ ہی سمجھیں۔ ان کو اپنے گھروں میں بلائیے، کتابوں کے شیلف میں جگہ دیں۔

دوسرا مرحلہ پرانے عناصر میں نئی ترکیب ڈھونڈنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس مرحلے میں ہمیں نیا خیال تلاش کرنے میں بے چینی اور مایوسی کا کئی بار سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اصل امتحان یہ ہے کہ مایوسی سے بچا جائے اور کوشش جاری رکھی جائے۔ اگر ذہن میں کوئی ناپختہ خیال بھی آئے تو اسے لکھ لیا جائے۔

تیسرے مرحلے میں آپ مسئلے کو حل کرنے کی شعوری کوشش ختم کر دیتے اور اسے ذہن سے باہر نکال دیتے ہیں۔ نئے خیال کے متلاشی اس مرحلے میں موسیقی سننے لگتے یا کوئی اچھی فلم دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ وہ شاعری کی کوئی کتاب بھی اٹھا سکتے یا کوئی کہانی پڑھنے لگتے ہیں۔

اگر آپ ان تینوں مرحلوں سے گزر چکے ہیں تو چوتھا مرحلہ خود بخود آپ کے سامنے ہوگا۔ یہ اس وقت سامنے آئے گا جب اس کی بالکل کوئی توقع نہیں کر رہے ہوں گے۔ شیو بناتے، نہاتے۔ صبح جب آپ پوری طرح بیدار نہ ہوئے ہوں یا آدھی رات کے وقت۔ نیوٹن نے اپنا قانونِ تجاذب فرصت کے وقت چہل قدمی کرتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ موازارٹ کے مطابق کھانے کے بعد چہل قدمی کرتے ہوئے یا رات کے ان لمحوں میں جب سویا نہ جا سکے خیالات اتنی تیزی سے ذہن میں آتے ہیں کہ جتنی آپ کی خواہش ہو۔ جرمن سائنسدان اور فلسفی (Helmholtz) کے ذہن میں روشن خیال ایک خوشگوار دن پہاڑی پر چڑھتے ہوئے نمودار ہوا۔ اسی کیفیت کے بارے میں سر والٹر سکاٹ کا کہنا تھا "میں اپنا روشن خیال کل صبح تک حاصل کر لوں گا۔"

بعض ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قلم اور کاغذ اپنے سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ کچھ خیالات لے کر بیدار ہوتے اور پھر انھیں لکھ لیتے۔ نئے خیال کے بارے میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ غیر متوقع جگہوں سے مل سکتا ہے اور کام رک جائے تو کچھ اور کریں اور پھر واپس آئیں۔

تھکا ہوا ذہن کبھی تازہ خیالات کو جنم نہیں دیتا۔ وقتاً فوقتاً اپنے ذہن کو آرام کا موقع دیں اور اپنی توجہ درپیش مسئلے سے ہٹا لیں۔

آخری مرحلے میں ہمیں اپنے خیالات کی حفاظت کرنا ہوتی ہے۔ اکثر خیالات اس مرحلے پر ضائع ہو جاتے ہیں۔ بہتر ہے کہ انھیں اپنے پاس نہ رکھا جائے بلکہ دوسروں کو اس میں شریک کیا جائے۔ وہ ایسے پہلوؤں کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں جو شاید آپ نے نظر انداز کر دیے ہوں۔

تخلیقی صلاحیت میں اضافہ ممکن ہے

Innovator's DNA کے مصنف ہال گریگرسین (HAl Gregersen) کے مطابق جو Skills ضروری ہیں ان میں سے دو تہائی سیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ ۵ر بنیادی Skills یہ ہیں۔

۱۔ سوال اٹھانا۔
۲۔ چھوٹی تفصیلات نوٹ کرنا۔
۳۔ مختلف بیک گراؤنڈ رکھنے والوں سے کچھ مختلف سیکھنا۔
۴۔ نئے آئیڈیا کو آزماتے رہنا۔
۵۔ Associational Thinking مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے سوالوں، مسئلوں اور آئیڈیاز میں کوئی ربط ڈھونڈ لینا۔

جاگتی آنکھوں کے خواب

اپنے وقت کا کچھ حصہ اس بات کے لیے رکھا جائے کہ جو کچھ ذہن میں آئے اس پر سوچا جائے اور سوچنے کے لیے کچھ خاص طے نہ کیا جائے۔

خیالی پلاؤ پکانے یا جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ بعض اوقات موجد اپنے آئیڈیاز اپنے خوابوں سے ہی لیتے ہیں۔

تھامس ایڈیسن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بال بیرنگ ہاتھوں میں لے کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے سونے کی کوشش کرتا۔ جلد وہ ایسی حالت میں ہوتا کہ آدھا جاگ رہا ہوتا اور آدھا سویا ہوا ہوتا۔ جب وہ کافی Relaxed ہو جاتا تو بال بیرنگ نیچے گرنے سے جاگ جاتا۔ وہ جلد از جلد اِن خیالات کو لکھ لیتا جو خواب کی حالت میں اس کے ذہن میں داخل ہوئے تھے۔

بچوں کی کہانی ایلس ان ونڈر لینڈ کی ملکہ اپنے دن کا آدھا گھنٹہ ناممکن چیزوں کے بارے میں سوچتی تھی۔ اپنے ذہن کو اِدھر اُدھر گھومنے دیں اور اپنے ذہن کو وہ تمام آئیڈیاز سوچنے دیں جو وہ سوچ سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ عجیب اور مضحکہ خیز ہو سکتے ہیں۔ اپنے معیار کو کچھ دیر کے لیے بھول جائیں۔ اگر آپ اس آوارہ گردی میں ۱۰۰ر خیالات سوچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ان میں سے ایک آئیڈیا بھی قابلِ عمل نکلتا ہے تو پھر آپ کا وقت ضائع نہیں ہوا۔

نیا خیال یا علم پہلے سے موجود علم سے کیسے وجود میں آتا ہے، سائنس کے میدان میں اس کا مشاہدہ بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ نیوٹن نے سائنسدانوں کے بارے میں کہا تھا کہ وہ گزرے ہوئے بڑے لوگوں Giants کے کندھوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایڈیسن کی ایجادات دوسرے لوگوں کی ایجادات میں تبدیلیاں لانے کی کوشش میں سامنے آئیں۔ ڈی این اے کی ساخت (Structure) کی دریافت پر نوبل انعام حاصل کرنے والے فرانسس کریک اور جیمز ڈی واٹسن نے اپنے کام کی بنیاد ولکنز اور فرینکلن کی تحقیق پر رکھی۔ جذباتی ذہانت کے تصور کے لیے ڈینیل گولمین نے اپنے سے پہلے کیے گئے نفسیات دانوں کے کام سے فائدہ اٹھایا۔

تخلیقی سوچ کے ۳ر اہم اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ نئے خیالات اپنی تعریف کے لحاظ سے غیر روایتی (Unconventional) ہوتے ہیں۔ انھیں شعوری یا لاشعوری طور پر دبا دیا جاتا ہے۔ شروع میں ان کا تنقیدی

WWW.PAKSOCIETY.COM

جو لوگ نئے خیالات کی تلاش میں رہتے ہیں اُن کے لیے زندگی کا ہر رنگ کشش رکھتا ہے

جائزہ (Evaluate) نہ لیں بلکہ انھیں سامنے لے کر آئیں۔

۲۔ مقدار سے معیار کی طرف جائیں۔ پہلے ہمارے سامنے ایسے خیالات آتے ہیں جو ہم سوچنے کے عادی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ اگر ہم سے کہا جائے کہ اینٹ کے ۱۰۰ استعمال کیا ہو سکتے ہیں تو ہمارا ذہن پہلے معروف طریقوں کی طرف جائے گا لیکن آہستہ آہستہ ہم غیر معروف طریقوں کی طرف آنے لگیں گے۔

۳۔ ٹیم ورک: انفرادی طور پر سوچنے کے فائدوں سے کسی کو انکار نہیں لیکن ٹیم کی شکل میں کام کرنے سے بعض اوقات مختلف شعبوں سے آرا سننے کو ملتی ہیں۔ آپ درپیش مسئلے کے حل کے لیے مختلف پہلوؤں سے غور کرتے ہیں۔

مائیکروسافٹ ریسرچ کے محقق بل بکسٹن کا کہنا ہے کہ جدت اس وقت سامنے آتی ہے جب ٹیم کی شکل میں کام کیا جائے۔ ٹیم میں ایک سطحی آئیڈیا پر بھی غور وخوض کیا جائے تو اس کے نتیجے میں ایک شاندار آئیڈیا مل سکتا ہے۔

چیزوں کو مختلف انداز سے دیکھنے کے لیے یہ طریقے (Techniques) بھی کارآمد ہو سکتے ہیں:

بھروپ بھرنا
(Role Playing)

اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ آپ کی پراڈکٹ کو کس نظر سے دیکھیں گے تو محض تصور کرنا کہ دوسرا کیا سوچے گا کافی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے کے Role کو محسوس کیا جائے۔ اس سے ذہن کو کچھ مختلف سوچنے کا موقع ملتا ہے۔

خود کو مستقبل میں رکھنا
(Thinking Backward)

اگر ایک چیز ہو چکی ہے تو خود کو مستقبل میں رکھتے ہوئے یہ سوچیں کہ اس کے رونما ہونے میں کن کن عوامل کا دخل ہو سکتا ہے۔ اس سے بھی آپ کو کچھ مختلف سوچنے میں مدد ملتی ہے۔

مسئلے کو مخالفانہ دلائل سے پرکھنا
(Devil's Advocate)

خود اپنے آئیڈیا پر تنقید کریں اور ایسے سوالات سوچیں جو دوسرے اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کے بارے میں کر سکتے ہیں۔

تخلیق کی راہ میں چند رکاوٹیں یہ ہو سکتی ہیں۔

ناکامی کا خوف

تخلیقی سرگرمی کی راہ میں اہم رکاوٹوں میں سے ایک ناکامی کا خوف ہے یعنی ہم رسک لینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ہم شرمندگی یا دکھ سے بچنے کے لیے اپنا ہدف آسان رکھ لیتے ہیں۔

اعتماد کا فقدان

بعض اوقات ہم جن باتوں یا نظریات کو صحیح سمجھتے ہیں ان کے لیے کھڑے ہونے سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں کئی ایسے موجد ملیں گے جن کی مخالفت کی گئی لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور دنیا کو کئی چیزوں کی ایجادات کا تحفہ دے کر گئے۔

مستقل مزاجی

اگر ہم رکاوٹیں سامنے آنے پر جلد ہار مان لیں تو اپنی تخلیق سامنے لانے میں ناکام رہیں گے۔ کسی بھی تخلیقی حل کی کوشش میں ہمیں ناآسودگی (Frustation)، بے آرامی اور بے چینی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اپنی روٹین ختم کیجیے

۱۔ اپنے مسئلے یا حل کو کسی ایسے جاننے والے کے ساتھ شیئر کریں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ ہو۔

۲۔ کوئی میگزین اٹھائیے اور اس کے آرٹیکلز پر ایک نظر دوڑائیے۔ اپنے مسئلے اور ان کے درمیان کوئی ربط (Connection) ڈھونڈنے کی کوشش کیجیے۔

اخبار یا میگزین میں سے کوئی تصویر منتخب کیجیے اور اس سے متعلق ایک کہانی تخلیق کیجیے۔

جو ہاتھ آپ کم استعمال کرتے ہیں اس سے کلرڈ پنسل کے ذریعے کچھ بنانے کی کوشش کریں۔

کم استعمال ہونے والے ہاتھ سے جب میں بچہ تھا کا جملہ لکھیے اور اس پر ایک مضمون لکھنے کی کوشش کیجیے۔

ایڈیسن کو اپنے بے شمار تجربات میں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ ان سے مایوس نہیں ہوا۔ الیکٹرک بلب کے فلامنٹ (Filament) کے لیے موزوں میٹریل ڈھونڈنے کے عمل میں وہ ہزار مرتبہ ناکام ہوا لیکن اس کا کہنا تھا کہ یہ سب سیکھنے کے عمل کا حصہ ہے۔

ڈیزائن فرم IDEO کا کہنا ہے کہ Fail early, fail often یعنی آغاز میں ناکام ہونا اور کئی بار ناکام ہونا اچھا ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح سٹین فورڈ انسٹیٹیوٹ آف ڈیزائن کی تعلیم ہے کہ F دراصل نیا A ہے ناکامی کے بغیر کوئی کامیابی نہیں۔

ماہر نفسیات اور Explaining Creativity کے مصنف کیتھ سایر (Keith Sawyer) کے مطابق تخلیقی عمل کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ ایک خیال جادوئی طریقے سے بصیرت کے پردے پر اچانک نمودار ہوتا ہے۔ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ جب آپ کوئی تخلیقی کام کرتے ہیں تو یہ ہماری روزمرہ کی سوچ سے مختلف کوئی ذہنی عمل نہیں ہوتا۔ جیسے روزمرہ کی زندگی میں ٹریفک کا بہاؤ رک جائے اور آپ راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تخلیقی حل بھی ایسا ہی ہوتا۔

رسک لینا سیکھیں۔ آپ بے شمار غلطیاں کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ محنت سے کام کریں یہی تخلیقی سوچ کی جان ہے۔ اگر آپ آمد (Inspiration) کے کسی لمحے کے انتظار میں ہی رہیں گے تو ہو سکتا ہے وہ چیز ہم کبھی تخلیق نہ کر پائیں جو ہم تخلیق کر سکتے ہیں۔

لگے بندھے معمولات سے نجات حاصل کیجیے

کچھ ایسا حاصل کرنے کے لیے جو آپ نے کبھی حاصل نہ کیا ہو آپ کو کچھ ایسا بھی کرنا چاہیے جو آپ نے کبھی نہ کیا ہو۔ ٹیکساس اے اینڈ ایم یونیورسٹی کے نفسیات کے پروفیسر سٹیون سمتھ کے مطابق جب ہم اپنی روٹین ختم کرتے ہیں تو اس سے ہمارے سامنے کئی امکانات آ جاتے ہیں۔

ہم اکثر اپنے اہم آئیڈیاز کا ذکر اپنے دوستوں کے مخصوص سرکل میں ہی کرتے ہیں۔ اس سے ہم ایک اچھی فیڈ بیک سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات اس سرکل سے نکلنے سے ہمیں کوئی ایسا نکتہ مل جاتا ہے جو ہم نظرانداز کر چکے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ جو آپ کے شعبے کا محدود علم رکھتے ہیں آپ کے سامنے کوئی ایسا حل رکھ سکتے ہیں جو آپ کو حیران کر سکتا ہے۔

اگر آپ روزانہ ایک ہی جگہ مقید رہتے ہیں تو آپ کی تخلیقی توانائی ماند پڑنے لگتی ہے۔ باہر کی دنیا میں موجود

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھکا ہوا ذہن کبھی تازہ خیالات کو جنم نہیں دیتا وقتاً فوقتاً اپنے ذہن کو آرام کا موقع دیں اور اپنی توجہ درپیش مسئلے سے ہٹا لیں

تصویروں، پودوں، کتابوں حتیٰ کہ بچوں کے کھلونوں سے بھی آپ کچھ ایسا سیکھ سکتے ہیں جس سے آپ کی تخلیقی توانائی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ ہم صرف ایسی معلومات میں دلچسپی لیتے ہیں جو ہمارے پہلے سے موجود نظریات سے مطابقت رکھتی ہوں۔ اگر آپ ایک ہی طرح کے اخبارات اور کتابیں پڑھتے ہیں تو کبھی معمول سے ہٹ کر کسی مختلف اخبار یا کتاب کو پڑھنا شروع کریں، باغبانی پر لکھی گئی کتاب، پکوان کی ریسیپی، کھیلوں پر لکھی گئی کوئی کتاب اٹھالی جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

آپ کسی کلاس میں داخلہ لے سکتے ہیں جیسے کوکنگ یا سیلف ڈیویلپمنٹ پر لیکچر سننے جاسکتے ہیں۔ آن لائن سرچ انجن کے ذریعے کوئی نئی ویب سائٹ ڈھونڈ کر وزٹ کر سکتے ہیں۔ اپنے علاقے یا شہر کے کسی نئے حصے کو دیکھنے کا پروگرام بنائیں اور اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کیجیے۔

ایک معروف مصنف اپنی ذہنی رکاوٹ دور کرنے کے بارے میں لکھتا ہے کہ اکثر اوقات لکھتے ہوئے مجھے ذہنی رکاوٹ (Mental Block) کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سب کچھ اچھا چل رہا ہوتا ہے کہ اچانک میں کسی پیراگراف پر رک جاتا ہوں اور اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ میں اسے لکھتا ہوں لیکن مجھے وہ اچھا نہیں لگتا لیکن میں اس سے بہتر لکھ نہیں پاتا۔ میں اسے دوبارہ لکھتا ہوں مگر یہ تقریباً پہلے جیسا ہی لکھا جاتا ہے۔ اس وقت میری سوچ رک جاتی ہے اور میں سوچ کے اس پیٹرن سے نکل نہیں پاتا۔ اس کا ایک عام علاج تو یہ ہے کہ کچھ وقفہ کیا جائے کسی اور چیز پر کام کیا جائے۔ تھوڑا وقت گزرنے کے بعد آپ اس مسئلے کی طرف واپس آئیں گے تو کچھ مختلف لکھ سکیں گے۔

میں اس مسئلے کو ایک اور طریقے سے حل کرتا ہوں۔ میں اس کے بارے میں بلند آواز سے خودکلامی کرتا ہوں۔ میں اپنے آفس کا دروازہ بند کر لیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے اس طرح خودکلامی کرتے ہوئے دیکھے۔ میں اِدھر اُدھر گھومتا اور خود سے اس پر بات کرتا ہوں۔ میں اس پر غور کرتا ہوں کہ اس پیراگراف کا بنیادی نکتہ کیا ہے۔ میں اس میں دراصل کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں خود کو اس بات کا جواب اتنی بلند آواز سے دیتا ہوں جیسے کسی دوسرے کو بتایا جاتا ہے۔ ''میں اصل میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں۔'' اور پھر مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ بلند آواز سے بولنا اس رکاوٹ کو دور کر دیتا ہے اور الفاظ مختلف انداز میں سامنے آنے لگتے ہیں۔ حالیہ تحقیق نے وضاحت کر دی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ سائنسدانوں نے یہ جان لیا ہے کہ لکھی ہوئی زبان اور بولی گئی زبان پر دماغ مختلف طریقوں سے کام کرتا ہے۔ یہ دونوں مختلف نیورانئز کو متحرک کرتی ہیں۔

مثبت خودکلامی تخلیقی سوچ کے لیے بڑی اہم ہے۔ خود کو یقین دلائیں کہ یہ کام یا یہ مسئلہ آپ حل کر سکتے ہیں۔ تو یقیناً آپ اس کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اگر آپ مضبوط ارادے کے ساتھ ساتھ تخلیقی صلاحیت میں اضافے کے لیے تیار ہو جائیں تو ہر رکاوٹ عبور کی جاسکتی ہے۔ ■

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ ۲/جون ۱۹۴۹ء کی بات ہے، تہران، ایران میں سوویت سفیر راجہ غضنفرعلی خان سے ملنے ان کے دفتر پہنچا۔ راجہ صاحب تحریک آزادی پاکستان کے ممتاز رہنما اور وزیراعظم لیاقت علی خان کے معتمد خاص تھے۔ تب وہ ایران میں بطور سفیر پاکستان تعینات ہو چکے تھے۔ سوویت سفیر نے انھیں یہ زبانی پیغام دیا کہ صدر جوزف اسٹالن نے وزیراعظم پاکستان کو سوویت یونین کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔

راجہ غضنفرعلی خان نے یہ پیغام بذریعہ تار کراچی بھجوا دیا۔ اس سے قبل امریکی صدر، وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کو امریکا آنے کی دعوت دے چکے تھے۔ پاکستانی حکومت نے ایک ہفتہ بعد اعلان کیا کہ وزیراعظم نے دورہ سوویت یونین کی دعوت قبول کرلی ہے۔ اس اعلان پر واشنگٹن اور لندن میں خاصی ہلچل دیکھی گئی۔ اس کی وجہ عیاں ہے۔

اُس زمانے میں پاکستان عالم اسلام کا سب سے بڑا ملک تھا۔ چنانچہ سوویت یونین نے کوشش کی کہ پاکستان سے قریبی تعلقات قائم کیے جائیں لیکن تب تک امریکا اور سوویت یونین کے مابین سرد جنگ شروع ہو چکی تھی اور امریکیوں (اور برطانویوں کی بھی) سعی تھی کہ نوآزاد ایشیائی و افریقی ممالک سوویت یونین سے روابط نہ رکھیں جو ان کے سامنے بحیثیت حریف ابھر رہا تھا۔ لہٰذا وزیراعظم لیاقت علی خان نے روس جانے کا فیصلہ کیا، تو امریکا و برطانیہ میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

سوویت حکومت نے دورے کی تاریخ ۱۵/اگست ۱۹۴۹ء مقرر کی تھی۔ تاہم پاکستانی حکومت نے روسیوں کو

پاکستان کے پہلے وزیراعظم جو دورۂ سوویت یونین کی بھرپور کوشش کرتے رہے لیکن روسی حکومت نے پُراسرار وجوہات کی بنا پر انھیں نہیں بلایا

مطلع کیا کہ وزیراعظم یومِ آزادی پر بیرونِ ملک دورہ نہیں کر سکتے، تاہم وہ بذریعہ تہران ۱۷/اگست کو ماسکو پہنچ جائیں گے۔ سوویت حکومت نے خاصی دیر بعد ۲۸/جولائی کو یہ پیغام دیا کہ دورہ اکتوبر یا نومبر تک ملتوی کر دیا جائے۔ پاکستانی حکومت نے یہ درخواست منظور کرتے ہوئے دورے کی تاریخ ۵/نومبر مقرر کر دی۔

تاہم ۱۴/اگست کو ایران میں سوویت سفیر دوبارہ راجہ صاحب سے ملا۔ اس نے سوویت حکومت کا یہ پیغام دیا کہ وہ باقاعدہ سفارتی تعلقات بحال ہونے اور سفیروں کی تقرری تک دورہ ملتوی کرنا چاہتی ہے۔ پاکستانی حکومت نے روسیوں کو بتایا کہ وہ پہلے ہی موزوں شخصیت کی تلاش میں ہے تاکہ اُسے سوویت یونین میں سفیر بنایا جا سکے۔ آخر اس اہم عہدے پر شعیب قریشی کا انتخاب ہوا۔

چین اور روس کی قربت، اصل معاملہ کیا ہے!

روس ایک نظر میں

روس کا سرکاری نام وفاق روس ہے۔ اس کا رقبہ ایک کروڑ ۷۰/لاکھ ۷۵/ہزار ۴۰۰/مربع کلومیٹر ہے۔ یہ بہ لحاظ رقبہ دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ ۸۴/وفاقی ریاستوں پر مشتمل ہے۔ آبادی ۱۴/کروڑ ۳۰/لاکھ ہے۔ چنانچہ بہ لحاظ آبادی روس دنیا کا نواں بڑا ملک ہے۔

روس تیل و گیس اور معدنیات کے سب سے بڑے ذخائر رکھتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ جنگلات بھی اسی ملک میں واقع ہیں۔ نیز روسی جھیلوں میں دنیا کا تقریباً ۲۵/فیصد میٹھا پانی جمع ہے۔ روسی معیشت پرچیزنگ پاور پیریٹی کے لحاظ سے چھٹی جبکہ بہ لحاظ نومینل جی ڈی پی نویں بڑی ہے۔ یہ تیسرا بڑا جنگی بجٹ رکھتا ہے۔ (امریکا اور چین کے بعد) روس اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا مستقل رُکن اور تمام اہم بین الاقوامی تنظیموں میں شامل ہے۔

روسی معیشت بہت تیزی سے ترقی کر رہی ہے، تاہم اُسے بعض مسائل کا بھی سامنا ہے مثلاً ملکی انفراسٹرکچر کئی برس پرانا ہے۔ تاہم روسی حکومت اُسے جدید بنانے کے لیے ۲۰۲۰ء تک ایک ٹریلین ڈالر خرچ کرے گی۔ مزید برآں حکومت میں کرپشن کا بھی دور دورہ ہے۔ پچھلے کئی برس سے روس کا شمار کرپٹ ترین ممالک میں ہوتا رہا ہے لیکن صدر پوٹن اب کرپشن پر قابو پانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

سیاسی طور پر صدر پوٹن کی حکومت مستحکم ہے مگر ان کے خلاف اکثر احتجاج بھی ہوتے ہیں۔ احتجاجی روس میں بھی جمہوریت چاہتے ہیں۔ روسی حکومت کا کہنا ہے کہ یہ احتجاج امریکی و یورپی پیسے سے ہوتا ہے تاکہ روس کو غیر مستحکم کیا جا سکے۔

شعیب قریشی کی تقرری میں خاصا عرصہ لگ گیا۔ دوسری طرف سوویت حکومت نے اپنے سفیر کا تقرر نہیں کیا۔ یوں پاکستانی وزیراعظم کا دورہ روس کھٹائی میں پڑ گیا۔ اس التوا کی ذمے دار یقیناً سوویت حکومت تھی جو دورے کی پیشکش کر کے پیچھے ہٹ گئی اور لیت و لعل سے کام لینے لگی۔

اسی دوران وزیرخزانہ (بعد میں گورنر جنرل) غلام محمد کی قیادت میں پاکستانی رہنماؤں کا ایک گروپ وزیراعظم کے دورہ سوویت یونین کی مخالفت کرنے لگا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ پاکستانی حکومت سوویت یونین کے بجائے امریکا سے تعلقات بڑھائے جو بقول ان کے نوخیز مملکت کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ اسی اثنا میں امریکا نے بھی وزیراعظم پاکستان کو دورے کی دعوت دے ڈالی۔ چونکہ سوویت حکومت گومگو کی کیفیت میں تھی لہٰذا مئی ۱۹۵۰ء کو لیاقت علی خان امریکا چلے گئے۔

اسی دورے کے باعث پاکستان میں اس جھوٹی روایت نے جنم لیا کہ لیاقت علی خان سوویت حکومت کی دعوت رد کرکے امریکا چلے گئے۔ یوں پاکستان امریکا کے کیمپ میں جا پہنچا اور اس کے سوویت یونین سے تعلقات خراب ہوگئے۔

حقیقت یہ ہے کہ لیاقت علی خان امورخارجہ میں غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے۔ ثبوت یہ ہے کہ سوویت حکومت کی سردمہری کے باوجود وہ دورے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ انھوں نے راجہ غضنفرعلی خان کو اپریل ۱۹۵۰ء میں ہدایت دی کہ وہ سوویت سفیر سے مل کر دورے کا معاملہ اٹھائیں۔ لیاقت علی خان سوویت یونین جانے کے اتنے متمنی تھے کہ انھوں نے سرکاری وفد میں شامل کی جانے والی شخصیات کا بھی چناؤ کرلیا۔ دلچسپ بات یہ کہ وفد میں میجر یعقوب خان بھی شامل تھے جو بعدازاں موثر پاکستانی وزیرخارجہ بن کر اُبھرے۔

لیکن پُراسرار وجوہ کی بنا پر سوویت یونین حکومت

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے پاکستانی وزیراعظم کو نہیں بلایا۔ یہ وجوہ اسی وقت طشت ازبام ہوسکتی ہیں جب موجودہ روسی حکومت اس زمانے کی خفیہ فائلیں منظر عام پر لے آئے۔ بہرحال سوویت حکومت کی لاتعلقی کے باوجود لیاقت علی خان نے اپنی غیرجانب داری برقرار رکھی۔ گو یہی امر ان کی شہادت کا باعث بھی بن گیا۔

اس شہادت کی مختصراً تفصیل یہ ہے کہ اوائل ۱۹۵۱ء میں ایرانی وزیراعظم محمد مصدق نے تیل کی صنعت قومیالی جو برطانویوں کے قبضے میں تھی۔ اس امر نے انگریزوں کو چراغ پا کردیا۔ چنانچہ وہ امریکیوں کے ساتھ مل کر بہادر ایرانی وزیراعظم کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ اسی دوران انھوں نے پاکستانی وزیراعظم پر دباؤ ڈالا کہ وہ محمد مصدق سے تیل کے کنوئیں واپس برطانوی کمپنیوں کو دلوائیں۔ تاہم لیاقت علی خان نے ان کے احکامات ماننے سے انکار کردیا۔ اس پر ہمارے سابق نوآبادیاتی آقاؤں کا غصہ عروج پر جا پہنچا۔ انھیں یقین نہ آیا کہ ماضی کے غلام اب ان کو للکار رہے ہیں۔ چنانچہ امریکی سی آئی اے اور برطانوی ایم ۵/خفیہ ایجنسیوں نے مقامی پٹھوگروپ کی مدد سے پہلے بتاریخ ۱۶/اکتوبر ۱۹۵۱ء لیاقت علی خان کو شہید کیا۔ بعدازاں اگست ۱۹۵۲ء میں وزیراعظم محمد مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ یوں پاکستان اور ایران، دونوں اسلامی ممالک میں امریکا دوست حکمرانوں نے اقتدار سنبھال لیا۔

سوویت یونین اور پاکستان.....۱۹۴۹ء تا ۱۹۹۱ء

لیاقت علی خان کے بعد آنے والے پاکستانی حکمرانوں نے غیرجانب داری ترک کی اور کھلم کھلا امریکا کے حمایتی بن گئے۔ سوویت یونین کے خلاف ہونے والے کئی معاہدوں مثلاً سیٹو، سینٹو وغیرہ میں پاکستان شامل ہوا۔ چنانچہ سوویت یونین سے تعلقات مزید خراب ہوگئے۔ یہ دشمنی میں اس وقت بدلی جب پاکستانی صدر ایوب خان نے سی آئی اے کو اجازت دے ڈالی کہ وہ پشاور سے یو۔۲ طیارے اڑا سکتی ہے۔ یہ طیارے اونچی پرواز کرتے ہوئے سوویت یونین کی عسکری و سول تنصیبات کی تصاویر اتارتے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں روسیوں نے ایک یوٹو طیارہ مار گرایا، تو انکشاف ہوا کہ پاکستان تو امریکیوں کا اڈہ بن چکا ہے۔

اس واقعے کے بعد روسی پاکستان سے برگشتہ ہوگئے۔ انھوں نے پھر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں کھل کر بھارت کا ساتھ دیا۔ جلد ہی سوویت یونین، بھارت کو اسلحہ فراہم کرنے والا سب سے بڑا ملک بن گیا۔ بھارتیوں نے ایٹم بم بھی روسیوں کی مدد ہی سے بنایا۔

جب ۱۹۷۱ء میں سوشلسٹ رہنما ذوالفقار علی بھٹو نے بچا کھچا پاکستان سنبھالا، تو سوویت حکومت کچھ نرم پڑی۔ بھٹو نے بعدازاں سوویت یونین کا دورہ کیا۔ پھر روسیوں نے اپنے خرچ پر کراچی میں اسٹیل مل لگائی۔ تاہم ۱۹۷۹ء میں سوویت فوج افغانستان میں داخل ہوئی تو پاک روسی تعلقات پھر خراب ہوگئے۔ اب پاکستان اور امریکا کے تعاون سے افغان مجاہدین نے سوویت فوج کے خلاف جنگ لڑی اور اُسے شکست دی۔ افغانستان میں روسی فوج کی ہار نے سوویت یونین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کا خاتمہ ہوا اور وفاق روس وجود میں آیا۔ پاکستانی حکومت نے کمیونسٹوں کے زوال کا خیرمقدم کیا کیونکہ وہ مذہب مخالف ہونے کی وجہ سے اسلام کے کٹر دشمن تھے۔ خصوصاً کمیونسٹوں نے روسی مسلمانوں پر جو ظلم و ستم کیے وہ انسانی تاریخ کا سیاہ باب ہیں۔

۲۰ ویں صدی کے اختتامی برسوں میں تب کے وزیراعظم پاکستان، نواز شریف نے روس کا دورہ کیا۔ یوں برسوں کی منجمد برف کچھ پگھلی اور تعلقات میں گرم جوشی آئی۔ حادثہ ۹/۱۱ تو علاقائی صورتِ حال تلپٹ کرگیا۔ اس سے قبل روس افغانستان میں شمالی اتحاد کا پشت پناہ تھا۔ جبکہ پاکستان اور امریکا طالبان کے حامی تھے لیکن راتوں رات زبردست تبدیلی آئی اور شمالی اتحاد امریکیوں کا ساتھی بن گیا۔ امریکا نے اسی کی مدد سے طالبان حکومت کا خاتمہ کیا اور کابل میں اپنے پٹھو، حامد کرزئی کو صدر بنادیا۔

جب امریکی فوج روس کے پچھواڑے آبیٹھی، تو اس کا متوحش ہونا لازمی تھا۔ تاہم ۲۰۰۱ء میں روسی حکومت معاشی و سیاسی طور پر اتنی طاقتور نہیں تھی کہ اکلوتی سپرپاور کا مقابلہ کرتی۔ چنانچہ روسی صدر ولادیمر پیوٹن نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ رفتہ رفتہ تیل و گیس کی قیمتیں بڑھنے سے روس کی معاشی حالت سنبھلی اور حکومت میں بھی استحکام آگیا۔ یوں صدر پیوٹن کو موقع ملا کہ وہ خصوصاً وسطی ایشیا میں امریکا کی بڑھتی چودھراہٹ کو چیلنج کرسکیں۔

امریکا کا مقابلہ کرنے کے لیے صدر پیوٹن نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ دیگر علاقائی قوتوں کو بھی ساتھ ملایا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ۲۰۰۵ء کے بعد چین سے تعلقات بڑھائے۔ ۲۰۰۶ء میں یہ اہم اعلان کیا کہ پاکستان کو شنگھائی کوآپریشن آرگنائزیشن کا رکن بننا چاہیے۔ نیز ایران سمیت دیگر وسط ایشیائی ممالک سے روابط میں اضافہ کیا۔

تعلقات کا نیا موڑ

گزشتہ تین چار برس میں روس اور پاکستان کے مابین جو اعلیٰ سطحی رابطے دیکھنے کو ملے، ماضی میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ اس دوران روسی اور پاکستانی حکمرانوں کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ نیز پاک بری فوج اور فضائیہ کے سربراہوں نے روس کا دورہ کیا۔ بعدازاں روسی افواج کے سربراہ، وزیر اور مشیر پاکستان آئے۔

سال رواں کے اوائل میں سابق وزیراعظم یوسف

روسی صدر کے دورۂ پاکستان کے التوا کی وجوہات کیا ہیں؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

رضا گیلانی اور صدر پیوٹن کی ملاقات ہوئی، تو اوّل الذکر نے انھیں پاکستان آنے کی دعوت دی۔ روسی صدر نے دعوت قبول کرلی۔ انھیں اکتوبر ۲۰۱۲ء کے پہلے ہفتے پاکستان پہنچنا تھا لیکن کئی وجوہ کے بیک وقت اکٹھے ہونے کی وجہ سے دورہ ملتوی ہوگیا۔ ان میں سے اہم وجوہ یہ ہیں:

۱۔ روس بھارت کو ۴۰ ''پرسخوئی'' فروخت کرنا چاہتا ہے۔ یہ روسی ساختہ سخوئی جنگی طیاروں کی جدید قسم ہے۔ تاہم بھارتی حکومت نے روس کو دھمکی دی کہ اگر روسی صدر نے پاکستان کا دورہ کیا تو تقریباً ۴ ارب ڈالر مالیت والا معاہدہ انجام نہیں پائے گا۔ بھارت روسی اسلحہ کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ یوں بھی وہ اُسے کسی قیمت نہیں کھونا چاہتے۔

۲۔ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کچھ عرصے سے خوشگوار نہیں رہے۔ دونوں ممالک کی فوجیں گولہ باری کا تبادلہ کرتی ہیں۔ حامد کرزئی اکثر الزام لگاتا ہے کہ افغانستان میں فساد کی ذمے دار آئی ایس آئی اور حقانی نیٹ ورک ہے۔ ایسے حالات میں امریکی حکومت کے زیرِ اثر افغان حکومت نے ۴ رملکی کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کردیا۔ چونکہ کانفرنس کا موضوع ہی افغانستان کا مستقبل تھا، لہٰذا اس کی عدم موجودگی میں وہ بے معنی ہو گئی۔ لہٰذا روسی صدر کا آنا ملتوی ہوا۔

۳۔ درج بالا وجوہ کے علاوہ روسی حکومت نے سیکورٹی مسائل بھی مدنظر رکھے۔ جب صدر پیوٹن کو دورہ کرنا تھا، تو توہین آمیز امریکی فلم کے خلاف مظاہرے شروع ہوگئے۔ چنانچہ عین ممکن ہے کہ خود حکومت پاکستان نے روسی صدر کو آنے سے منع کردیا۔

بہرحال دورہ ملتوی ہوا ہے، ختم نہیں جبکہ پاک بری فوج کے سربراہ، جنرل کیانی حسبِ پروگرام ماسکو گئے اور وہاں روسی افواج کی اعلیٰ ترین قیادت سے ملے۔ دونوں ممالک کی افواج عسکری شعبے میں تعاون بڑھانے کی متمنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روسی حکومت نے جے ایف۔۱۷ جنگی جہاز میں چین کو روس ساختہ انجن لگانے کی اجازت دے دی۔ واضح رہے، اگلے ایک عشرے تک یہی پاک فضائیہ کا مرکزی جنگی طیارہ ہوگا۔ مزید برآں پاک فوج اپنے یوکرائنی ساختہ ٹی۔۸۰ یو ڈی ٹینکوں کے لیے فاضل پرزہ جات چاہتی ہے۔ اُمید ہے کہ روسی حکومت یوکرائن سے معاہدے میں رکاوٹ پیدا نہیں کرے گی۔

روس پاکستان کی طرف متوجہ کیوں ہوا؟

امریکا نے اعلان کر رکھا ہے کہ ۲۰۱۴ء کے اواخر تک امریکی اور نیٹو افواج افغانستان سے چلی جائیں گی لیکن یہ اعلان مبنی بر حقیقت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ امریکیوں نے کئی افغان چھاؤنیوں میں قلعہ نما عمارات تعمیر کرلی ہیں۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ امریکی طویل عرصہ تک افغانستان میں قیام چاہتے ہیں۔

امریکیوں کو دراصل وسطی ایشیا کے قدرتی وسائل (تیل، گیس، معدنیات) سے اَزحد دلچسپی ہے۔ واضح رہے، وسطی ایشیا میں مختلف قدرتی وسائل کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ حتیٰ کہ افغانستان میں دو تین ٹریلین ڈالر کی معدنیات پائی گئیں۔ لہٰذا امریکی سونے کی اس چڑیا کو چھوڑنے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ ساتھ ساتھ وہ اس لیے بھی افغانستان میں قیام چاہتے ہیں کہ وسطی ایشیا میں چین اور روس کا اثرورسوخ پھیلنے نہ دیں۔ امریکیوں کی اسی حکمت عملی نے چین اور روس کو ایک دوسرے کے بہت قریب کردیا۔ یوں وسطی ایشیا میں ''نئی گریٹ گیم'' یا عظیم

پاکستان کی ترقی، روس سے تعلّقات کی بحالی سے جڑی ہے؟

کھیل کا آغاز ہوا۔ ۱۹ ویں صدی کی گریٹ گیم میں روس اور برطانیہ مرکزی کھلاڑی تھے۔ اب امریکا، روس اور چین نئی گریٹ گیم کے مرکزی کھلاڑی بن چکے ہیں۔

لیکن اس نئے عظیم کھیل میں پاکستان کی حیثیت بھی بڑی اہم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تزویراتی (Strategic) جغرافیہ نے اُسے اہمیت عطا کر ڈالی۔ وطنِ عزیز چار عظیم خطوں وسطی ایشیا، مشرقی ایشیا (چین)، مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے وسط میں واقع ہے۔ لہٰذا چاروں خطوں کو ملانے والے کئی راستے پاکستان سے گزرتے ہیں۔ اس کا تعاون حاصل کیے بغیر کوئی ان راستوں کو قابل استعمال نہیں بنا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان نے افغانستان میں نیٹو اور امریکی افواج کو رسد پہنچانے والا راستہ بند کیا، تو امریکا میں ہلچل مچ گئی کیونکہ دیگر راستوں سے افغانستان سامان پہنچانا بہت مہنگا پڑا۔

۲۰۰۹ء کے بعد جب روس و امریکا تعلقات خراب ہونا شروع ہوئے تو روسی حکومت نے فیصلہ کیا کہ پڑوسی مقامی قوتوں کو بھی ساتھ ملایا جائے۔ مدعا امریکی چودھراہٹ کا خاتمہ کرنا تھا۔ اسی پالیسی کے تحت پاکستان سے قربت کا آغاز ہوا۔ پاکستان نے بھی دوستی کی روسی پیشکش کا مثبت جواب دیا۔ وجہ امریکا کا منافقانہ رویہ ہے۔ مسلسل ڈرون حملوں اور ''Do More'' جیسے مطالبات نے پاکستانی حکومت کو زِچ کردیا ہے۔ مزید برآں وقت کا تقاضا یہ ہے کہ سات سمندر پار بیٹھی قوت کے بجائے مقامی طاقتوں، چین اور روس سے تعلقات زیادہ بڑھائے جائیں۔ اسی حکمت عملی کے پیشِ نظر پاکستان نے بھی روسیوں کو خوش آمدید کہا۔

قربت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چین اور روس مشرق وسطیٰ، یورپ اور افریقہ سے تجارت کرنے کے لیے پاکستانی بندرگاہ، گوادر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ چینی مال اگر شاہراہِ ریشم کے ذریعے براہ وزیرستان و بلوچستان گوادر پہنچ جائے، تو چینیوں کے لیے یہ چھوٹا اور کم خرچ راستہ بہت سودمند ہے۔ پھر یہ ضرورت نہیں رہے گی کہ چینی مال بحیرہ جنوبی چین اور بحیرہ ہند کے طویل راستے سے ہوتا مشرق وسطیٰ و یورپ پہنچے جبکہ وہ براستہ پاکستان براہِ راست بحیرہ عرب پہنچ سکتا ہے۔ اگر یہ معاملہ مدنظر رکھا جائے، تو سمجھ میں آتا ہے کہ وزیرستان و بلوچستان میں کن غیرملکی طاقتوں نے مقامی ایجنٹوں کے ذریعے شورش برپا کر رکھی ہے۔

اسی طرح روسی ایران یا بحیرۂ روم کے راستے اپنا سامان درآمد کرتے ہیں۔ ایران پر عالمی پابندیوں کے باعث اسی راستے مال بھجوانا روسیوں کے لیے مسئلہ بن گیا

تصویر کا دوسرا رُخ

پاکستانی حکومت کے اربابِ اختیار کا ایک گروہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کو امریکی حلقے ہی میں رہنا چاہیے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ معاشی بحران کے باوجود امریکا اب بھی اکلوتی سپر پاور ہے۔ لہٰذا اس کی دشمنی مول لینا عقل مندی کے خلاف امر ہوگا۔ مزید برآں آئی ایم ایف، عالمی بینک اور دیگر مالیاتی ادارے امریکا و اتحادیوں کے زیرِ اثر ہیں جو پاکستان کو امداد و قرضے فراہم کرتے ہیں۔ لہٰذا امریکی گروپ سے نکلنے پر پاکستان کو بڑے معاشی صدمے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ گروہ کو یقین ہے کہ امریکی دائرے سے نکلنے پر پاکستان کو سیاسی و معاشی نقصان ہوگا۔ گروہ کو یقین ہے کہ امریکی دائرے سے نکلنے پر پاکستان کو سیاسی و معاشی نقصان ہوگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے جبکہ بحیرۂ روم کا راستہ طویل پڑتا ہے۔ اگر روسی مال بذریعہ تاجکستان و پاکستان بحیرہ عرب پہنچ جائے، تو روسیوں کو بھی یہ راستہ مختصر اور کم خرچ پڑے گا۔ چنانچہ بحیرۂ عرب تک پہنچنے کی تمنا نے بھی روس کو پاکستان سے دوستی کی پینگیں بڑھانے پر مجبور کر دیا۔

قریب آنے کی ایک اور وجہ افغانستان میں امریکیوں کا مسلسل قیام ہے۔ روس اور پاکستان، دونوں کی خواہش ہے کہ ۲۰۱۴ء میں امریکا افغانستان سے رخصت ہو جائے۔ امریکا کی ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' میں شامل ہو کر پاکستان کو تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ملا یا پھر طبقہ اشرافیہ کی تجوریاں ہی امریکی ڈالروں سے بھری ہیں۔ روسیوں کا کہنا ہے ''افغانستان میں امریکی مشن پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا۔ چنانچہ اب امریکی کس لیے وہاں مسلسل قیام چاہتے ہیں؟''

پاکستان سے تعلقات بڑھانے کی خاطر روسی توانائی کے پاکستانی شعبے میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ شنید ہے کہ تیل و گیس کی تلاش کے لیے روسی کمپنیوں کو جلد لائسنس مل جائیں گے۔ غرض روس خاموشی مگر سرگرمی سے سعی کر رہا ہے کہ پاکستان کو اپنے قریب کیا جائے۔ یہ پالیسی پاکستان کے لیے بھی مفید ہے کہ یوں مستقبل میں اسے صرف امریکا پر انحصار نہیں کرنا پڑے گا۔ گو دونوں ممالک کے مابین غلط فہمیاں ابھی باقی ہیں، لیکن رفتہ رفتہ وہ افہام و تفہیم سے دُور ہو رہی ہیں۔

جب صدر پیوٹن کا دورہ ملتوی ہوا تو روسی وزیر خارجہ خاص طور پر پاکستان پہنچے تاکہ پاکستانیوں کو تسلی دے سکیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ پاکستان روسیوں کے لیے اہم ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ اُسے ناراض کرنے پوزیشن میں نہیں، لہٰذا روسی حکومت بے شک بھارت کی حمایت میں جتنے مرضی بیان دے، وہ اب مستقبل میں پاکستان سے قریبی تعلقات رکھے گی۔

مثال کے طور پر پاک روس باہمی تجارت ۲۰۰۳ء میں صرف ۲۰۰ ملین ڈالر (۲۰ کروڑ ڈالر) تھی۔ دو اب بڑھ کر ۸۰۰ ملین ڈالر (۸۰ کروڑ ڈالر) ہو چکی۔ ماہرین کو یقین ہے کہ اگلے ۴ برس میں باہمی تجارت ایک ارب ڈالر کا ہندسہ چھو لے گی۔ اگر کوئی غیور اور دلیر پاکستانی حکومت امریکی امداد ٹھکرا دے، تو پاکستان وہ امریکا کے چنگل سے آزاد ہو سکتا ہے۔

روس عالمی منظر نامے میں

۲۲ سال سے محوِ خواب روسی ریچھ اب آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا ہے۔ ایک لحاظ سے اقوامِ عالم کے لیے یہ اچھی خبر ہے۔ گزشتہ ۲۰ سال میں امریکی حکومت نے خصوصاً عالم اسلام میں جو طوفانِ بدتمیزی مچایا، اُسے دیکھتے ہوئے یک قطبی دنیا بھیانک خواب لگتی ہے۔ یہ تو جنگی اخراجات نے امریکا کی کمر توڑ ڈالی ورنہ وہاں کے ''عقاب'' پوری دنیا پر قبضہ جمانے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے۔

روسی حکومت اب ایشیا، یورپ اور افریقہ میں مزید اتحادیوں کو تلاش کر رہی ہے تاکہ امریکا اور نیٹو گٹھ جوڑ کا مقابلہ کر سکے۔ اسی ضمن میں ماہ اکتوبر میں عراقی وزیراعظم نوری المالکی کا دورہ روس تاریخی ثابت ہوا۔

صدر صدام حسین کے دور میں روس ہی عراق کا سب سے بڑا عسکری و معاشی ساتھی تھا۔ تاہم گزشتہ ۱۰ برس سے دونوں ممالک کے تعلقات سردمہری کا شکار تھے۔ تاہم عراقی وزیراعظم کے دورے سے چھائی ساری دھند چھٹ گئی۔ دونوں ممالک کے مابین ۴.۲ ارب ڈالر کی خطیر رقم کے عسکری و معاشی معاہدے ہوئے۔

عالمی سیاسیات کے ماہرین نے اس دورے کو نہایت اہم قرار دیا کیونکہ یہ دونوں ممالک کے لیے تاریخی ثابت

عراقی صدر نور المالکی کے دورۂ روس نے دُنیا کو کیا سگنل دیا؟

ہوا۔ دورۂ روس سے عراقی وزیراعظم نے ثابت کر دیا کہ وہ امریکی کٹھ پتلی نہیں اپنی خارجہ پالیسی خود تشکیل دیتے ہیں۔ جبکہ روسی حکومت کو یہ بڑا فائدہ ملا کہ اُسے مشرق وسطیٰ جیسے اہم علاقے میں اور نہایت نازک وقت پر ایک اور اتحادی مل گیا۔

روس کی سعی یہ ہے کہ وہ شام، ایران اور عراق کو اپنے دائرہ اثر میں لے آئے۔ یوں وہ امریکی و یورپی حکومتوں کے حمایت یافتہ عرب ممالک کا اثر و رسوخ کم کر سکتا ہے۔

دورے کے دوران نوری المالکی نے اعلان کیا کہ شام کا مسئلہ پُرامن طور پر حل کیا جائے۔ نیز غیر ملکی فوجی مداخلت ناقابل قبول ہو گی۔ روسی حکومت کا بھی یہی کہنا ہے، لہٰذا عراقی وزیراعظم کے اعلان نے انھیں خوش آمدید کر دیا۔

روس شام میں بشارالاسد کے خلاف جاری تحریک سے خاصا پریشان ہے۔ کیونکہ اگر باغی جنگ جیتنے میں کامیاب رہے، تو وہ مشرق وسطیٰ میں اپنے ایک اہم ساتھی سے محروم ہو جائے گا۔ روسیوں کو یہ بھی خطرہ ہے کہ شام کے بعد ایران اور پھر روس کی باری آئے گی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امریکی روس کے دو ڈھائی کروڑ مسلمانوں کو بھی روسی حکومت کے خلاف اکسا سکتے ہیں۔ مزید براں شام، روس سے سالانہ ڈیڑھ ارب ڈالر کا اسلحہ خریدتا ہے۔ بشارالاسد حکومت گرنے سے یہ منڈی بھی اس کے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

مسئلہ شام کے باعث ہی روس اور ترکی کے تعلقات خراب ہو گئے۔ روسی صدر پیوٹن نے ۱۴ اکتوبر کو ترکی کا دورہ کرنا تھا لیکن پاکستان کے مانند ناسازگار حالات کی وجہ سے وہ بھی منسوخ ہو گیا۔

آج ترکی عالم اسلام کی سب سے بڑی معاشی قوت ہے۔ ترک وزیراعظم طیب اردگان دلیرانہ فیصلوں کے ذریعے ثابت کر چکے کہ بیشتر مسلم حکمرانوں کی طرح وہ امریکی حکومت کا کھلونا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ۱۰ سال میں ترکی اور روس کے مابین زبردست معاشی تعاون دیکھنے میں آیا۔ آج ان کی باہمی تجارت ''۳۵ ارب ڈالر'' کا ہندسہ چھو چکی، جبکہ دونوں ممالک اگلے ۳ برس میں اسے ''۱۰۰ ارب ڈالر'' تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

شام میں بشارالاسد کے باغی جیت گئے تو روس ایک اہم اتحادی کھو دے گا!

روسی ترک تعلقات اس وقت بگڑے جب ترکوں نے ماسکو سے دمشق جانے والا شہری طیارہ استنبول میں اتار لیا۔ ترک حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس سے روسی جنگی ساز و سامان برآمد ہوا جو شام جا رہا تھا۔ یہ قانوناً جرم تھا کیونکہ شہری طیارے میں اسلحے کی نقل و حمل ممنوع ہے۔ تاہم روسی حکومت کا دعویٰ ہے کہ جہاز پر اسلحہ موجود نہیں تھا۔

روسی حکومت نے دعویٰ کیا کہ صدر پیوٹن شدید مصروفیات کے باعث (پاکستان کی طرح) ترکی نہیں جا سکے۔ لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ مسئلہ شام کے باعث ہی دورہ ملتوی ہوا۔ اگر روس اور ترکی نے سفارتی سطح پر حملوں کا سلسلہ جاری رکھا، تو خطرہ ہے کہ دونوں ممالک کے مابین تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔ یہ امر یقیناً دونوں ملکوں کو وارے نہیں کھائے گا کیونکہ اس سے امریکا اور نیٹو ہی کو فائدہ ہو گا۔

روس اور امریکا آمنے سامنے

۲۰۰۸ء میں جب باراک اوباما اُمید کا سفیر بن کر امریکی صدر بنے، تو انھوں نے جلد روس سے خوشگوار تعلقات قائم کر لیے لیکن یہ ہنی مون تادیر نہ چل سکا۔ دراصل روسیوں کو احساس ہو گیا کہ امریکی برطانیہ کی طرح انھیں بھی اپنا چمچہ بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ صدر پیوٹن نے فوراً راستہ بدل لیا اور امریکیوں کو بتایا کہ روس اب بھی بڑی عسکری و معاشی قوت ہے۔ تب سے آئے دن کسی نہ کسی مسئلے پر دونوں عالمی طاقتیں آپس میں چونچیں لڑاتی رہتی ہیں۔

حال ہی میں روسی حکومت نے امریکا کی یو ایس ایڈ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھارتی حکومت کو خطرہ ہے کہ افغان حکومت مستقبل میں چین اور پاکستان کی طرف جھک جائے گی

(USAID) ایجنسی کو اپنے دیس سے نکال دیا۔ اس نے الزام لگایا کہ ایجنسی سے وابستہ امریکی روسی حکومت کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ دونوں ممالک کے مابین ایک بڑا مسئلہ یورپ میں بین البراعظمی ایٹمی میزائلوں کی تنصیب ہے۔ مزید برآں روسی اس بات پر بھی چراغ پا ہیں کہ امریکیوں نے افغانستان پر قبضہ کر کے وسطی ایشیا میں ان کا اثرورسوخ بہت کم کر دیا ہے۔ چنانچہ روسی حکومت اب بے تاب ہے کہ وہ وسطی ایشیا سے امریکیوں کو نکال باہر کرے۔

چین اور روس کی قربت

ماضی میں چین اور روس میں خاصی دوری رہی لیکن اب معاشی وجوہ اور امریکا سے دشمنی انھیں قریب لے آئی حتیٰ کہ روس اور چین اب عالمی سطح پر امریکی اجارہ داری کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ واضح رہے، چین روس سے وسیع پیمانے پر تیل خریدتا ہے۔ (چین سب سے زیادہ تیل استعمال کرنے والا ملک ہے)۔ مزید برآں دونوں ممالک چاہتے ہیں کہ امریکی افغانستان سے رخصت ہو جائیں۔

چین نے افغانستان میں تانبے کی کانوں میں کروڑوں ڈالر کی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ دوسری طرف چین شمالی علاقہ جات کے ترقیاتی منصوبوں میں پاکستان کی مدد کر رہا ہے۔ چنانچہ علاقے میں چین کی سرگرمیاں روز افزوں ہیں۔

اس اُمر نے بھارتیوں کو تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ بھارتیوں نے بھی افغانستان میں سرمایہ کاری کی ہے تاہم وہ چینیوں سے کم ہے۔ لہٰذا بھارتی حکومت کو خطرہ ہے کہ افغان حکومت مستقبل میں چین اور پاکستان کی طرف جھک جائے گی۔ اسی لیے امریکیوں کا افغانستان میں رُکنا بھارتیوں کے مفاد میں ہے۔ یوں وہ پاکستان کو بھی دو اطراف سے گھیر سکتے ہیں۔ یاد رہے، وزیرستان اور بلوچستان کے فسادات میں بھارتیوں کے ملوث ہونے کی شہادتیں ملی ہیں۔

دلچسپ بات یہ کہ امریکیوں سے بڑھتے میل جول کے باعث بھارت کے روس سے بھی پہلے جیسے دوستانہ تعلقات نہیں رہے۔ ۲۰۱۱ء میں روسیوں نے بھارتیوں کے ساتھ طے شدہ بحری جنگی مشقیں اچانک ملتوی کر کے اظہار ناراضی کیا تھا۔ تاہم بھارتی اب بھی روسی اسلحہ خریدتے ہیں۔ لہٰذا روسی حکومت مجبور ہے کہ وہ بھارتیوں کے ناز اٹھائے۔ لیکن امریکا اور بھارت کی قربت کو چین اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ اسی لیے گزشتہ چند برس میں دونوں کے مابین خاصے مجادلے ہوئے ہیں مثلاً چین اروناچل پردیش اور مقبوضہ جموں و کشمیر میں کاغذ پر من پسند بھارتیوں کو چین کے ویزے دینے لگا۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ چین دونوں علاقوں کو متنازع سمجھتا ہے۔

اسی طرح گزشتہ سال بھارت نے جنوبی بحیرۂ چین میں تیل کی تلاش کے لیے ویت نام سے معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے سے چینی حکومت بہت جزبز ہوئی کیونکہ وہ جنوبی بحیرۂ چین کو اپنی عمل داری میں سمجھتی ہے۔ اسی لیے نومبر ۲۰۱۱ء میں چین نے سرحدی تنازعات طے کرنے والی طے شدہ میٹنگ اچانک منسوخ کر دی۔ چین کو اس امر پر بھی اعتراض ہے کہ بھارتی حکومت دلائی لاما کو ہر ممکن سہولیات فراہم کرتی ہے۔ اس وقت ہمارے پورے خطے میں ایک بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہمارے اعلیٰ و بااختیار دماغ دشمنوں کی چالیں سمجھ کر انھیں منہ توڑ جواب دیں نیز دوست طاقتوں سے ایسے فوائد حاصل کریں جو پاکستان کو ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن کر دیں۔ ■

کرپشن

کیا ان کو حالِ دل کا سنانے سے فائدہ
ہوگا تو ہوگا نوٹ دکھانے سے فائدہ

حسین احمد شیرازی

رشوت

کے موضوع کو ذرا پھیلا کر اگر ناجائز آمدنی کا تذکرہ کیا جائے تو اس معاشرہ میں بہت کم ایسے خوش نصیب ہوں گے جو اس لعنت سے محفوظ ہیں کیونکہ یہ سوسائٹی اصول پسند اور اچھے برے میں تمیز کرنے والے افراد کو بیوقوف، بزدل اور ناکارہ قرار دے کر مسترد کر دیتی ہے۔ پھر جو لوگ سدھر جاتے ہیں وہ صرف اپنے بلند کردار کو ہی سفر کا اختتام اور منزل کا حصول سمجھتے ہیں حالانکہ یہاں سے تو قومی ترقی کے سفر کا آغاز ہونا ہے اور اچھے لوگوں کی منظم کوششیں ہی اس ملک کو دُنیا میں اعلیٰ اور ارفع مقام دلوا سکتی ہیں۔

ہمارے خیال میں ہر وہ شخص جو اپنے استحقاق سے زائد تنخواہ، مزدوری یا منافع یا آمدنی کے ضمن میں معاوضہ یا سہولت حاصل کرتا ہے، حرام کھاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ارد گرد نظر دوڑایئے تو اس معاشرہ میں اصلاح کا پہلا پتھر مارنے والے درآمد ہی کرنے پڑیں گے۔ ہمارے ایک دوست تھوڑی سی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں ایماندار وہی ہے جس کے بارے میں آپ کو پوری معلومات نہیں ہیں یا وہ کبھی پکڑا نہیں گیا اور اس کی خطا کوشی پر قدرت کی خطا پوشی ہمیشہ حاوی رہی ہے۔

۲۰۰۳ء میں ہمارے ایک کالج فیلو کسی عدالتی بابو کو ایک ادارے کے بارے میں بتا رہے تھے کہ اب اس ادارے کے لوگوں نے بھی بریف کیس پکڑنے شروع کر دیے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے، وہ بھی ہمارے کزن ہیں۔ ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ واپڈا کے ایک چیئرمین نے اپنی زمین پر بجلی لگوانے کے لیے ماتحت عملے کی مٹھی گرم کی تھی۔ ہمارے صاحبزادے ایک فرانسیسی پٹرولیم کمپنی میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے ایک دن ہمیں بتایا کہ پٹرول پمپ لگانے کے لیے اتنی ناروا پابندیاں اور ناقابلِ عمل شرائط ہیں کہ کوئی شخص اپنی زندگی میں تو ان کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ اس لیے سیدھا سادا بابائے قوم کی تصویر والے سٹیٹ بینک کے کاغذات کا نظام، چلتا ہے کیونکہ سب سے طاقتور سہارا تو ان کاغذات کے ذریعے ہی ملتا ہے اور یہ تو تاریخی واقعہ ہے کہ مغربی پاکستان کے ایک بڑے جابر گورنر بھی اپنے حلقہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے پٹواری کو اجناس وغیرہ باقاعدگی سے پہنچواتے تھے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ایک عدالت نے وکلاء کا انتظامی برانچوں میں داخلہ منع کر دیا۔ کلرک صاحبان بھوکے مرنے لگے تو پھر ان کلرکوں نے وکلاء کے دفتروں میں جانا شروع کر دیا۔

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویران ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیابان ہوتا

☆☆

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اس پس منظر میں ایک دفتر کا سین دیکھیے!
سائل: "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"
اہلکار: "جو آپ سوچ رہے ہیں۔"
سائل: "تو یہ رہی رقم، میرا اجازت نامہ دے دیں۔"

ایک سیاسی بابو نے سرکاری افسر کو کسی ملازم کے ہوائی اڈے پر تبادلہ کا کہا تو افسر نے بتایا کہ وہ شخص بہت بڑا رشوت خور ہے۔ اس پر سیاسی بابو بولے "ہاں یہ بات تو مجھے پتا ہے، اسی لیے تو ہر الیکشن پر وہ مجھے پیجارو جیپ کا تحفہ دیتا ہے۔"

آزادی سے قبل ان بابوؤں کی تنخواہیں اس سطح تک ضرور تھیں کہ تنخواہ اور ریٹائرمنٹ پر ملنے والے مالی پیکیج سے، ریٹائرمنٹ کے بعد چھوٹا سا گھر، حج اور بچوں کی شادی کا بندوبست ہو جاتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاوضہ میں مہنگائی کے تناسب سے اضافہ نہیں ہوا چنانچہ ہمارے ایک دوست اثاثہ جات کا سالانہ گوشوارہ جمع کرانے کی ہدایت والے خط پر بُرا سا منہ بنا کر کہتے ہیں کہ ہمیں دیتے کیا ہیں جس کا حساب مانگتے ہیں۔ اس پر کسی نے بڑا برمحل فقرہ کسا کہ بھائی دراصل حکومت یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ یہ اگر زندہ ہے تو صرف تنخواہ میں تو ایسا ہو نہیں سکتا، یقیناً کوئی ہیرا پھیری کر رہا ہوگا۔ ضرورت پڑی تو اس کی فائل کھول لیں گے۔ اسی لیے ایک دعوت میں مہمان نے میزبان سے دال کا ڈونگا دینے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے تھے۔ "بھائی! ذرا اپنی حق حلال کی تنخواہ والی ڈش دینا۔"

ہمیں یقین ہے کہ بنیادی طور پر پاکستانی بڑے نیک نیت لوگ ہیں اور ایدھی فاؤنڈیشن کو ملنے والا اربوں روپے کا چندہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک دفتری بابو کی زندگی میں نوکری کے ابتدائی سیدھے راستے سے غلط پٹڑی پر چڑھنے کی روداد، حسب ذیل ہے۔

"سب لوگ نیک ہیں...... کچھ لوگ نیک ہیں...... چند لوگ چور ہیں...... زیادہ تر لوگ چور ہیں...... سب لوگ چور ہیں، بہتر ہے میں بھی اپنا حصہ لے ہی لوں۔"

اور پھر

جام ہے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

تھوڑی سی پی کے تلخیٔ مے کا گلہ رہا
جب منہ کو لگ گئی تو نہایت مزا دیا

۷۰ء کی دہائی کے آغاز کا واقعہ ہے کہ ہمارے ایک جاننے والے نے اپنی ملازمت کے ابتدائی ایام میں کسی سے ۲۰۰/ روپے نگرانی کے مقدمے میں مدد کرنے کے لیے وصول کیے۔ کام نہ ہوا تو اس نے ان کی سرعام پٹائی کر دی تو بہت دن تک ان کے اسسٹنٹ اور نائب قاصد ان کو بحفاظت گھر پہنچانے کی اضافی ذمے داری پر فائز کر دیے گئے۔

کرپشن کی بہت سی قسمیں ہیں۔ کچھ خوش قسمت لوگ راجاؤں کے شکار کے انداز میں ماہر نشانہ بازوں کے ساتھ ۱۰۰/ فٹ اونچے مچان پر بیٹھتے ہیں۔ سیکڑوں ہانکا لگانے والے، ڈھول پیٹ کر شکار ان کے سامنے لاتے ہیں۔ اس وقت باادب خدّام بندوق بھر کر ان کی خدمت میں پیش کرتے اور نشانہ لگانے کی پوزیشن میں کندھے سے لگاتے ہیں۔ یہ اطمینان اور سکون کے ساتھ بندوق چلا دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی بہت سے تجربہ کار شکاری بھی فائر کرتے ہیں۔ شکار گرنے پر ہر طرف سے ستائش اور تحسین کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور مشاق نشانہ باز راجہ صاحب کی چابک دستی اور اپنی نااہلی کے باقاعدہ مقابلے منعقد کرتے ہیں۔ اس نوعیت کی مثالیں پلاٹ یا زمین کی الاٹمنٹ، لائسنس، قومیائے گئے اداروں کی نجکاری، قرضوں کی معافی اور ٹیکسوں کی چوری کرنے اور کرانے میں ملتی ہیں۔ یہ شکار کئی صورتوں میں ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں کھیلا جاتا ہے جہاں دروازوں پر قاصد، پیادے، دربان اور چوبدار مقرر ہوتے ہیں۔ دوسری قسم موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والوں کی طرح ہے۔ یہ کھلے آسمان تلے بیٹھتے اور ۱۰۰/ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حملہ آور ہونے والے چیتے پر نشانہ لگاتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست کے صاحبزادے ہمارے پاس کسی اپیل میں حکم امتناعی کے لیے آئے۔ ہم اسی نوعیت کے ایک مقدمے میں محکمے کے حق میں فیصلہ دے چکے تھے، اس لیے انکار کر دیا...... ہمیں بہت دنوں بعد پتا چلا کہ ہمارے پیش رو نے ماتحت عملے کے ساتھ مل کر پچھلی تاریخوں میں اس صاحبزادے کے مقدمے کا فیصلہ کالعدم قرار دے کر کیس از سرِ نو شنوائی کے لیے نچلے فورم میں بھجوا دیا ہے۔ اس نوعیت کے بیشتر فیصلوں میں درخواست اور حکم ایک ہی ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا گیا ہوتا ہے۔

بعض نابکار سائل اس مد میں جعلی نوٹ دے جاتے ہیں کیونکہ اس جعل سازی کا مقدمہ کہیں بھی درج نہیں ہو سکتا۔ ایک دفتر میں سیکرٹ سروس فنڈ کی رقم چوری ہو گئی تو باس نے فوراً ایف آئی آر کٹوانے کا حکم دیا۔ پھر انھیں بتایا گیا کہ وہ ایک ماہ قبل مرکزی دفتر کو یہ فنڈ ختم ہونے اور اس مد میں مزید فنڈ مہیا کرنے کی درخواست بھجوا چکے ہیں تو قضیہ ختم کر دیا گیا۔

ناجائز آمدنی بجنسہٖ اب کوئی بُرائی نہیں رہی۔ ایک شخص کو کسی نے ڈرایا کہ ناجائز مال کھانے والا اندھا ہو جاتا ہے کیونکہ حرام آنکھوں پر اثر کرتا ہے اور نظر کمزور ہو جاتی ہے تو وہ بولا کوئی بات نہیں، جب تک عینک لگانے کی نوبت نہیں آتی، جاری رکھتے ہیں پھر چھوڑ دیں گے۔ اسی طرح ایک اور شخص نے اپنے ساتھی کو سمجھایا کہ رشوت سے صرف بینک بیلنس ہی نہیں، پل صراط پر اٹھانے والا بوجھ بھی بڑھتا ہے اور روزِ قیامت راشی کو مرتشی اپنے کندھے پر اٹھانا پڑے گا تو ساتھی نے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں ہم بھی بہت سے لوگوں کے کندھوں پر ہوں گے۔ ایسے کسی شخص نے جب ایمانداری کی نصیحت سن کر یہ کہا کہ ہم تو اس غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہیں تو سمجھانے والا تنگ آ کر بولا "جی نہیں! آپ اس غلاظت میں غرق ہو چکے ہیں۔" کچھ لوگ اسے مرض سمجھتے بھی ہیں تو ایسا جو معمولی اور قابلِ علاج ہے۔ ایک افسر نے اپنے دفتر میں رشوت کے بارے میں حلف اٹھوایا۔ اس کے بعد اس دفتر میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ناجائز آمدنی کا ایک مقررہ حصہ کفارے کے طور پر کاٹ کر ناداروں میں تقسیم کیا جانے لگا۔

کرپشن کے حمام میں داخلے کے بعد رشوت ستانی پر اعتراض کا اصل منشا اپنا مناسب حصہ نہ ملنے کا ہوتا ہے۔ یعنی یا تو کرپشن ختم کرو یا میرا حصہ مجھے دو۔ ان حالات میں جیسے ہی ہڈی ڈال دی جاتی ہے، بھونکنے کی آواز سنائی دینی بھی بند ہوجاتی ہے

کیا ان کو حال دل کا سنانے سے فائدہ
ہوگا تو ہوگا نوٹ دکھانے سے فائدہ

بعض صورتوں میں ایمانداری بذات خود کوئی حقیقت نہیں بلکہ پکڑے جانے کے خوف کا دوسرا نام ہے۔ ایک صاحب کسی اہلکار کے پاس کسی غلط کام کی تجویز لے کر گئے تو مکالمہ سنیے:

اہلکار: ''ہم ایسا کام نہیں کرتے، کمزور آدمی ہیں۔''
سائل: ''آپ مسلمان ہیں؟''
اہلکار: ''الحمدللہ۔''
سائل: ''قربانی کے بارے میں پتا ہوگا؟''
اہلکار: ''بے شک''
سائل: ''قربانی کے جانوروں جیسے بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ میں ایک وصف مشترک ہے۔ آپ کو پتا ہے؟''
اہلکار: ''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔''
سائل: ''یہ سب کمزور جانور ہیں، کسی دوسرے جانور کو زک نہیں پہنچاتے۔ کبھی شیر، چیتے، بھیڑیے کی بھی قربانی کا سنا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ طاقتور ہیں، دوسرے جانوروں کو کھاتے ہیں۔ اب آپ دوبارہ غور فرمائیں کہ آپ کو چیتا بننا چاہیے یا بکری؟''
اہلکار: ''بھائی ہم کمزور ہی بھلے۔''

ویسے ہم آپ کو اپنا تجربہ بتا دیں کہ ہم نے اکثر و بیشتر بابونگر میں دی جانے والی قربانیوں کا ہدف بے چارے دنبوں، بکروں اور بھیڑوں کو ہی بنتے دیکھا ہے۔ بھیڑیے اور چیتے عام طور پر محفوظ ہی رہتے ہیں کہ انھیں اس فن کے تمام اسرار و رموز سے واقفیت ہے جن میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے۔

لے کے رشوت پھنس گیا ہے
دے کے رشوت چھوٹ جا

بعض افراد اپنا ضمیر اور اپنی روح کسی قیمت پر بھی فروخت نہ کرنے کے عہد کی پاسداری کرتے ہیں تاہم کبھی کبھار انھیں کرائے پر چڑھانے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک رشوت بڑی خراب چیز ہے اور خاص طور پر تھوڑی رشوت...... ہم نے ایک دفتر کے برآمدے سے گزرتے ہوئے سنا تھا ''میرے مذہب میں راشی جہنمی ہے، سرکاری قواعد وضوابط کے مطابق بھی تمھارا کام غلط ہے اور اگرچہ یہ اتنی اہم وجہ نہیں لیکن پھر بھی تم خود غور کرو کہ تم دے کیا رہے ہو؟''

پھر ضمیر نامی جن کو بوتل میں بند کرنا بھی کوئی مشکل کام نہیں۔ ایک اہلکار سائل کو کہہ رہے تھے کہ اگر آپ مجھے کوئی ''غیر سرکاری تحفہ'' دینے لگے ہیں تو میں پہلے انکار کروں گا لیکن آپ اصرار کیجیے گا...... انھوں نے وجہ پوچھی تو بولے کہ اس طرح میرا ضمیر مطمئن ہوجائے گا کہ میں آپ کی ضد پر یہ غلط کام کرنے لگا ہوں۔

بعض ضمیر بنیادی طور پر کمزور تخلیق کیے گئے ہیں، ایسے ہی ایک اہلکار نے ملاقاتی کو کہا کہ خدا کا خوف کرو، میں ابھی باجماعت نماز پڑھ کر آیا ہوں، مجھے کرنسی نوٹ مت دکھاؤ، میرا ایمان خراب ہوتا ہے۔ میں قائداعظم کی بہت عزت کرتا ہوں۔ حکومت کو چاہیے غلط کام کے لیے الگ کرنسی چھاپے جس پر ان کی تصویر نہ ہو۔''

اسی نوع کے ایک بابو کرکٹ میچ میں بار بار کیچ چھوڑ رہے تھے۔ پھر ایک مرتبہ جب گیند اُن کی طرف اچھلا تو کسی سیانے نے نعرہ لگایا...... اوئے گیند نوٹ سمجھ کر پکڑنا۔ میچ پر شرط بھی لگی ہوئی ہے''...... اور کیچ پکڑا گیا! یہ صاحب گھر کی چھت پر ٹی وی ایریل کا رخ ٹھیک کرتے کرتے اپنا توازن کھو بیٹھے اور نیچے گر گئے۔ شدید چوٹیں آئیں لیکن پٹیوں میں لدے پھندے دفتر پہنچ گئے...... کسی نے مشورہ دیا کہ بھائی...... ! گھر آرام کر لیتے تو بولے ''یار ادھر کونسی بوریاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ خواہ مخواہ کی دیہاڑی ضائع ہوجاتی۔'' ایک مرتبہ ان صاحب نے اپنے ایک ساتھی سے یہ سوال کیا کہ کیا واقعی ہمارے محکمے میں بہت رشوت ستانی ہے تو اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا جوتا اتار کر انھیں دیا ''اسے میرے سر پر ماریں کیونکہ آپ کے سوال کا میرے پاس یہی جواب ہے۔''

قدرت بعض لوگوں کے چہروں پر غلط ٹھپے بھی لگا دیتی ہے۔ پرانی بات ہے ایک پاسپورٹ آفس کے باس دفتر آئے تو دیکھا کہ ایک خاتون اپنے ۳ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ ہجوم کے اژدھام میں دھکے کھا رہی ہے۔ انھوں نے اپنے ایک ماتحت کو کہا کہ اس خاتون کے پاسپورٹ کا کام پہلے کردو...... وہ ابھی ادھر ہی پھر رہے تھے کہ اس خاتون نے ماتحت کو اشارہ کیا کہ اپنے باس کو بلاؤ...... یہ چلے گئے تو اس خاتون نے ۲۰۰ روپے ان کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ اب ان کو پریشانی تھی کہ وہ اپنے آپ کو بڑی پُروقار شخصیت کا مالک سمجھتے تھے لیکن یہ کیا ہوا...... ہم نے ان کو ہٹلر کا لطیفہ سنایا کہ ٹکٹ چیکر نے ایک فرسٹ کلاس کے مسافر سے ٹکٹ مانگا تو وہ بولا ''میں ہٹلر ہوں، میرا چہرہ میرا ٹکٹ ہے۔'' اس پر ٹکٹ چیکر نے تبصرہ کیا ''پھر بھی تھرڈ کلاس ٹکٹ کے ساتھ فرسٹ کلاس میں سفر کرنا جرم ہے۔''

غیر سرکاری تحفے کے علاوہ یہ ادائیگیاں رمضان میں کبھی افطاری اور عیدی کے نام پر رضا کارانہ کی جاتی ہیں تو کبھی انھیں زبردستی وصول کیا جاتا ہے۔ ہمارے ایک پرانے ماتحت اہلکار کو کسی زائر نے مقاماتِ مقدسہ کے تحائف کے نام پر جو مصلیٰ، ٹوپی، وغیرہ کا شاپنگ بیگ دیا اس میں سونے کی ڈلیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دفتر کے باہر ۲ بورڈوں پر ''اللہ اکبر'' اور ''بسم اللہ'' لکھے ہوئے تھے۔ کسی نے اس کی تشریح اس طرح کی کہ یہاں ''مرغے'' ذبح کیے جاتے ہیں اس لیے ضروری الفاظ پہلے ہی جلی حروف میں لکھ دیے گئے ہیں تاکہ ذبیحہ غلط نہ ہو جائے۔ کرپشن کا ایک آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ اپنی غرض سے منسلک سیاسی یا دفتری بابو سے بہت سی رقم جان بوجھ کر جوئے میں ہار جائیں۔ رشوت ستانی مختلف بابوؤں کے عزیز واقارب کے ذریعے بھی کی جاتی ہے۔

ہمارے نزدیک ماتحتوں کی ناجائز آمدنی سے دی جانے والی دعوتوں میں کھانے کے بعد ''الحمدللہ'' کہنا گناہ ہے۔ بہت سال پہلے سکردو میں چیری کا پھل توڑنے کی پابندی لگا دی گئی۔ پھر یہ پھل ۱۰ روپے من کے حساب سے ۴۰۰ روپے میں خریدا گیا لیکن اسے جس ہیلی کاپٹر میں لایا گیا، وہ مفت تھا۔

مرکزی بورڈ برائے محصولات کے نئے اصلاحاتی سکیم کے دفاتر کے لیے فنڈز کی فراہمی کے لیے فائل ۱۲۳ میزوں پر گھومی تھی۔ ایسی ہی ایک میز پر ہم بھی فائل کو دھکا سٹارٹ کرنے کے لیے موجود تھے تو دفتری بابو بولے کہ یہ کام بالکل نہیں ہوسکتا۔ آپ بائی پاس کرنا

WWW.PAKSOCIETY.COM

چاہتے ہیں، ہمارے قواعد میں بائی پاس نام کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ ہم نے سوچا کہ اب تو تمام شہروں کے بائی پاس بن گئے ہیں بلکہ دل کا بائی پاس تو اب پرانا ہو کر آثارِ قدیمہ کی سرحدوں کو چھونے لگا ہے۔ اس دوران ہم نے دیکھا کہ ڈرافٹ دیکھتے ہوئے انھیں پَین نہیں مل رہا تو ہم نے اپنا قلم پیش کر دیا۔ اس پر وہ بولے ''کیا آپ تحفے کے طور پر دے رہے ہیں؟'' ہم نے دل میں کہا کہ میں آپ کے نکاح کی رسم میں شرکت کے لیے تو آیا نہیں کہ تحفہ دوں لیکن پھر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے دل میں زکوٰۃ اور صدقہ کی نیت کر کے انھیں قلم بطور ''ہبہ بلاعوض'' رکھ لینے کی استدعا کی تو مطلوبہ اجازت نامہ ۱۰/ منٹ میں مل گیا۔ واقعی قلم میں تلوار سے زیادہ طاقت ہے۔

رشوت کی ادائیگی پر گھٹ پٹ بھی ہو جاتی ہے۔ ایک بابو گلہ کر رہے تھے کہ دیکھیں میں نے اس سیاسی شخصیت کا اتنا بڑا کام کیا لیکن مجھے کچھ نہیں ملا۔ تو سیاسی بابو نے گلہ پہنچانے والے کو ایک شادی شدہ آدمی کا کسی گلوکارہ کے ساتھ دوسرے نِکاح کا قصہ سنایا۔ اُس شخص نے شادی کے چند سال بعد تمام جائیداد پہلی بیوی کے نام منتقل کر دی تو گلوکارہ نے شکوہ کیا کہ میں بھی تمہاری بیوی ہوں، مجھے بھی کچھ حصہ ملنا چاہیے۔ شوہر نے جواب دیا کہ پہلی بیوی سے اس کی شادی ۳۲ روپے حق مہر کے عوض ہوئی تھی جو اس نے ابھی تک وصول نہیں کیے جبکہ تم تو پہلے دن سے اپنی ہر کارکردگی کا پورا معاوضہ پیشگی وصول کرتی رہی ہو......

بابو جی آپ نے بھی مختلف مرحلوں پر اپنا حقِ خدمت ساتھ ساتھ حاصل کیا ہوا ہے۔

کرپشن کے ناسور سے تمام فریق فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسی لیے اس کی نشوونما میں تیزی آرہی ہے۔ ہمارے ہاں اخلاقی قدریں ختم ہوتی جارہی ہیں اور اس خلا کو مادی اشیاء کی اہمیت پُر کر رہی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ تجارتی بابو کو اگر ایک کروڑ روپے کا فائدہ ہو تو وہ اس میں سے ۲،۳/ لاکھ روپے کرپشن کی مد میں خرچ کرتا ہے۔ آج کاروباری دنیا کے بیشتر بڑے بڑے نام اسی ناسور کی سیڑھیوں پر چڑھ کر بلند مقامات پر فائز ہیں۔ رہے ہمارے عوام تو ان کا حال اس خاتون جیسا ہے جس کے شوہر نے اپنے سُسر کو قتل کر دیا ہو اور وہ خاتون اکلوتی اولاد ہونے کے ناطے مدّعی بھی ہو اور مدّعا علیہ بھی

خلقِ نادار کی بھی سن زاری
نام ہے تیرا خالقِ باری
پی گئے خون تیرے بندوں کا
جن کو بخشی ہے تو نے سرداری

ریاست کا منصب عوام کی ماں کی طرح ہوتا ہے اور یہ کیسی ماں ہے جو ایک بیٹے کو کھانے کے لیے کیک دیتی ہے لیکن باقی ۵/ بچوں کے کھانا مانگنے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو چولھے پر چڑھی ہوئی اس دیگچی میں تیار ہونے والے پکوان کا انتظار کرنے کو کہتی ہے جس میں پتھر پانی میں اُبل رہے ہیں۔ یہ بات معاشرے کے تمام طبقات کے اپنے مفاد میں ہے کہ یہ اُبلتے ہوئے پتھر کیک کھانے والوں پر برسنا شروع نہ کر دیں۔ تاریخ کا بے رحم سبق یہ ہے کہ اگر آپ مظلوم کے پاس نہیں جائیں گے تو ایک دن مظلوم آپ کے پاس آئیں گے اور یہ کوئی دل آویز منظر نہیں ہوگا...... کہ یہ روزِ قیامت ہے......

کئی رازوں کی امین

وہ حویلی

خوشیوں اور غموں میں ساتھ دینے والی حویلی کی خوشگوار یادیں

سعد سعید

حویلی کیا تھی؟ تیس پینتیس مرلے زمین کا ایک ٹکڑا جسے بچپن کی آنکھوں نے میلوں کی وسعت عطا کر رکھی تھی۔ چند گنے چُنے درخت جو میرے لیے گھنے جنگلوں سے بھی زیادہ پُراسرار تھے۔ ایک ایسی جگہ جو ہر موسم میں ایک نیا روپ دھارتی اور دن کے مختلف حصوں میں طرح طرح کے رنگ بدلتی تھی۔ میرا بچپن اور حویلی یوں مُدغم ہو چکے ہیں کہ مجھے اپنے بچپن کی سرحد کے اس پار سے صرف حویلی کے درختوں کے سرسرانے کی آواز آتی ہے۔

حویلی کا دروازہ بوسیدہ لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ دروازہ کے دائیں جانب والی دیوار کے ساتھ تین کچے کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کمرا ٹوٹے ہوئے لکڑی کے دروازوں، کرسیوں اور میزوں سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کمرے میں جلانے والی لکڑیاں رکھی جاتی تھیں اور تیسرا کمرا ورزش کے سامان کے لیے مختص تھا۔ ان تینوں کمروں کے سامنے نیم کے کئی درخت کھڑے تھے جن کی شاخیں ان کمروں کے اوپر سایہ کیے رکھتی تھیں۔ دروازہ کے سامنے والی دیوار کے ساتھ امرود کے کئی درخت اور مغربی دیوار کے ساتھ کیکر کے دو درخت تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ آسیب زدہ ہیں۔ اس کے علاوہ حویلی کے احاطے میں شہتوت اور کچنار کے بھی کئی درخت تھے۔

حویلی پورے خاندان کے لیے مرکزی نقطہ تھی۔ کون سا کام تھا جو ہم نے یہاں ہوتے نہ دیکھا۔ محلے میں آنے والی ہر بارات یہاں چارپائیوں پر بٹھائی جاتی۔ نجانے کتنے جنازے یہاں سے اٹھائے گئے۔ سردیوں کی دوپہر میں ہمارے بڑے یہاں دھوپ سینکتے، گرمیوں کی لمبی راتیں یہاں گزاری جاتیں۔ قربانی کے جانور یہاں باندھے جاتے۔ سیاسی مجلسیں یہاں برپا ہوتیں۔ بڑوں کی لڑائیاں اور صلح بھی یہیں ہوتیں۔ باقی رہے ہم بچے تو صاحب ہمارے تو سارے ہی کھیل حویلی سے وابستہ تھے۔

سردیوں میں جب درختوں کی شاخوں کو چھانٹا جاتا تو ہماری تو عید ہو جاتی۔ جب تک وہ شاخیں وہاں سے اٹھوا نہ دی جاتیں ہم ان سے طرح طرح کے کھیل کھیلتے۔ حویلی کا تمام احاطہ شاخوں سے بھرا ہوتا اور حویلی ایک بالکل نئی جگہ بن جاتی۔ شام کے جھٹ پٹے میں ہم ان گری ہوئی ٹہنیوں میں چھپن چھپائی کھیلتے۔ مضبوط شاخوں کی لاٹھیاں بنا کر فرضی جنگ لڑتے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارا تو سارا سارا دن ہی حویلی میں گزرتا۔ طرح طرح کے کھیل کھیلے جاتے۔ کبھی کرکٹ، کبھی پکڑن پکڑائی، کبھی مینڈک دوڑ اور کبھی درختوں پر چڑھائی۔ لیکن لطف تو تب آتا جب نیم کی نمولیوں سے، جنھیں ہم ''کٹونی'' کہتے تھے، جنگ ہوتی۔ ہوتا یوں کہ دو گروہ بنا دیے جاتے اور ایک مختصر سے عرصہ میں سب لوگ زمین پر گری ہوئی ''کٹونیاں'' اٹھا لیتے۔ اس کے بعد اپنے اپنے علاقہ میں جا کر غلیلوں سے نشانے لیے جاتے۔ مگر یہ کافی خطرناک کھیل تھا۔ آنکھ میں لگنے کا اندیشہ ہمیشہ رہتا تھا۔ جب تمام لوگ تھک جاتے تو کوئی ایک نلکا چلاتا اور باقی سب پانی پیتے یا ایک دوسرے پر چھینٹے اڑاتے۔ تو کبھی نیم کی چھاؤں میں بیٹھ کر کہانیاں سنائی جاتیں۔ چونکہ میں سب سے زیادہ پڑھتا تھا اس لیے مجھ سے فرمائش کی جاتی مگر ہمیشہ یوں ہوتا کہ ایک آدھ کہانی کے بعد مجھے میرا تخیل اکسانے لگتا اور میں کسی اپنی ہی کہانی کی جانب نکل جاتا۔ اختتام ہمیشہ کسی ڈراؤنی کہانی پر ہی ہوتا۔ کیکر پر بسنے والے جنوں کی کسی سنی سنائی واردات کو میں بڑھا چڑھا کر پیش کرتا جس سے پورے ہجوم پر دھیرے دھیرے سکوت طاری ہونے لگتا۔ جب میں کبھی کہانی سنا کر خاموش ہو جاتا تو تھوڑی دیر تک ہم سب سہمی سہمی نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکتے رہتے۔ خاموشی اور خوف پورے مجمع پر ایک سایہ سا بنا دیتے تو اچانک کوئی ایک بچہ کیکر کی طرف دیکھتا، چیخ مارتا اور باہر کی طرف دوڑتا۔ بس پھر اس کے پیچھے پیچھے پورا ہجوم چیخیں مارتا دوڑتا اور گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ چیخیں نہ رکنے والے قہقہوں میں تبدیل ہو چکی ہوتیں۔

حویلی ہمارے لیے روپوش ہونے کی بھی بہترین جگہ تھی۔ ذرا اندیشہ ہوتا کہ گھر سے ٹھکائی ہونے والی ہے تو حویلی میں چھپ جاتے۔

گرمیوں میں جب دھوپ سے زمین خشک اور ہمارے رنگ کالے پڑ جاتے تو نگاہیں بار بار آسمان کے کناروں پر بادلوں کو ڈھونڈنے لگتیں۔ پھر یوں ہوتا کہ کسی گرم دوپہر میں نیم کے سائے میں بیٹھے بیٹھے اچانک محسوس ہوتا کہ آسمان کا ایک کنارہ میلا سا ہو رہا ہے اور دھیرے دھیرے ہماری جانب بڑھ رہا ہے۔ دل دھڑکنے لگتے، ارمان انگڑائیاں لینے لگتے اور ہاتھ دعا کے لیے اٹھنے لگتے کہ یااللہ! بارش برسا دے۔ پھر آہستہ آہستہ ہوا ٹھنڈی ہونے لگتی۔ اس کے بعد ہوا تیز تیز جھونکے نیم کے درختوں کو ہلانے لگتے۔ پھر اچانک آندھی پورے زور سے آتی۔ حویلی میں مٹی اڑنے لگتی۔ کواڑوں اور کھڑکیوں کے بند

ے کا شور برپا ہو جاتا۔ لڑکیاں چھتوں سے کپڑے اکٹھے نے لگتیں۔ چارپائیاں اندر کی جانے لگتیں اور درخت نے لگتے۔ حویلی میں بچوں کی بارات ہی تو آجاتی۔ ٹھور گھٹا سے اندھیرا چھا جاتا۔ یکا یک بجلی کڑکتی اور ی کی زمین پر پانی کے چھوٹے چھوٹے سے دھبے تے۔ فضا مٹی کی سوندھی خوشبو سے بھر جاتی۔ ارش کے قطرے موٹے ہونے لگتے اور ساری حویلی جاتی۔ کچے کمروں کے پرنالوں سے پانی گرنے حویلی کی خشک زمین پر جب بوندیں گرتیں تو ہمارے ے خوشی سے یوں کھل اٹھتے جیسے ہمارا کوئی عزیز کسی ماری کے بعد صحت یاب ہو رہا ہو۔ بارش میں خوب ں ہوتے تھے۔ کوئی کیچڑ میں لت پت ہو رہا ہے تو پرنالے سے گرنے والے پانی کے نیچے کھڑا ہے۔ کرکٹ ہو رہی ہے اور کہیں پکڑن پکڑائی۔

گرمیوں میں جب رات کے وقت بجلی بند ہو جاتی تو ے بڑے حویلی میں چارپائیاں بچھا لیتے۔ ہم بچے بھی میں پہنچ جاتے اور کسی کے ساتھ چارپائی پر لیٹ ے۔ سفید چادروں پر لیٹتے ہی نیند کوسوں دور بھاگ اور جب کبھی چودھویں کا چاند کچے کمروں کی منڈیر پیچھے سے نمودار ہوتا تو یوں لگتا جیسے اس جادوئی منظر ین نظارہ اور کہیں نہ ہوگا۔ چاند خراماں خراماں نیم پیچھے آجاتا تو احساس ہوتا کہ کافی رات بیت چکی پھر جب علی الصبح آنکھ کھلتی تو زرد سا چاند کیکر کی میں اٹکا نظر آتا۔

جیسے جیسے ہم بچپن سے لڑکپن کی حدود میں داخل گے ویسے ویسے ہمارے لیے حویلی کے معنی بدلنے اب یہ گھر والوں سے چھپ کر باتیں کرنے کا مرکز

ایک دفعہ ہمیں محسوس ہوا کہ امرود کے درختوں پر والی گلہریاں امرود کھا جاتی ہیں۔ بس پھر کیا تھا اس روکنے کے لیے ایک فورس تشکیل دے دی گئی۔ جو ہر ے پکڑ کر امرود کے درخت کے اردگرد پہرہ دیا کرتی اور اگر کہیں گلہری نظر آجاتی تو امرود کی شاخوں پر ڈنڈے مار مار کر اتنے نوزائیدہ امرود توڑ ڈالتی جتنے وہ گلہریاں شاید سال بھر میں نہ توڑ سکتیں۔

حویلی کے ساتھ ہمارا بڑا عجیب سا رشتہ تھا۔ یہ ہمارے کئی رازوں کی امین تھی۔ اس نے ہمارے ساتھ نجانے کتنی خوشیاں اور غم دیکھے تھے۔ یہ ہمارے دادا اور ان کے دو بھائیوں کی مشترکہ جائیداد تھی۔ جب کبھی ان میں کسی بات پر جھگڑا ہو جاتا تو حویلی میں اینٹوں کی ایک دیوار کھڑی کر دی جاتی اور ہمیں یوں محسوس ہوتا جیسے ہمیں قید کر دیا گیا ہو یا ہمیں گھر سے بے دخل کر دیا گیا ہو۔ پھر جب صلح ہو جاتی تو ایک دن وہ دیوار گرا دی جاتی۔ جیسے جیسے اینٹیں گرتی جاتیں، ہمیں محسوس ہوتا جیسے دنیا وسیع ہوتی جا رہی ہے اور جب دیوار مکمل گر جاتی تو ہمیں یوں لگتا جیسے سرحدیں مٹ گئی ہوں یا جیسے کھوئے ہوئے بچے ماں کے پاس واپس آگئے ہوں۔

مگر جیسے جیسے میرے دادا کے بھائیوں کا انتقال ہوا ان کے بیٹوں نے حویلی کا بٹوارہ شروع کر دیا۔ پہلے تمام کچے کمرے گرا کر ہمارے ایک چچا کا مکان تعمیر ہوا۔ پھر جب میرے دادا فوت ہوئے تو ان کے حصہ کی جگہ پر بھی مکانوں کی تعمیر کا آغاز ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے تمام درخت گرا دیے گئے۔ ہر گرتے درخت کے ساتھ میرا اور میرے بچپن کا فاصلہ بڑھتا گیا۔ کرتے کرتے ہماری حویلی کی جگہ اینٹوں کے تین پکے مکان کھڑے ہو گئے اور ان کی تاریک بنیادوں میں کہیں ہمارا بچپن دفن ہو گیا۔

پر مجھے آج بھی نجانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے لاشعور میں حویلی ابھی تک موجود ہے۔ وہاں آج بھی میرا بچپن کھیلتا ہے۔ وہاں آج بھی دوپہر کی خاموشی میں نیم کے درخت سرسراتے ہیں۔ آج بھی وہاں چاند کیکر کی پھیلی ہوئی شاخوں سے جھانکتا ہے۔ وہاں دنیا آج بھی سرحدوں سے پاک ہے۔

■

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیارِ غیر میں اپنا مقام پیدا کر...!

یہاں کی تو دُنیا ہی نرالی ہے
اپنے دیس سے بیاہ کر پردیس
جانے والی لڑکی کے دلچسپ مشاہدے

لیں جی، ہم بابل کے دیس سے پیا کے دیس، یعنی پاکستان سے براستہ دبئی مانچسٹر (برطانیہ) پہنچ ہی گئے۔
سارے سفر میں ہمارا ننھا سا دل مستقبل کے انجانے خدشوں کے ساتھ ساتھ ہوائی سفر کے خوف سے لرزتا رہا۔ ۹ رگھنٹے کا طویل سفر طے کر کے جہاز کے منہ سے ہم اور ہمارے منہ سے یہ کپکپاتا ہوا جملہ نکلا،

'اف، یہاں تو بہت سردی ہے!' سردی لگتی بھی کیوں ناں، ہم اکتوبر کی پاکستانی گرمی کو چھوڑ کر برطانوی ٹھنڈ میں آگئے تھے اور سونے پر سہاگہ کہ میاں جی کو بھی خیال نہ رہا کہ منزل کے آغاز پر نہ سہی، منزل پر پہنچ کر تو سردی لگے گی تو کوئی سوئیٹر ہی رکھ لیتے۔ وہ تو صد شکر کہ گھر والے ہوائی اڈے پر ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھے اور گھر سدھارے۔ ایک دو دن کے بعد سفر کی تھکن اتری تو اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا اور آج تک جائزہ ہی لیتے آرہے ہیں۔ یہاں کی دنیا بھی نرالی اور لوگ بھی۔ لو بھلا بتاؤ، ہر سڑک کے دونوں اطراف ایک جیسی گلیاں اور ہر گلی میں ایک جیسے گھر۔ بندہ گھبرا کسی اور کے گھر نہ گھس جائے تو اور کیا کرے؟ اور اس مزید یہ کہ گھر پر کوئی نیم پلیٹ بھی نہیں، بس گھر کا نمبر یا پھر میاں جی کا (میاں جی کے فون کا، کچھ اور سمجھیں!)، تاکہ گم ہونے کی صورت میں روہانسی آواز انھیں فون کیا جاسکے۔

'جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں'، یہ محاورہ انسانوں لاگو ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، پاکستان اور برطانیہ کے موسموں ضرور لاگو ہوتا ہے۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیں، پاکستان میں بادل آتے، گرج گرج کے دلوں کو سہاتے اور ایک بوند بھی گرائے بغیر کسی بے وفا معشوقہ کی طرح سر چلے جاتے ہیں اور برطانیہ کا موسم......! جتنی خاموشی بارش برستی ہے، شاید ہی کہیں اور برستی ہو۔ آپ کے اندر ہوں تو اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ باہر

ہے بارش کی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں (برطانیہ) کا موسم اور محبوبہ دونوں ہی بے وفا ہیں۔ محبوبہ کا تو پتا نہیں موسم جی بھر کے بے وفا ہے۔ آپ صبح اٹھ کر کھڑکی سے جھانکتے ہیں اور چمکتی دھوپ اور صاف آسمان دیکھ کر پکنک کے لیے پارک جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ نکلتے وقت آپ کا چھتری کی طرف بڑھتا ہاتھ پلٹ کر آجاتا ہے کہ آج تو دھوپ نکلی ہے، چھتری کی کیا ضرورت! آپ یقین کریں، یہ سنگین غلطی آپ کو بہت مہنگی پڑے گی۔ غالب امکان ہے کہ کچھ ہی دیر بعد جب آپ پارک میں چادر بچھا کر کھانے پینے کی چیزیں سجا رہے ہوں تو مینہ برسنا شروع ہو جائے گا، بغیر کسی پیشگی اطلاع۔ یہ دھوکا موسم اس وقت بھی دیتا ہے جب آپ سردی سے بچنے کے لیے گرم کپڑوں سے لیس ہو کر گھر سے نکلتے اور کچھ دیر بعد گرمی سے بوکھلائے بوکھلائے واپس آتے ہیں۔ یہاں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ گھر سے نکلتے وقت آپ کے پاس چھتری ضرور ہو، ورنہ نقصان کے ذمے دار آپ خود ہوں گے۔

یہاں آپ کسی کو گھور نہیں سکتے۔ اس قانون کی وجہ سے ہمارے میاں تنگ ہیں اور ہم خوش۔ کوئی آپ کو کتنا ہی عجیب یا مضحکہ خیز کیوں نہ لگ رہا ہو، کوئی کتنی ہی بڑی آفت کی پرکالہ جا رہی ہو، آپ نے اسے گھورا نہیں اور اس نے پولیس کو شکایت لگائی نہیں اور پولیس بھی فوراً کسی جن کی طرح سائرن بجاتی ہوئی کسی کونے سے نمودار ہو کر آپ کو جرمانہ دے گی جو آپ کو ہر حال میں ادا کرنا ہی کرنا ہے چاہے وہ جرمانہ ۵۰ر پاؤنڈ ہی کیوں نہ ہو، وہ آپ کو جرمانے کے نوٹس پر نوٹس بھیجیں گے یہاں تک کہ آپ جرمانہ ادا کر کے اپنی جان چھڑوا نہیں لیتے۔ قانون سب کے لیے برابر ہے۔ اگر آپ نے 'نو پارکنگ' میں گاڑی کھڑی کی اور خود شاپنگ کرنے چلے گئے تو واپس آنے پر آپ کے لیے ایک تحفہ منتظر ہوگا۔ آپ کی گاڑی پر جرمانے کا نوٹس اور اگر آپ اپنا جرم ماننے سے انکار کر دیں تو پولیس آپ کو آپ کی گاڑی کی تصویر دکھا دے گی جو اس نے ثبوت کے طور پر کھینچی ہوگی۔

کھٹ کی آواز کے ساتھ
پاؤنڈ آپ کے اور ٹرالی زنجیر
کے حوالے۔ اس طریقے کی
ضرورت کراچی ہوائی اڈے
پر بہت زیادہ ہے

برطانیہ کے لوگ بھی ہم جیسے ہیں، کوئی آسمان سے تو اترے نہیں کہ قانون کو قانون سمجھیں۔ قانون پر عمل درآمد نہ ہو تو یہاں کے لوگ بھی وہی کریں جو ہم اپنے ملک میں کرتے ہیں لیکن یہاں سختی ہے اور قانون ایسے ہیں کہ آپ چاہے جتنی کوشش کرلیں، اس سے دور نہیں بھاگ سکتے۔ مثال کے طور پر آپ کسی بھی شاپنگ سینٹر میں چلے جائیں (جیسے پاکستان میں یوٹیلیٹی سٹور)، بلڈنگ کے آغاز میں ہی ٹرالیوں کی لائن لگی ہوتی ہے اور ہر ٹرالی ایک زنجیر کے ذریعے دوسری ٹرالی سے منسلک ہے۔ اگر آپ کو خریداری کا سامان رکھنے کے لیے ٹرالی کی ضرورت ہے تو ٹرالی کی زنجیر پر بنی جگہ پر ایک پاؤنڈ کا سکہ رکھیں، آپ کا پاؤنڈ زنجیر کے پاس اور اس کی ٹرالی آپ کے پاس آجائے گی۔ اب آپ جتنی دیر چاہے شاپنگ کریں اور ٹرالی بھرتے جائیں لیکن خیال رکھیے گا کہ خراماں خراماں ٹرالی گھسیٹتے آپ شاپنگ سینٹر کے پارکنگ ایریا سے باہر ہی نہ چلے جائیں۔ ۲ر باتیں ہوں گی، ایک تو بل ادا کیے بغیر جانے پر سیکورٹی الارم خود ہی چیخ پڑے گا، دوسرا آپ کی ٹرالی ایک قدم بھی آگے بڑھنے سے انکار کر دے گی۔ اگر آپ نے بل ادا کیا بھی ہوا ہے، پھر بھی آپ ٹرالی کو ایک 'سند' کی صورت گھر لے جانے سے قاصر رہیں گے۔ وجہ وہی کہ ہر شاپنگ سینٹر کی ٹرالیاں اس کے علاقے سے باہر قدم (بلکہ اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیسے) رکھنے سے قاصر ہیں۔ گوروں نے پکا بندوبست کیا ہوا ہے، ورنہ شاید ایک بھی ٹرالی شاپنگ سینٹر میں نہ ہوتی۔ ارے اس ایک پاؤنڈ کو تو ہم بھول ہی گئے جو آپ نے ٹرالی کے بدلے زنجیر کے حوالے کیا تھا۔ یہاں ہم یہ بتا دیں کہ پاؤنڈ کی قدر و قیمت کیا ہے! آپ ایک پاؤنڈ میں سادہ چکن برگر کھا سکتے ہیں فلش صاف کرنے کا لیکچ لے سکتے ہیں یا بغلوں کو مہکانے کے لیے خوشبو بھی خرید سکتے ہیں۔ اس لیے کون اپنا پاؤنڈ زنجیر کے حوالے کر دے۔ آپ واپس اسی جگہ جائیں گے جہاں سے آپ نے ٹرالی مستعار لی تھی، زنجیر کو ٹرالی سے منسلک کریں گے اور کھٹ کی آواز کے ساتھ پاؤنڈ آپ کے اور ٹرالی زنجیر کے حوالے۔ یہ طریقہ ہمیں تو بہت اچھا لگا کیونکہ اس طرح نہ تو ہوا کے زور پر ٹرالیاں ادھر اُدھر بھاگتی نظر آتی ہیں اور نہ ہی چوری ہوتی ہے۔ اس طریقے کی ضرورت ہمیں کراچی ہوائی اڈے پر بے تحاشا محسوس ہوئی جہاں سامان لوڈ ہو جانے کے بعد مسافر حضرات اک ادائے بے نیازی سے ٹرالی کو بیچ راہ میں چھوڑ کر دوسروں کے لیے کوفت کا باعث بن رہے تھے۔

ویسے تو گوروں کے پاس عقل بے حساب ہے لیکن دو موقعوں پر شاید گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ ایک ان کے گھر اور دوسرا، گھروں میں لگے نل۔ رخصتی سے پہلے جب فون پر ہمارے میاں ہمیں برطانیہ کے گھروں کا حجم بتانے کے لیے اُنھیں مرغی کے ڈربوں سے تشبیہ دیتے تھے تو ہم حیرت سے اپنے چچا کے گھر بنے مرغی کے ڈربے کو دیکھتے ہوئے پوچھتے تھے 'ہیں، واقعی؟' اب یہی سوال ہماری بہنیں

ویسے تو گوروں کے پاس عقل بے حساب ہے لیکن ۲ موقعوں پر شاید گھاس چرنے چلی جاتی ہے

اور سہیلیاں کرتی ہیں جب ہم اُنھیں اپنے گھر کا حدود اربعہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیں، بھلا یہ کیا گھر ہوا جس میں سامان رکھنے کو دیوار پر لگی کوئی الماری نہ ہو، کوئی سٹور نہ ہو، کمرے میں ڈبل بیڈ رکھ کر سوچنا پڑے کہ الماری کی جگہ کیسے بنائیں، ٹوائلٹ جانا ہو تو اندر کیسے داخل ہوں، اگر خوش قسمتی سے کپڑے... اندر داخل ہو بھی گئے تو نکلیں کیسے! یقین کریں، ہمیں ایک ہسپتال کے ٹوائلٹ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اندر تو چلے گئے، باہر نکلنے کا کوئی رستہ نہ سجھائی دے کہ کپڑے فلش پر بھی نہ لگیں اور فلش کے عین سامنے لگا دروازہ بھی کھول لیں، بڑی سوچ بچار کی، ایک طرف کھڑے ہو کر دروازہ کھولتے ہیں تو دروازے تک پہنچنے کے لیے فلش آڑے آتا ہے۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر کوشش کریں تو دروازہ کسی صورت نہیں کھلتا۔ آخر تنگ آ کر ہم نے فلش پر کھڑے ہو کر دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگائی۔ گوروں کی عقل کو مزید سراہنا ہے تو کچن اور غسل خانے کے نل دیکھ لیں، آپ کی طبیعت عش عش کر اٹھے گی۔ پاکستان میں تو ٹھنڈا اور گرم پانی آپ ایک نل کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں لیکن یہاں گرم پانی کا الگ نل، ٹھنڈے پانی کا الگ۔ ٹھنڈا کھولیں تو یخ ٹھنڈا پانی آئے۔ گرم کھولیں تو جہنم کی یاد ذہن میں تازہ ہو جائے۔ گورے لوگ تو سنک بند کر کے ٹھنڈا اور گرم نل کھول کر اسی میں سارے برتن انڈیل دیتے ہیں (یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ دھوتے کیسے ہیں) غسل خانے میں بھی یہی کام کر کے پانی بھرے سنک میں ہی تمام کاموں سے فارغ ہو جاتے ہیں لیکن مسئلہ تو ہمیں ہوا اور بہت ہوا۔ اصل میں یہاں کا ہیٹنگ سسٹم بھی پاکستان کے گیزر کی طرح کا سمجھ لیں۔ یہاں ہیٹنگ سسٹم چلانے کے لیے کسی ماچس کی ضرورت نہیں پڑتی، صرف ایک بٹن گھمانے سے آپ پانی کا درجہ حرارت کنٹرول کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں تو اگر آپ نے گیزر چلایا ہے تو گرم پانی کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے پانی کا نل کھول کر اپنی ضرورت کے مطابق درجہ حرارت حاصل کر

سکتے ہیں لیکن یہاں دونوں نل الگ الگ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات بہت کوفت ہوتی ہے۔ اگر پانی کا درجہ حرارت تیز کیا گیا ہے تو ہر جگہ تیز گرم پانی ہی آئے گا۔ اس لیے اگر کوئی نہا رہا ہو تو کسی بھی جگہ کا نل کھولنے پر پابندی ہے کہ نہانے والا نکلے گا، پانی کا درجہ حرارت کم کرے گا تبھی آپ نارمل درجہ حرارت پر برتن دھو سکیں گے۔

یہاں آ کر ہم نے ترقی کی دوڑ میں بھارتیوں کو آگے آگے اور پاکستانیوں کو ذرا پیچھے پیچھے ہی دیکھا اور سچ مانیے ہمیں بہت ہی بُرا لگا۔ آپ گوروں کے بڑے بڑے سپر سٹورز میں چلے جائیں، آپ کو بھارتی کمپنیوں کے مسالے، چٹنیاں اور آٹے کے تھیلے آرام سے مل جائیں گے۔ ہم جب بھی خریداری کرنے جاتے، حسد کے مارے جلتے بھنتے واپس آتے لیکن ایک دن دل میں ٹھنڈک اتر گئی جب ہم نے ایک بہت بڑے سپر سٹور پر نیشنل اور شان کے مسالہ جات دیکھے لیکن ابھی بھی پاکستانی کمپنیوں کو اپنی جگہ بنانے کے لیے بہت محنت کی ضرورت ہے۔ خریدنے والے بہت ہیں، بس آپ کوشش جاری رکھیں۔

لیکن ایک شعبے میں پاکستانیوں نے اپنی دھاک بٹھا رکھی ہے، وہ ہے ہوٹلنگ کا شعبہ۔ مانچسٹر میں تو ایک سڑک کا نام 'curry mile' رکھ دیا گیا ہے کیونکہ ایک میل تک سڑک کے دونوں جانب کھانے پینے کے چھوٹے بڑے بہت سے ہوٹل بنے اور ان ہوٹلوں کے اندر ایشین کے بجائے گورے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ جی ہاں، ہم نے اُنھیں بھی اپنے ذائقوں کا گرویدہ بنا لیا ہے۔ کانوں سے دھواں نکل رہا ہے، سوں سوں کر کے ناک صاف کر رہے ہیں لیکن پھر بھی بریانی ضرور کھانی ہے، برگر بھی چپٹا ہو اور ساتھ میں مرچیلی چٹنی تو ضروری ہے۔ اب تو ان کے گھروں میں بھی ہمارے مسالہ جات کے ڈبے مل جاتے ہیں۔ شاید یہ بھی اُبلے ہوئے مٹر، آلو اور پالک وغیرہ کھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ ہمارے میاں جی کی گاڑی ایک دن خراب ہو گئی۔ باوجود کوشش کے سٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہمارا گورا ہمسایہ مدد کرنے کو

یہاں آپ کسی کو گھور نہیں سکتے۔ اس قانون کی وجہ سے ہمارے میاں تنگ ہیں اور ہم بے حد خوش

پہنچا اور کچھ ہی دیر میں گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔ میاں نے ازراہِ مروت پوچھ لیا کہ کوئی کام ہے تو بتائیں۔ ہمسائے نے فوراً بریانی کی فرمائش کر دی اور اگلے دن بہت مزے لے لے کر کھائی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جب یہ بیچارے انگریزی لہجے میں دیسی کھانوں کے نام لینے کی کوشش کرتے ہیں تو ویٹر بیچارے منہ چھپا کر بمشکل ہنسی چھپاتے ہیں۔ یہ لکھتے ہوئے ہمیں نجانے کیوں وہ لطیفہ یاد آ رہا ہے جس میں ایک گورے نے بڑی حیرت سے جلیبیاں بنانے والے سے کہا تھا کہ تم لوگ اس ٹیوب میں رس کیسے بھرتے ہو۔

ایک نامور پاکستانی نیوز چینل کے مشہور دعوے 'ہر جگہ، ہر وقت، سب سے پہلے ......نیوز' کی بدولت پاکستان کی پل پل کی خبریں ہم تک پہنچتی رہتی اور ہم دل تھامے کڑھتے رہتے ہیں۔ ایک دن بجلی کے بحران کا میاں جی نے ایک حل بتایا اور واقعی کیا خوب بتایا۔ یہاں بجلی کا بل ادا کرنے کے ۲ طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ مہینے بعد گھر پر بجلی کا بل آ جایا کرے (جیسا کہ پاکستان میں ہوتا ہے) اور دوسرا طریقہ یہ کہ آپ کے پاس موبائل کارڈ کی طرح کا ایک کارڈ ہوتا ہے جس میں آپ کسی بھی پٹرول اسٹیشن یا دکان پر جا کر بیلنس ڈلواتے اور گھر آ کر وہ کارڈ بجلی کے میٹر میں لگا دیتے ہیں۔ یہ بیلنس ۱۰/ پاؤنڈ کا بھی ہو سکتا ہے اور ۱۰۰/ پاؤنڈ کا بھی۔ جب بیلنس ختم ہونے لگے تو کارڈ نکالیے اور دکان پر جا کر دوبارہ بھروا لیجیے ورنہ آپ بھی کہیں گے، 'اوہ، بجلی چلی گئی' اور بجلی تب تک نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

آئے گی جب تک دوبارہ بیلنس بھرا کارڈ میٹر میں نہ لگ جائے...... ہماری رائے میں پاکستان میں بھی یہی دوسرا طریقہ متعارف ہونا چاہیے۔ پھر نہ کسی میٹر ریڈر کو گھر گھر جا کر میٹر چیک کرنا پڑے گا اور نہ ہی کنڈے کے ذریعے کوئی بھی گھر مفت میں بجلی کے مزے لے سکے گا۔ تجویز بُری نہیں ہے۔

دلوں کے حال تو اللہ ہی جانے، لیکن یہاں آپ کو ہر جگہ مساوات ضرور نظر آئے گی۔ کوئی حجاب میں ملبوس کسی خاتون کو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کسی کو نوکری سے اس لیے نہیں نکالا جا سکتا کہ اس کی داڑھی کیوں ہے اور نہ ہی کسی کے ساتھ کسی بھی طرح کا امتیازی سلوک روا رکھا جا سکتا ہے۔ ہمیں یورپ کے سب سے بڑے کینسر ہسپتال میں کام کرنے کا موقع ملا اور وہاں بھی ہم نے یہی بات دیکھی کہ آپ چاہیں کسی بھی رنگت اور نسل کے ہوں، آپ کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے گا بلکہ ایک مرتبہ تو ہم عید کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو باہر ایک تنظیم کے کچھ انگریز ہمیں عید کی مبارکباد دینے کے لیے کھڑے تھے۔ اتنا کھلا دل بہت کم اقوام کے پاس ہے اور برطانوی قوم اس معاملے میں شاید سب سے آگے ہے۔ اب تو یہاں سکولوں میں عید کی چھٹی بھی دی جانے لگی ہے لیکن مسئلہ پھر وہی ۲/عیدوں کا۔ جی ہاں...... یہ مسئلہ صرف پاکستان میں نہیں پایا جاتا بلکہ شاید جہاں جہاں پاکستانی پہنچتے ہیں، یہ مسئلہ بھی پہنچتا ہے۔

لیکن کچھ بھی ہو، جب یہاں گرمیوں میں دوپہر ڈھلتی ہے تو پاکستان میں لگے آموں کے بور کی خوشبو اس دیارِ غیر میں بے چین کر کے رکھ دیتی ہے۔ کان یہ آواز سننے کو ترس جاتے ہیں، 'فالسے لے لو' اور ہم پاکستانی بار بار ایشین سپر سٹورز کے چکر لگانا شروع کر دیتے ہیں' کہ بھائی، پاکستانی آم کب آئیں گے؟ یا جب برف پڑ رہی ہو تو پاکستان کی مونگ پھلیاں بے تحاشا یاد آتی ہیں، ساگ، مکھن اور مکئی کی روٹیاں یاد آتی ہیں، کینو یاد آتے ہیں اور اپنے یاد آتے ہیں اور اپنے تو ہمیشہ ہی یاد آتے ہیں......

EXCLUSIVE
for next month

آپ کے لیے بطور خاص

قرآن پاک کی کتابت کے لیے مشہور کیلیانوالا (گوجرانوالہ) کے ایک کاتب کی حیرت میں گم کرنے والی

ہمت، ذہانت، مسلسل محنت اور اللہ کی رضا کے لیے کام کی سچی لگن نے اسے دنیائے اسلام کے سب سے بڑے پبلشنگ ہاؤس "دارالسلام" کا خالق اور سربراہ بنا ڈالا

ریاض، نیویارک، بمبئی، بیجنگ، اسلام آباد کراچی، لاہور جیسے ۴۰ بڑے شہروں میں دارالسلام بکس اور اسلامک کلچر سنٹر کی بنیاد رکھنے والے اَن تھک

عبدالمالک مجاہد

کی سوچنے اور کچھ بڑا کر دکھانے کا راستہ دکھاتی باتیں

تحریر و تہذیب: اختر عباس

اُردو ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

مشورہ حاضر ہے

صفیرہ بانو شیریں

آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں، بڑے بڑے مسائل کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

سملو

سوال: ہماری قاریہ بہنیں کراچی سے پوچھتی ہیں۔ سملو کے بارے میں بتائیے یہ جڑی بوٹی کہاں ملتی اور کیسی ہوتی ہے؟ اور ہم اسے کس طرح استعمال کر سکتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ چرائتہ کا قہوہ وزن کم کرتا ہے یا نہیں۔ اسے ہم کس طرح اور کس وقت لیں تاکہ وزن کم ہو جائے۔ میری ایک دوست آج کل استعمال کر رہی ہے مگر ان کا وزن ابھی کم نہیں ہوا۔ چرائتہ اور کس بیماری میں کام آتا ہے؟

جواب: عنبرین بی بی! اللہ تعالیٰ نے بے شمار جڑی بوٹیوں میں تاثیر رکھی ہے، ان میں سملو بھی ہے۔ قد آدم کانٹوں سے بھرا پودا۔ جڑ پیلے رنگ کی اور کہیں کالے رنگ کی بھی ہوتی ہے۔ اسے چھاتی اور ہڈیوں کے کینسر کی بیماری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایبٹ آباد، شاہراہِ ریشم، شمالی علاقہ جات، سوات وغیرہ میں عام ملتا ہے۔ اس کی جڑ کا چھلکا بطور دوا پہاڑی لوگ بھی استعمال کرتے ہیں۔ بڑھے ہوئے ٹانسلز میں یہ ورم دور کرتا ہے، چھوٹا سا ٹکڑا منہ میں رکھ کر رات کو سونے سے اس کا رس آہستہ آہستہ ٹانسلز کو ختم کر دیتا ہے۔ محترم بھائی عبدالوحید سلیمانی نے اس جڑ سے کئی مریض شفایاب کیے ہیں اور اب بھی سملو اُن کے زیرِ استعمال ہے۔

چرائتہ مصفّی خون ہے۔ گرمی کے موسم میں پھنسی، خارش، کیل مہاسوں کے لیے حکیم اسے استعمال کرتے ہیں۔ ملیریا بخار میں بھی دوسری دواؤں کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ چرائتہ کا قہوہ پیٹ کے کیڑے بھی ختم اور معدے کی خرابیاں دور کرتا ہے۔ اس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے، قبض دور کرتا ہے۔ وزن کم کرنے کے لیے میرے علم میں نہیں۔ اسے دوسری دواؤں کے ساتھ ملا کر خون صاف کرنے کے لیے ضرور پلایا اور مصفّی خون شربت میں بھی ڈالا جاتا ہے۔ آپ اپنی دوست سے پوچھ کر استعمال کریں۔ ان کا زیادہ استعمال بغیر طبیب کے مشورے سے مناسب نہیں۔ اس کا قہوہ کمزوری کو رفع کرتا ہے۔

کھیرا کھائیے۔ لگائیے

سوال: گزشتہ دنوں میں نے ایک کریم استعمال کی، چہرہ نکھر جاتا تھا مگر کریم جب ختم ہوئی تو میں نے دیکھا آنکھوں کے نیچے موتی کی طرح کے سفید گول گول دھبے نظر آرہے ہیں۔ اب کوئی بتاتا ہے، کیلشیم کی کمی ہے، کوئی الرجی کہہ رہا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرا چہرہ بگڑ کر رہ گیا ہے۔ کچھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ اس بارے میں کچھ بتائیے۔ (رضا فاروق)

جواب: کریم میں کوئی ایسی چیز شامل تھی جس سے آپ کو یہ تکلیف ہوئی۔ آپ ۲/ گلاس دودھ روزانہ پئیں تاکہ کیلشیم کی کمی دور ہو جائے اور سب سے پہلے چہرے پر تھوڑا سا دہی لگائیے۔ ۱۰/ منٹ بعد منہ دھو لیجیے۔ گھنٹہ بعد آپ کھیرے کے ٹھنڈے پتلے کاٹ کر آنکھوں کے نیچے رکھیے۔ آپ کھیرے کو کدوکش کر کے بھی رکھ سکتے ہیں۔ اس سے بہت سکون ملے گا۔ کھانے میں ایک کھیرا ضرور شامل کریں۔ کھیرا کھانے اور لگانے سے جسم میں ٹھنڈک کا احساس ہوگا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے ہوں جب بھی کھیرے کے قتلے کام کرتے ہیں۔ دھوپ سے چہرہ جھلس جائے تو کھیرا فوری طور پر سکون دیتا ہے۔ چہرے کی جلد حساس ہوتی ہے۔ اس پر طرح طرح کی کریمیں لگا کر ستیاناس مت کریں۔

بچے گوشت کے بغیر کھانا نہیں کھاتے

سوال: گھر میں دال سبزی ہو تو بچے کھانے سے انکار کر دیتے اور گوشت کی فرمائشیں کرتے ہیں۔ ان کو کس طرح سمجھاؤں اور کیسے سبزیوں کی عادت ڈالوں؟ بہت سارے گھروں کا یہی مسئلہ ہے آپ بتائیے۔ (عمیرہ نواز)

جواب: ساری غلطی تو آپ کی ہے۔ انھیں شروع سے ہر چیز کھلانے کی عادت ڈالنی چاہیے تھی۔ صحت کے لیے دال، سبزیاں، سلاد بہت ضروری ہیں۔ شامی کباب بنانے کے بجائے آپ آلو، سبزی ملا کر بنائیں۔ ٹماٹر سلاد ساتھ رکھیے۔ دہی میں ذرا سا نمک کالی مرچ ملا کر برگر یا سینڈوچ پر لگائیے۔ اس پر سلاد کا ہرا پتا رکھیے آلو کا کٹلس رکھ کر آدھا چمچ کیچپ ڈالیے۔ بچوں کو دیجیے۔ سرخ لوبیا ابال کر پیس کر آپ مسالے میں کباب بنا سکتی ہیں۔ ثابت کالی مسور کی دال ابال کر اس میں ہرا مسالہ ملائیے، کوفتے بنا کر رکھ دیجیے۔ دال پکائیں تو اس میں چکن کباب ڈال دیں۔ ہفتے میں ۲/ بار بچوں کو گوشت ضرور کھلائیں۔

مچھلی

سوال: مجھے مچھلی بہت پسند ہے مگر ہمارے ہاں صرف سردی کے موسم میں مچھلی کھائی جاتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ مچھلی کھانے کے بعد دودھ پینے سے داغ پڑ جاتے ہیں۔ کیا یہ بات درست ہے۔ (سلمان احمد)

جواب: بیٹا......! آپ مچھلی ضرور کھائیے مگر اعتدال کے ساتھ۔ ہر چیز کی زیادتی بُری ہوتی ہے۔ مچھلی تلی ہوئی بڑے اچھے ذائقے کی ہوتی ہے مگر اس کا سالن بہت مزے کا ہوتا ہے۔ مچھلی کا قورمہ بنتا ہے، کباب بنتے ہیں، فنگر فش شوق سے کھائی جاتی ہے۔ بنگال میں مچھلی بہت کھائی جاتی ہے۔ مچھلی کے شوربے کے ساتھ اُبلے ہوئے چاول ان کی مرغوب غذا ہے۔ سردی کے موسم میں ہماری ایک پڑوسن مچھلیوں کے سر صاف کرتی۔ پھر لہسن، پیاز، نمک مرچ، دھنیا اور ثابت گرم مسالہ ڈال کر پکاتی۔ اس میں ڈھیر سارا پانی ہوتا۔ آپ اسے مچھلی کی یخنی یا سوپ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے پینے سے جسم میں توانائی آتی اور سردی بھی نہیں لگتی تھی۔

ہمارے ہاں کہا جاتا ہے جن مہینوں میں "ر" نہیں آتا اس میں مچھلی نہ کھائیں۔ کیونکہ مچھلی کی افزائش نسل ان مہینوں میں ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دودھ نہیں پینا چاہیے، سفید داغ پڑ جاتے ہیں۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ احتیاط کر لیں تو وہم نہیں ہوتا۔ باہر کے ممالک میں ہر موسم میں مچھلی مل جاتی ہے، سب کھاتے ہیں۔ زیادہ گرمی میں نہ کھائیں تو بہتر ہے۔ آپ کی تھوڑی احتیاط صحت کو برقرار رکھ سکتی ہے۔

پسینے کے دھبے

سوال: مجھے پسینہ بہت آتا ہے۔ بعض مرتبہ قیمتی قمیص میں بغل کی جگہ دھبے لگ جاتے ہیں، صاف نہیں ہوتے قمیص

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعض دفعہ پسینے کی وجہ سے گل جاتی ہے۔ یہ پسینہ کم نہیں ہو سکتا، بتائیے۔ (راشدہ)

جواب: کچھ لوگوں کو بہت پسینہ آتا ہے۔ آپ کہیں جائیں تو نہا کر جسم خشک کر کے پھٹکری کی ڈلی اچھی طرح بغلوں کے نیچے پھیریں، اس سے پسینہ کم آئے گا۔ نیم کے خشک پتوں کا پاؤڈر بنا کر صبح شام بغلوں میں چھڑکنے سے بھی فرق پڑ جاتا ہے۔

شہد

سوال: سردی کے موسم میں اکثر میرے گلے میں خراش ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ کھانسی میں بدل جاتی ہے۔ جس سے مجھے بہت مسئلہ ہوتا ہے۔ سردی کے موسم میں کیا کھانا چاہیے جس سے یہ مسئلہ صحیح رہے اور میں بار بار بیمار نہ ہوں۔ (فاروق خالد)

جواب: سردی کے موسم میں ایسی چیزیں کھانی چاہئیں جن سے طاقت برقرار رہے۔ پہلے زمانے میں خاص طور پر سردی کے موسم کی تیاری کی جاتی تھی۔ طرح طرح کے حلوے بنتے، ان میں میوہ جات ڈالے جاتے تاکہ جسم گرم رہے۔ پائے کا شوربا، گوشت کی یخنی، مچھلی ضرور استعمال کی جاتی، دیسی انڈے ابال کر کھائے جاتے، میتھی دانہ بہت گرم ہوتا ہے، اس کی خاص طریقے سے چاولوں کے ساتھ کھچڑی بنائی جاتی، اس پر ڈھیر سارے اصلی گھی کا بگھار کیا جاتا۔ ناشتے میں اسے کھایا جاتا۔ اس کے کھانے سے جسم گرم ہو جاتا۔ اب یہ سب چیزیں کہاں؟ آپ گھر میں شہد لا کر رکھیے، صبح کے وقت گرم پانی میں ملا کر پی لیجیے۔ ایک کپ ابلتا پانی اور ایک بڑا چمچ شہد کا ہونا چاہیے۔ کھانسی میں تھوڑی سی کالی مرچ پیس کر شہد میں ملا کر رکھ لیں۔ اسے دن میں تین چار بار چاٹ لیں۔

سخت نزلہ زکام ہو تو ایک چمچ شہد گرم کریں۔ اس میں پسی ہوئی دار چینی چائے کا چوتھائی چمچ ملا کر آہستہ آہستہ انگلی سے چاٹ لیں۔ دن میں ۳/ بار ایسا کریں۔ دائمی کھانسی بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ شہد میں پستہ وغیرہ ثابت ڈال کر رکھیے۔ اس کے کھانے سے بھی قوت مدافعت بڑھ جاتی ہے۔ شہد سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ آپ اصلی شہد خریدیے۔ خود بھی استعمال کریں، بچوں کو بھی دیجیے۔ شہد کو آپ توس پر لگا کر چائے کے ساتھ کھا سکتے ہیں۔ سردی کے موسم میں قدرت کی اس نعمت سے ضرور فائدہ اٹھائیے، اس میں شفاء ہے۔

کیڑے آجاتے ہیں

سوال: میں اپنے باورچی خانے کی الماری میں ہر ماہ اخبار بچھاتی ہوں۔ ایک ہفتے بعد ننھے منے جھینگر اور لال بیگ وغیرہ اخبار کے نیچے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے لیے کیا کروں؟ (شبانہ)

جواب: بی بی! کچن کی الماری میں کبھی اخبار نہ بچھائیں۔ اخبار کے نیچے کیڑے مکوڑے ضرور اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ آپ بازار سے خاکی کاغذ لے کر آئیے۔ کچن کی دراز اچھی طرح صاف کریں۔ پھر آپ کیوپیکس پاؤڈر چھڑک دیں تو صبح آپ کو چیونٹے اور کیڑے مرے ہوئے ملیں گے۔ کوڑے کی ٹوکری کو ڈھانک کر رکھنا چاہیے، اس سے بھی بہت فرق پڑ جاتا ہے۔

مہندی

مہندی کا رنگ کیسے تبدیل کیا جاتا ہے۔ بالکل سرخ رنگ بالوں میں اچھا نہیں لگتا۔ مجھے خضاب سے الرجی ہے۔ اس بارے میں بتائیے۔ (عنبرین انور)

بی بی! آپ تھوڑے سے آملے کوٹ کر ایک گلاس پانی میں رات کو بھگوئیں۔ صبح لوہے کی کڑاہی میں یہ پانی ڈالیے ایک بڑا چمچ چائے کی پتی، ایک چمچ کافی، ایک چمچ کلونجی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیے۔ آدھا پانی رہ جائے تو اس میں مہندی گھولیے۔ مہندی گھولنے سے پہلے پانی کو چھان لیجیے۔ ایک چمچہ سرسوں کا تیل ملائیے۔ مہندی لگائیے، بالوں کا رنگ سرخ نہیں ہوگا۔ مہندی اچھی ہونی چاہیے۔ کچھ خواتین اس میں لیموں کا رس ملا دیتی ہیں اگر آپ کو الرجی ہے تو خضاب کے بجائے صرف مہندی لگائیے۔ ■

ماہِ رواں کی شخصیات

ماہ رواں سے ایک نئے سلسلے کا بھی آغاز کر رہے ہیں۔ بہت محنت سے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ آپ کے لیے اہم معلومات کا ماخذ ثابت ہوگا

محمد خلیل چودھری (دینہ)

ماہِ نومبر میں پیدا ہونے والی اہم عالمی و ملکی شخصیات

یکم نومبر ۱۹۰۳ء پروفیسر حمید احمد خان (ماہر تعلیم)
یکم نومبر ۱۹۱۰ء جسٹس حمود الرحمٰن
یکم نومبر ۱۹۳۰ء علامہ شبلی نعمانی (عالم، مصنف سیرت النبیؐ)
یکم نومبر ۱۹۴۶ء فاروق قیصر (ٹی وی اداکار)
۲ نومبر ۱۸۷۷ء سر آغا خان سوئم (سیاسی رہنما)
۲ نومبر ۱۸۹۷ء سہراب مودی
۲ نومبر ۱۹۰۲ء شیخ عنایت اللہ (تاج کمپنی کے بانی)
۳ نومبر ۱۶۱۸ء اورنگ زیب عالمگیر (مغل بادشاہ)
۳ نومبر ۱۹۱۴ء خواجہ جمیل احمد
۳ نومبر ۱۷۱۸ء ارل آف سینڈوچ (سینڈوچ کا موجد)
۴ نومبر ۱۸۹۶ء حکیم احمد شجاع
۴ نومبر ۱۹۵۰ء ڈاکٹر شوکت علی قمر (شاعر و ادیب)
۴ نومبر ۱۹۵۶ء ڈاکٹر سجاد حسین قریشی (اردو کے ناقد اور محقق)
۴ نومبر ۱۹۶۷ء آصف مجتبیٰ (سابق ٹیسٹ کرکٹر)
۵ نومبر ۱۹۰۵ء سید سجاد ظہیر (ادیب)
۵ نومبر ۱۹۱۴ء راجہ صاحب محمود آباد
۵ نومبر ۱۹۲۵ء فاطر غزنوی (شاعر)
۵ نومبر ۱۹۴۲ء ڈاکٹر معین الرحمٰن (نقاد)
۶ نومبر ۱۸۶۱ء جیمز نیسمتھ (باسکٹ بال کے موجد)
۶ نومبر ۱۹۷۴ء فیصل عظیم (اردو کے شاعر)
۷ نومبر ۹۹۴ء ابن حزم (عالم دین فقیہہ مؤرخ اور شاعر)
۷ نومبر ۱۴۱۴ء جامی (فارسی شاعر)
۷ نومبر ۱۸۶۷ء مادام کیوری (سائنس دان)
۷ نومبر ۱۹۱۸ء علامہ نجم الحسن کراروی (عالم)
۷ نومبر ۱۹۳۰ء نظیر صدیقی (شاعر)
۸ نومبر ۱۴۶۹ء بابا گرونانک (سکھ مذہب)
۸ نومبر ۱۶۷۴ء جان ملٹن (شاعر)
۸ نومبر ۱۸۶۹ء سر اکبر چودھری
۹ نومبر ۱۸۷۷ء علامہ محمد اقبالؒ (شاعر مشرق)
۹ نومبر ۱۹۱۰ء ن۔م۔ راشد (شاعر)
۹ نومبر ۱۹۱۱ء تابش دہلوی (شاعر)
۹ نومبر ۱۹۲۰ء ڈاکٹر شفیق الرحمٰن (ممتاز مزاح نگار)
۱۰ نومبر ۱۴۸۳ء مارٹن لوتھر (امریکی سیاہ فام راہنما)
۱۰ نومبر ۱۸۴۸ء سریندر ناتھ بینرجی
۱۰ نومبر ۱۹۱۰ء کیپٹن محمد سرور شہید (نشان حیدر)
۱۰ نومبر ۱۹۳۰ء جمیل نشتر (خوشحالی بینک کے سربراہ)
۱۱ نومبر ۱۸۲۱ء دوستوفسکی (روسی ناول نگار اور صحافی)
۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء ابوالکلام آزاد (عالم، مصنف)
۱۱ نومبر ۱۹۱۷ء فارغ بخاری (شاعر)
۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء اسمٰعیل میرٹھی (شاعر)
۱۲ نومبر ۱۸۶۶ء سن یات سین
۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء اختر الایمان (شاعر)
۱۳ نومبر ۱۷۸۰ء رنجیت سنگھ (سکھ حکمران)
۱۳ نومبر ۱۸۹۹ء سکندر مرزا (پہلے پاکستانی صدر)
۱۴ نومبر ۱۷۶۵ء اسٹیم بوٹ کا موجد رابرٹ فلٹن
۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء جواہر لال نہرو (پہلا بھارتی وزیراعظم)
۱۴ نومبر ۱۹۴۸ء پرنس آف ویلز شہزادہ چارلس
۱۵ نومبر ۱۷۳۸ء سر ولیم ہرشل
۱۵ نومبر ۱۹۱۰ء موسیقار فیروز نظامی
۱۶ نومبر ۱۸۳۵ء رانی جھانسی (جھانسی کی حکمران)
۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء اکبر الہ آبادی (ملی شاعر)
۱۶ نومبر ۱۸۹۷ء چودھری رحمت علی
۱۷ نومبر ۱۹۰۹ء اردو افسانہ نگار غلام عباس
۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء وحشت کلکتوی
۱۹ نومبر ۱۹۱۷ء اندرا گاندھی (ہندوستانی وزیراعظم)
۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء احمد ندیم قاسمی (شاعر، ادیب)
۲۰ نومبر ۱۷۵۰ء ٹیپو سلطان (حاکم میسور)
۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء والٹیر (فرانسیسی ادیب)
۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء سید سلیمان ندوی
۲۳ نومبر ۱۹۱۲ء اختر عباس (ادیب، افسانہ نگار، ایڈیٹر)
۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء پروین شاکر (شاعر)
۲۵ نومبر ۱۹۵۲ء عمران خان (کھلاڑی، سیاسی رہنما)
۲۶ نومبر ۱۸۷۵ء مولانا انور شاہ کاشمیری (عالم دین)
۲۷ نومبر ۱۹۳۴ء ڈاکٹر انور سجاد (افسانہ نگار)
۲۸ نومبر ۱۹۲۸ء بانو قدسیہ (ادیبہ، ناول نگار)
۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء سید احمد شہید (عالم حریت پسند)
۳۰ نومبر ۱۸۷۴ء ونسٹن چرچل (برطانوی وزیراعظم)

ماہِ نومبر میں وفات پانے والی شخصیات

یکم نومبر ۱۹۱۷ء اسمٰعیل میرٹھی (اردو کے شاعر اور معلم)
یکم نومبر ۱۹۷۴ء میاں افضل حسین (ممتاز ماہر تعلیم)
یکم نومبر ۱۹۷۲ء تنویر نقوی (گیت نگار)
۲ نومبر ۱۹۵۰ء جارج برنارڈ شاہ (برطانوی ادیب)
۲ نومبر ۱۹۸۲ء غلام عباس (افسانہ نگار)
۳ نومبر ۱۹۴۹ء میراجی (اردو شاعر)
۳ نومبر ۲۰۰۱ء مقبول احمد قریشی (اردو شاعر)
۴ نومبر ۱۹۱۵ء فیروز شاہ مہتا
۴ نومبر ۲۰۰۶ء عبدالستار افغانی (سابق رکن قومی اسمبلی و سابق میئر کراچی)
۵ نومبر ۱۹۷۴ء خواجہ عبدالرحیم
۵ نومبر ۱۹۸۲ء شباب کیرانوی
۶ نومبر ۱۶۴۴ء سر تھامس رو (مغل دربار میں سفیر)
۶ نومبر ۱۹۸۱ء جسٹس عبدالرشید (پاکستان کے پہلے چیف جسٹس)
۷ نومبر ۱۸۶۲ء مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر
۷ نومبر ۱۹۸۱ء نواب سید شمس الحسن
۸ نومبر ۱۹۶۵ء مرزا بشیر الدین محمود
۸ نومبر ۱۹۸۰ء درپن (اداکار)
۹ نومبر ۱۹۱۴ء امام بی بی (علامہ اقبال کی والدہ)
۹ نومبر ۱۹۵۲ء عبدالعزیز سعود (سعودی عرب کے بادشاہ)
۹ نومبر ۱۹۷۰ء ڈیگال (فرانس کے سابق صدر)
۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کمال اتاترک
۱۰ نومبر ۱۹۸۲ء برژنیف (روس کے سابق صدر)
۱۱ نومبر ۱۸۵۴ء شیخ ابراہیم ذوق
۱۱ نومبر ۱۹۸۴ء راجندر سنگھ بیدی
۱۲ نومبر ۱۹۶۶ء شکیب جلالی کی خودکشی
۱۲ نومبر ۱۹۸۲ء راز مراد آبادی
۱۳ نومبر ۱۹۲۴ء بی اماں (مولانا محمد علی جوہر کی والدہ)
۱۳ نومبر ۱۹۶۹ء سکندر مرزا (پہلے پاکستانی صدر)
۱۴ نومبر ۱۹۵۷ء گورنر زاہد حسین (سٹیٹ بینک کے پہلے گورنر)
۱۴ نومبر ۱۹۸۴ء اقبال حسن (اداکار)
۱۴ نومبر ۱۹۹۴ء کوکب شادانی
۱۵ نومبر ۱۹۶۲ء جسٹس رستم کیانی (ادیب)
۱۵ نومبر ۱۹۷۵ء فیروز نظامی (موسیقار)
۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء مولانا غلام رسول مہر (ادیب۔ محقق)
۱۶ نومبر ۱۹۷۷ء عبدالغفور اظہر (پنجابی زبان کے مشہور شاعر)
۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء وقار عظیم
۱۷ نومبر ۱۹۸۷ء مسرت حسین زبیری (بیوروکریٹ)
۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مولانا شبلی نعمانی (عالم، مصنف)
۱۸ نومبر ۱۹۸۱ء مرزا ابوالحسن اصفہانی
۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء شاہ عالم ثانی
۱۹ نومبر ۱۹۵۷ء سر شاہنواز بھٹو (سندھی رہنما)
۲۰ نومبر ۱۹۱۰ء لیوٹالسٹائی (روسی ناول نگار)
۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء فیض احمد فیض (شاعر)
۲۱ نومبر ۱۵۱۷ء سکندر لودھی (حکمران)
۲۱ نومبر ۱۹۸۰ء اطہر نفیس (اردو کے غزل گو شاعر)
۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء سید سلیمان ندوی (عالم)
۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء ماسٹر تارا سنگھ
۲۳ نومبر ۱۹۸۳ء ایم اسلم اور وحید مراد
۲۳ نومبر ۱۹۳۷ء جگدیش چندر بوس
۲۴ نومبر ۱۷۲۱ء مرزا بیدل
۲۴ نومبر ۱۹۴۶ء ثاقب لکھنوی
۲۵ نومبر ۱۹۷۴ء او تھانٹ (اقوام متحدہ کے تیسرے سیکرٹری جنرل)
۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء سلیم رضا (گلوکار)
۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء ڈاکٹر ایوب قادری
۲۶ نومبر ۱۹۶۷ء ملک امیر محمد خان (نواب کالاباغ)
۲۶ نومبر ۲۰۰۷ء پروفیسر چودھری عبدالحمید (ممتاز ماہر تعلیم)
۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء مولانا ظفر علی خان (صحافی، شاعر)
۲۷ نومبر ۱۹۷۹ء بیگم جہاں آرا شاہنواز
۲۸ نومبر ۱۹۳۸ء مولانا شوکت علی (شاعر، رہنما)
۲۸ نومبر ۱۹۷۵ء علامہ راغب احسن
۲۹ نومبر ۱۹۶۹ء ڈاکٹر رفیع الدین (ماہر اقبالیات)
۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء سید مسعود حسین رضوی (ادیب)
۳۰ نومبر ۱۶۲۴ء حضرت مجدد الف ثانی (عالم دین)
۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء ڈاکٹر محمد دین تاثیر (معروف ادیب، شاعر)
۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء اصغر گونڈوی (شاعر)
۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء مولانا محمود الحسن (شیخ الہند)

WWW.PAKSOCIETY.COM

آیئے......! کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریئے

زندگی کی سب سے قیمتی متاع
اچھی کتاب
سے
زیادہ کچھ اور نہیں

کتابوں کی کہکشاں

یہ کالم آپ کو کتابوں پر تبصرے سے کافی مختلف لگے گا
اس میں کتاب اور صاحب کتاب دونوں کا تذکرہ رہے گا

نوید اسلام صدیقی

''کتابوں کی کہکشاں'' کے عنوان سے کتابوں اور اُن کے مصنفین کے تعارف کا ایک مستقل سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ ان شاء اللہ اس عنوان کے تحت باقاعدگی سے آپ کو (ادارہ کو موصول شدہ) نئی شائع شدہ کتب کے بارے میں آگاہ رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

سیکولرزم: مباحث اور مغالطے

پاکستانی قوم کو گمراہ کرنے کے لیے طرح طرح کے فتنے پھن اٹھائے ہوئے چاروں طرف کھڑے ہیں، انہی فتنوں میں سے ایک انتہائی خطرناک فتنہ ''سیکولرزم'' کے نام سے اپنی جڑیں پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر صفدر محمود، جو ایک عظیم مورخ، محقق اور کالم نویس ہیں، رقم طراز ہیں: طارق جان کی کتاب ''سیکولرزم: مباحث اور مغالطے'' پڑھ کر میں بے حد متاثر ہوا اور مصنف کے لیے دل سے دعا نکلی۔ مصنف نے قارئین کو بہت سے مغالطوں اور کنفیوژن کے اندھیروں سے نکالنے کی موثر کوشش کی ہے۔ طارق جان کا اسلوب علمی اور عام فہم ہے اور اُن کی تصنیف اعلیٰ درجے کی تحقیق کے تقاضے پورے کرتی ہے۔ دلیل کے ساتھ حوالے اس کا ثبوت ہیں۔ بدقسمتی سے کچھ عرصہ سے پاکستان میں سیکولر لابی خاصی متحرک اور منظم ہو چکی ہے اور سیکولر حضرات ایک منصوبہ کے تحت پاکستان کی نظریاتی بنیادوں میں نقب

WWW.PAKSOCIETY.COM

لگانے کی سعی کر رہے ہیں۔ اس منصوبہ کا پہلا قدم مذہب کو ہر قسم کی دہشت گردی، زوال اور مسائل کا سبب ٹھہرانا ہے، نوجوان نسل کو پاکستان کی نظریاتی اساس سے متنفر کرنا اور عام لوگوں کو مغالطوں کا شکار کر کے سیکولرزم کو ہر مرض کا علاج ثابت کرنا ہے۔ نظریاتی محاذ پر پاکستان کو اس وقت سب سے بڑا خطرہ اسی جانب سے ہے۔ طارق جان نے اپنی اس کتاب میں نہ صرف سیکولر حضرات کی سوچ، پراپیگنڈہ اور حکمت عملی کو ایکسپوز کیا ہے بلکہ اُن کی دشنام طرازی، اقبالؒ، قائداعظمؒ، قراردادِ مقاصد اور آئین سازی کے حوالہ سے اعتراضات اور دلائل کا بھی نہایت موثر جواب دیا ہے۔ اس پس منظر میں یہ کتاب پاکستان میں سیکولرزم کے زہر کا تریاق اور توڑ ہے۔''

ناشر: ایمل مطبوعات، اسلام آباد
تقسیم کنندہ: ۱۲، سیکنڈ فلور، مجاہد پلازہ
بلیو ایریا، اسلام آباد
فون 051-2803096
قیمت: ۸۸۰ روپے

☆☆

عظمت کے مینار

''اسلام نے زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کو رہنمائی عطا کی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کی ذات قرآن کریم کا کامل نمونہ ہے۔ تمام صحابہ کرامؓ بھی اسلامی طرزِ زندگی کا نمونہ تھے۔ شمع رسالت ﷺ سے روشنی پانے کے بعد وہ خود بھی منبعِ نور و ہدایت بن گئے۔ ان کی سیرت کے چیدہ چیدہ واقعات سے مزین یہ کتاب مصنف جناب محمد احمد انصاری بدایونی نے امت کی رہنمائی اور رہبری کی غرض سے نہایت محبت وعقیدت کے ساتھ مرتب کی ہے۔

یہ واقعات تمام بنی نوع انسان کے اخلاق و کردار کے لیے مربیانہ دروس ثابت ہوسکتے ہیں۔ ان میں فتوحات کے ایمان پرور تذکرے ہیں تو کہیں ذاتی حالات، خدمت اور ایثار و قربانی کے وہ کار ہائے نمایاں اجاگر کیے گئے ہیں جو رہتی دنیا کے لیے سراسر ہدایت ہیں۔ یہ سب دعوتِ فکر وعمل کا اہتمام ہے۔'' ڈاکٹر ممتاز عمر صاحب کی کتاب کے بارے میں رائے آپ نے

پڑھی۔ کتاب کی قیمت کے سامنے لکھا ہے 'دعائے خیر' اللہ تعالیٰ مصنف کے جذبے کو قبول فرمائے اور کتاب کو قبولیت عامہ بخشے۔

ناشر: راشد جمال پبلی کیشنز
T-475، کورنگی نمبر 2، کراچی
ملنے کا پتا: محمد احمد انصاری بدایونی
خاک مدینہ مارکیٹ، مکان نمبر ۳۷۷
سیکٹر Q، کورنگی نمبر 2، کراچی

☆☆

عصرِ حاضر کی مجاہد خواتین

ادارہ 'منشورات' نے مریم السید ہنداوی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ مترجم محمد ظہیر الدین بھٹی صاحب نے کتاب کو بہت خوبصورت انداز میں اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

آج تمام دنیا کی نظریں مصر پر لگی ہوئی ہیں جہاں عالم اسلام کی سب سے بڑی تنظیم اخوان المسلمون نے کئی عشروں کی حیران کُن اور قربانیوں سے بھرپور جدوجہد کی ایک تاریخ رقم کی ہے۔ انہوں نے نہایت حکمت اور دانائی سے تمام شرپسند اور اسلام دشمن قوتوں کو سیاسی میدان میں شکست سے دوچار کیا ہے۔ آج مصر کا صدر اخوان المسلمون کا ایک لیڈر ہے۔

اخوان المسلمون نے اپنے ہم وطن گمراہ عناصر کے ہاتھوں بہت زیادہ مصائب برداشت کیے ہیں۔ ظالموں نے خواتین کو بھی نہ بخشا۔ اس ۲۳۲ صفحات کی کتاب میں اخوان المسلمون سے وابستہ ۱۷ مصری رہنما پُرعزم خواتین کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا ایمان کس بلند درجے کا تھا، اُن کو اپنے خالق پر کتنا بھروسا تھا اور قربانی کا جذبہ کس طرح اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ملنے کا پتا: منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور
فون نمبر 042-35434909
قیمت: ۲۱۰ روپے

☆☆

میراتھن دوڑ اک

میں نے ۲ سال یونیورسٹی میں ماسٹر اسپورٹس سائنسز کی ڈگری کے حصول میں لگائے لیکن جب ایک تعلیمی ادارے میں انٹرویو دیا تو ۴۰ میں سے صرف ۲ سوالات کے درست جوابات دے سکا۔ ممتحن صاحب نے بجائے میرا مذاق اڑانے کے مجھے منتخب کر لیا کیونکہ عملی امتحان میں میں نے انھیں کافی متاثر کیا تھا۔ پھر ہمدردانہ لہجے میں نصیحت کی برخوردار! کتابیں پڑھا کرو۔ کچھ کتابوں کے نام بھی بتائے، وہ سب انگریزی میں تھیں اور ہماری انگریزی بس واجبی سی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی دراز سے نکال کر ایک کتاب ہمارے حوالے کی اور کہا کہ پڑھ کر واپس کر دینا (جو ہم نے آج تک نہیں کی) یہ کتاب تھی 'میراتھن دوڑ اک' جسے پڑھنا شروع کیا تو محسوس ہوا کہ شاید میں نے جامعہ میں فزیکل ایجوکیشن کی الف سیکھی ہے، ب سے ی تک سیکھنا باقی ہے۔

یہ کتاب پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ کھلاڑی خصوصاً میراتھن اتھلیٹ عام کھلاڑی کی نسبت کیوں بہتر ہوتا ہے۔ ٹریننگ کے اہم اجزا کون کون سے ہیں اور یہ کیسے کی جاتی ہے؟ اُصول اور طریقے کیا ہیں؟ قوتِ برداشت کی اہمیت

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور اسے پیدا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ دوڑنے سے قبل کارکردگی کے متعلق پیش گوئی کرنا کیسے ممکن ہے؟ وارم اپ کیا اور کیوں کیا جاتا ہے؟ فائدے اور سائنٹیفک طریقہ کیا ہے؟ دوڑنے سے قبل کون سی مخصوص اسٹریچنگ ورزشیں کرنی چاہئیں؟ ردمک سائکلو کارکردگی پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں؟ دوڑ سے قبل خوراک میں کیا تبدیلی کرنی اور کیوں کرنی چاہیے؟ کاربوہائیڈریٹ لوڈنگ کیا ہے، اس کا طریقہ اور فائدہ کیا ہے؟ ایک ہی جیسے قد کاٹھ، ایک سی ٹریننگ اور غذا کھانے والے اتھلیٹس کی کارکردگی مختلف کیوں ہوسکتی ہے؟ ذہنی طاقت سے کیا مراد ہے؟ ارتکازِ توجہ اور ذہانت کس طرح کارکردگی پر اثر انداز ہوتی ہے؟ دوڑ کے دوران آگے نکل جانے والے اتھلیٹس سے ذہنی رابطہ کس طرح قائم رکھا جاسکتا ہے؟ رفتارِ قدم اور اس پر قابو پانے کا طریقہ کیا ہے؟

عام تھکن، مزمن تھکن، اس کا علاج، سطح سمندر، پہاڑ، سردی گرمی اور موسمی تغیرات کس طرح کارکردگی پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ موسم، ماحول سے کیسے اور کتنے عرصے میں ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی ہے؟ دوڑ کے درمیان کون سا اور کتنا مشروب کارکردگی میں مدد کرتا ہے۔ شکر ملا مشروب کیا نقصان دیتا ہے؟ اتھلیٹس کو دوڑ سے قبل کیا، کتنا کھانا چاہیے؟ وٹامنز، لحمیات، معدنیات کا استعمال جسمانی طاقت اور کارکردگی پر کیا اثر ڈالتا ہے؟ دوڑ کے بعد جسمانی طاقت کی بحالی کیسے ممکن ہے؟ کھلاڑی کی تاریخ پیدائش معلوم ہو تو پہلے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کس دن اس کی کارکردگی اچھی یا غیر معیاری ہوگی۔

سخت جسمانی مشقت اور دوڑ کے دوران چوٹ سے بچاؤ، زخمی ہو جائیں تو علاج کیسے کرنا چاہیے؟ پاؤں کی حفاظت، مساج، جوتا کیسا اور کب خریدنا چاہیے؟ دوڑ کے دوران نفسیاتی حربہ استعمال کرنے کی اہمیت کیا ہے؟ خواتین اتھلیٹس کی کارکردگی ایک بچے کی پیدائش کے بعد کیوں بہتر ہو جاتی ہے؟ غرضیکہ اس کتاب کے مطالعے سے ہر کھلاڑی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کتاب کی زبان دلکش، عام فہم ہے۔ اُردو زبان میں آج تک ایسی کتاب نظر سے نہیں گزری جس میں ان تمام موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہو۔ بلاشبہ اس کتاب کو میراتھن رنگ کی بائبل کہا جاسکتا ہے۔ ہر کوچ اور کھلاڑی کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ہر سکول اور کالج کی لائبریری میں یہ کتاب مہیا ہونی چاہیے۔ اس کتاب کے مطالعے سے جو فائدے حاصل ہو سکتے ہیں ان کے مقابلے میں اس کی قیمت بہت کم ہے۔

ملنے کا پتا: 1-C-3-324، ٹاؤن شپ لاہور

فون: 0301-4686124

قیمت: ۸۵۰/روپے

تبصرہ نگار: محمد زبیر (لیکچرار فزیکل ایجوکیشن)

☆☆

آس نے دل کا ساتھ نہ چھوڑا

یہ ۲ سال کے دورانیہ میں قانتہ رابعہ کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے جو زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری اور افسانہ قاری کے دل پر زیادہ گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ قانتہ رابعہ ایک بہت بڑا کام کر رہی ہیں، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

بامقصد اور تعمیری تحریریں لکھنا اور اس طرح لکھنا کہ پڑھنے والے کے قلب و روح کو متاثر کریں، ایک بہت مشکل کام ہے۔ رابعہ صاحبہ نے اپنی نیت اور جذبہ 'حرفِ ابتدا' میں ہی ظاہر کردیا ہے۔ لکھتی ہیں "حسرت اور خواہش بہت بڑی ہے لیکن اپنے رب کے حضور کہہ دینے میں کیا حرج ہے (وہ تو ویسے بھی دلوں کے بھید جانتا ہے) کہ مجھے امید ہے میرا اللہ میرا ایک لکھا ہوا لفظ قبول کرلے...... تو یہ دنیا و مافیہا کی نعمتوں سے افضل ہوگا۔ قلم کی قسم شاید اسی لیے کھائی کہ قلم کا لکھا موثر اور پائیدار ہوتا ہے۔

ملنے کا پتا: ادارہ مطبوعات سلیمانی

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر: 042:37232788

قیمت ۱۸۰/روپے

☆☆

شرارت

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی زمینوں پر مرزا عاصی نے مزاحیہ نظمیں لکھی ہیں۔ کتاب کے شروع میں ادارے کی طرف سے یہ اچھا مشورہ دیا گیا ہے کہ طنز و مزاح کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں، جو معاشرتی اور سماجی شعور رکھتے ہوں۔ ہم یہی سن کر پڑھتے رہے، اب آپ بھی یہی سمجھتے ہوئے کتاب خرید کر اپنے پاس رکھ لیں......سوچ لیں......فی زمانہ ۲۰۰/روپے میں اپنا شمار باشعور افراد میں کرانا کچھ مہنگا سودا نہیں ہے۔ ایک قطعہ آپ بھی پڑھیں ۔

ہیں اِک ادیب فحش نگاری میں باکمال
رکھتے نہیں تمیز حرام و حلال میں
پھر اِس پہ عذر یہ ہے کہ اُن کا نہیں قصور
"آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں"

ملنے کا پتا: ویلکم بک پورٹ، اُردو بازار، کراچی

فون نمبر 021-32633151

قیمت ۲۰۰/روپے

شمشیر و سناں اوّل

کہا جاتا ہے کہ جو قوم اپنی تاریخ بھلا دیتی ہے، اُس قوم کا جغرافیہ اُس کو بھلا دیتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو اپنی تاریخ سے آگاہ کیا جائے، اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کی حقیقت سے روشناس کرایا جائے۔ ہمارے سلیبس سے تاریخ کا مضمون تقریباً خارج کردیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے بچوں کو اپنے درخشاں ماضی کے بارے میں بنیادی معلومات بھی نہیں ہیں۔

خواجہ امتیاز احمد صاحب نے عظیم سپہ سالاروں کی ناقابلِ فراموش داستانیں لکھ کر ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ، سلطان محمود غزنوی، سلطان بایزید یلدرم، موسیٰ بن نصیر۔ یوسف بن تاشفین، خیرالدین بار بروسا۔ سلطان نور الدین زنگی، سلطان صلاح الدین ایوبی، غرض ایسے ۲۱/سپہ سالاروں کا مختصر مگر جامع تعارف کرایا گیا ہے۔

ناشر: ہارون شہید اکیڈمی، پیپلز کالونی، گوجرانوالہ

قیمت مذکور نہیں

■

WWW.PAKSOCIETY.COM

دلچسپی، معلومات
اور کچھ کرگزرنے کا جذبہ،
یہی ہے اِس
کوئز کا اصل مقصد

یہی ہے قصہ کوئز

انچارج کوئز:
غلام سجاد

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اُکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کرگزرنے کا جذبہ، اس کی ۳ بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بہ غور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے ۲ سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوادیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو "اردو ڈائجسٹ" کے ۶ شماروں کی انعامی و اعزازی ترسیل کے علاوہ بھی شاہ کی شاعری کی ۲ خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور**

ماہ اکتوبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱۔ (الف) داغ (ب) غزل
قصہ کوئز ۲۔ (الف) ارسطو (ب) لائیسیم (Lycium)
قصہ کوئز ۳۔ (الف) ایڈیسن (ب) امریکا

درست جوابات دینے والوں کے نام

گلزار عثمانی (لاہور)، اُلفت حسین (شیخوپورہ)، اقبال احمد خان (کراچی)، عنبرین (لاہور)، شعیب شاہد (لاہور)
فضل رحیم (پشاور)، محمد عمیر مغل (لاہور)، محمد نعمان شفیع (اسلام آباد)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ خان (لاہور)
عشرت جہان (لاہور)، محمد خلیل چودھری (جہلم)، محمد ارشد علی (کراچی)، محمد یٰسین (حیدرآباد)
شیراز ملک (راولپنڈی)، عبدالسلیم (حیدرآباد)، مرزا مسرت بیگ (حیدرآباد)، ناعمہ تحریم (کراچی)
طوبیٰ ایمن (آزادکشمیر)، ناجیہ ملک (آزادکشمیر)، محمد عرفان (لاہور)، راشد علی (لاہور)، حافظ محمد عبداللہ (ملتان)
حافظ احمد ہاشمی (لاہور)، ڈاکٹر سید علی سلمان (کراچی)، نیئر رحمان (پشاور)، اقبال بانو (ڈیرہ اسمٰعیل خان)
حافظ اشفاق احمد (ڈیرہ اسمٰعیل خان)، عقیل احمد خان (کراچی)، مرزا فرحال بیگ (حیدرآباد)
طٰہٰ یٰسین (حیدرآباد)، شیر نواز گل (پشاور)، غلام حسین قادری (حیدرآباد)، ملک جاوید محمد خان (چھچھ)
محمد یوسف قریشی (حیدرآباد)، علی رضوی (کراچی)، سلطان محمود (کھاریاں)، محمد ذوالقرنین (کوئٹہ)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

۱۔ طوبیٰ ایمن، معرفت احمد عبید یاسر (بالا آزاد کشمیر)
۲۔ اقبال بانو (ڈیرہ اسمٰعیل خان)

آپ کو ۶ ماہ تک اُردو ڈائجسٹ کے شمارے اور وصی شاہ کی کتب بطور تحفہ ملیں گی

آپ ہمیں جوابات اپنے نام اور پتے کے ساتھ editor@urdu-digest.com پر بھی بھجوا سکتے ہیں

قصہ کوئز/۱

دنیائے اسلام کا نامور طبیب، شہرہ آفاق سائنسدان، جامع العلوم فلسفی، ریاضی دان اور ماہرِ فلکیات، ملقب بہ شیخ الرئیس، بخارا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ ۶ سال کی عمر میں اُس نے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ اُس کا باپ اسمٰعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی مسلک کی تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہا، لیکن ہونہار بروا نے ۱۰ برس میں قرآن، فقہ اور ادب کا مطالعہ کرلیا اور پھر دیگر علوم کی طرف مائل ہوا۔ ابوعبداللہ الناتلی سے اس نے منطق، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد خود ہی طب اور طبیعیات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اُس نے فلسفہ، منطق، ریاضی اور سائنس کے موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ علمِ طب میں اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب یہ علم نہیں تھا تو بقراط نے جنم دیا، جب یہ مرگیا تو جالینوس نے حیاتِ نو بخشی، جب یہ بکھر گیا تو الرازی نے سمیٹا لیکن یہ ناقص تھا تو اس عظیم شخص نے اس کی تکمیل کی۔

(الف) اس عظیم شخصیت کا نام بتائیں؟

(ب) علم طب کے حوالے سے لکھی گئی اُس کی کسی کتاب کا نام بتائیں؟

قصہ کوئز/۲

وہ ایک امریکن خلاباز پائلٹ اور امریکن یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ ۵ سال کی عمر میں اُس نے اپنا پہلا ہوائی [سفر] ۲۰ جولائی ۱۹۳۶ء کو کیا۔ خلاباز بننے سے پہلے وہ امریکن نیوی میں آفیسر تھا اور اُس نے کوریا کی جنگ میں جنوری ۱۹۵۱ء میں حصہ لیا۔ جنگ کے بعد اُس نے پرڈیو یونیورسٹی (Purdue University) سے ۱۹۵[۵]ء میں ایرونائیکل انجینئرنگ میں گریجوایشن کی۔ وہ اپنے خاندان کا دوسرا آدمی تھا جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے کالج تک پہنچا۔ اُس نے اپنا پہلا خلائی سفر بطور کمانڈ پائلٹ کیا۔ وہ ناسا کا پہلا سول خلاباز تھا۔ ۱۹۷۸ء میں اُسے امریکی صدر رچرڈ نکسن نے صدارتی تمغہ برائے آزادی سے نوازا۔ اُس نے ۸۲ سال کی عمر پائی اور ۲۵ اگست ۲۰۱۲ء میں وفات پائی۔

(الف) اس خلاباز کا نام بتائیں؟

(ب) اس نے اپنا پہلا خلائی سفر جس جہاز کے ذریعے کیا اُس کا نام بتائیں؟

قصہ کوئز/۳

۱۸ جولائی ۱۹۱۸ء کو پیدا ہونے والا یہ شخص جنوبی افریقہ کا پہلا جمہوری صدر بنا۔ ۱۹۶۲ء میں اُسے سفید فام اقلیت کے خلاف کام کرنے پر مختلف الزامات کی وجہ سے گرفتار کیا گیا اور عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ ان کو نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کی وجہ سے پوری دنیا میں شہرت حاصل ہوئی۔ ۵ اگست ۱۹۶۲ء میں اسے ۱۷ ماہ تک مفرور رہنے کے بعد گرفتار کرلیا گیا اور جوہانس برگ قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ ۱۱ فروری ۱۹۹۰ء میں ۲۷ سال بعد اُسے رہا کر دیا گیا۔ ۲۵۰ سے زائد انعامات وصول کیے اور ۱۹۹۳ء میں نوبل انعام بھی حاصل کیا۔ اپنے خاندان کا پہلا شخص تھا جس نے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سکول کا رخ کیا۔ اس نے ۳ شادیاں کیں۔ اس کی اولاد میں ۴ لڑکیاں اور ۲ لڑکے شامل ہیں۔ اسے اپنی اہلیہ کی بے وفائی کا دکھ سہنا پڑا۔ اس نے اپنی مقبولیت کے دنوں میں ملک کی صدارت سے دست بردار ہوکر ایک انوکھی مثال قائم کرکے دنیا بھر میں عزت پائی۔

(الف) ہم کس شخصیت کا ذکر کر رہے ہیں؟

(ب) اس شخصیت کی سیاسی پارٹی کا نام بتائیں؟

انعامات کے لیے تعاون

خوبصورت اور معیاری کتب
منشورات ہیڈ آفس: منصورہ، ملتان روڈ لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

مزدور کے اوقات اور زندگی جتنی پاکستان میں تلخ ہے
اتنی شاید ہی دھرتی کے کسی کونے پر ہو

ایک انچ کا آبلہ 35 ہزار ڈالر

وصی شاہ

ایرینا

جیڈی ساؤتھ کیرولینا میں شرٹس کے بٹن بنانے والی فیکٹری میں ملازم تھی۔ اُس دن بھی وہ معمول کے مطابق فیکٹری گئی اور اپنا کام شروع کیا۔ کام کے دوران ایرینا جیڈی کے داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی معمولی سی جل گئی۔ ایرینا کی انگلی کی پور پر ایک چھوٹا سا آبلہ پڑ گیا۔ جس کی وجہ سے ایرینا جو ایک اور آفس میں کمپیوٹر آپریٹر کے طور پر کام کرتی تھی اسے وہاں سے چھٹی کرنا پڑی۔ اس آبلے کی وجہ سے ایرینا جیڈی کو ٹائپ کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ اسی ایک دن کی چھٹی کو بنیاد بنا کر اس آفس کے مالک نے ایرینا کو نوکری سے برخاست کر دیا۔ اس چھوٹے سے آفس کے ساتھ ایرینا کا کنٹریکٹ اس نوعیت کا تھا کہ ایرینا جواب میں قانونی طور پر کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اچانک ایک نوکری چلے جانے

کی وجہ سے ایرینا پر مالی بوجھ پڑ گیا۔ ایرینا جیڈی جو اپنے ۷ اور ۸ رسال کے ۲ ربچوں کی واحد کفیل تھی۔ اس مالی دباؤ کی وجہ سے اس ماہ اپنے ایک کمرے کے اپارٹمنٹ کا کرایہ بھی نہیں دے سکی۔ جس کے باعث اپارٹمنٹ کے مالک نے ایرینا کو سخت برا بھلا کہا۔ ایرینا کو اپنے داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کی پور پر پڑنے والے آبلے کے باعث اس ایک معمولی، کم از کم پاکستان جیسے معاشرے کے لیے انتہائی معمولی واقعے (پاکستان میں تو کوئی اسے حادثہ بھی تسلیم نہیں کرے گا) کے باعث شدید ذہنی اذیت اور کوفت سے دوچار ہونا پڑا۔ یہی ایک انچ کا معمولی آبلہ اس کی دوسری نوکری جانے کا باعث بھی بنا جس کی وجہ سے اس کی چھوٹی سی فیملی پر شدید مالی دباؤ آیا۔ ایرینا کو اس کی ساتھی ورکر نے یہ احساس دلایا کہ یہ حادثہ بٹن بنانے والی فیکٹری جس میں وہ کام کرتی ہیں، میں ان نظام میں خرابی کے باعث پیش آیا۔ قصہ مختصر ایرینا نے بٹن

نے والی فیکٹری اور اس کے مالک پر کیس کر دیا۔ ستان جیسے ملک میں اگر یہ واقعہ پیش آیا ہوتا اور کسی کی ی کی پور پر ایک انچ تو کیا پورے وجود پر بھی آبلے پڑ ے ہوتے اور اگر ورکر یہی مقدمہ کرنے کا فیصلہ کرتا جو رینا نے فیکٹری مالک کے خلاف کیا، تو ایسا سوچنے والے ے اہل خانہ سے لے کر وکیل تک ہر شخص اس کا تمسخر اڑاتا عدالتوں کے چکر لگاتے ہوئے بے چارے کے پیروں ں آبلے پڑ جاتے اور انصاف تو دور کی بات ہے کوئی نتیجہ ی حاصل نہ ہوتا۔ مگر ایرینا جیڈی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا ونکہ وہ پاکستان میں نہیں امریکا میں رہ رہی تھی۔ ایک ے ملک کی شہری ہے جو اپنی خارجہ پالیسی میں چاہے کتنا سخ اور مکروہ چہرہ کیوں نہ رکھتا ہو مگر اپنے پاسپورٹ ڈر کے لیے رحمدل ہے۔ اپنے شہری کی اندرون ملک بیرون ملک حفاظت کو اپنی انا کا مسئلہ سمجھتا ہے۔ نہ ف جان و مال کی حفاظت بلکہ اپنے شہری کے نفسیاتی ن کے معاملے میں بھی حساس ہے کیونکہ اذیت، یف صرف جسمانی نہیں ہوا کرتی۔ دلی، روحانی اور باقی بھی ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی قوانین مطابق صرف جسم جلنے پر نہیں "دل" "دکھنے" پر بھی اپنا لے کر، جس نے روحانی اذیت دی ہو، ذہنی کوفت کا کیا ہو، اس کے خلاف بھی عدالت میں جایا جاسکتا ہے ریکی عدالت ہر سال کسی وجہ سے بھی ذہنی اذیت کے ہزاروں شہریوں کو انصاف دلاتی ہے۔

ایرینا جیڈی کا کیس ۴۹ رون چلا۔ ایرینا کا وکیل یہ کرنے میں کامیاب رہا کہ ایرینا کی انگلی پر پڑنے یک ننھا سا آبلہ فیکٹری کے نظام میں خرابی کے باعث ہے اور اس فیکٹری میں اس سے بھی بڑا حادثہ پیش آ ہے اور ایرینا کو اس ایک ننھے سے آبلے کے باعث، ذہنی اذیت اور کوفت سے گزرنا پڑا اور نوکری جانے باعث مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ حتیٰ کہ وکیل نے ں کے دنوں میں جو ایرینا نے جھنجھلاہٹ میں ایک اپنے بچے کو مارا، اس کا ذمے دار بھی اس ننھے سے

امریکی قوانین کے مطابق
جس نے روحانی اذیت دی
ہو، ذہنی کوفت کا شکار کیا ہو
اس کے خلاف بھی عدالت
میں جایا جاسکتا ہے

آبلے کو ٹھہرایا جو فیکٹری کے حفاظتی انتظام میں خرابی کے باعث پیش آیا تھا۔ گویا بچے کو پیٹنے کا بھی اصل ذمے دار حفاظتی انتظام کی خامی کو قرار دیا۔

ایرینا جیڈی کے اس کیس میں امریکی عدالت کا فیصلہ انسانی احساس کا احساس کرنے کی معراج ہے۔ عدالت نے فیکٹری مالک کو ایرینا جیڈی کو ۳۵ رہزار ڈالر ادا کرنے کا حکم دیا اور فیکٹری مالک کو حکم دیا کہ وہ فوراً فیکٹری بند کرے۔ حفاظتی انتظامات کے حوالے سے دوبارہ سرٹیفکیٹس حاصل کرے اور اس دوران جتنا عرصہ فیکٹری بند رہے گی فیکٹری کے مالک کو فیکٹری میں کام کرنے والے ۳۵۰ رورکرز کی تنخواہیں بھی ادا کرنا ہوں گی۔ عدالتی فیصلے پر عمل نہ کرنے کی صورت میں فیکٹری مالک کو مزید بھاری جرمانہ اور قید کی سزا بھگتنا ہوگی۔ یہ ایک ایسے معاشرے کا ذکر ہے جسے ہم کفار کا معاشرہ کہتے ہیں۔ اب آپ پاکستان آجائیں، جو اسلام کا قلعہ کہلاتا ہے۔ اسلامی فلسفے کے مطابق موذی سے موذی جانور کو بھی جلا کر مارنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے مگر یہاں ہر دوسرے چوتھے روز درجنوں، بیسیوں اور اب سیکڑوں افراد زندہ جلا دیے جاتے ہیں۔ جی ہاں زندہ جلتے نہیں ہیں جلا دیے جاتے ہیں۔ حادثہ اس وقت تک حادثہ ہوا کرتا ہے جب تک اس میں انسانی غفلت، کوتاہی، کرپشن اور بددیانتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

نمک دان

مشفق خواجہ صاحب کے پاس ایک شاعر اپنا دیوان لے کر آئے اور اس پر اُن کی رائے لکھوانے کی خواہش کی۔ خواجہ صاحب نے معذرت کی تو بولے ”مجھے اندازہ تھا آپ مصروف ہیں، اس لیے کچھ سطریں لکھ لایا ہوں، آپ اس پر دستخط کر دیجیے۔“ یہ سطریں کیا تھیں، کئی صفحات پر پھیلا ہوا مضمون تھا اور شاعر نے اپنا موازنہ غالب سے کیا تھا اس طرح کہ غالب، مغلوب نظر آتے تھے۔ خواجہ صاحب نے دستخط کرنے سے انکار کیا اور کہا ”میں دستخط نہیں کر سکتا۔“ انکار سن کر شاعر نے کہا ”کوئی بات نہیں، آپ دستخط نہیں کر سکتے تو انگوٹھا ہی لگا دیجیے۔“

(فرحان کلیم، ہڑپہ)

شامل نہ ہو۔ جب حادثات پیش آنے کی اصل وجہ کرپشن، قوانین سے انحراف حتیٰ کہ انسانی جان کے حوالے سے لاپروائی بھی ہو تو وہ ”حادثہ“ نہیں ”جرم“ ہوا کرتا ہے۔ قدرتی اموات نہیں ”قتل“ ہوا کرتے ہیں

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

یہ مصرع ہے تو آفاقی نوعیت کا مگر مزدور کے اوقات اور زندگی جتنی پاکستان میں تلخ ہے اتنی شاید ہی دھرتی کے کسی کونے پر ہو۔

جن قوانین کے تحت مزدور، کارکن اور ورکر کی عزت نفس، جان اور مال و حقوق کا تحفظ ہوتا ہے ان قوانین کی ابتدا یورپ سے ہوتی ہے۔ بعدازاں امریکا اور دوسرے ممالک نے ۱۹/ویں صدی کی پہلی دہائی میں ان قوانین پر سختی سے عمل شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان ممالک میں انگلی کی پور پر پڑے ہوئے ایک انچ آبلے کی قیمت ۳۵/ہزار ڈالر یعنی تقریباً ۳۵/لاکھ پاکستانی روپے جبکہ پاکستان میں پورا وجود آبلوں سے بھر جائے، جسم جل کر کوئلہ ہو جائیں تو اس کی قیمت ۵/لاکھ روپے، صرف ۵/لاکھ پاکستانی روپے..... وہ بھی بطور خیرات۔

مزدور کے خون پسینے سے کروڑوں ڈالر یعنی اربوں پاکستانی روپے کمانے کے بعد اگر فیکٹری کے ۳۰۰/مزدور بھی جل کر کوئلہ ہو جائیں تو ان کی زیادہ سے زیادہ قیمت ہے صرف ۱۵/کروڑ روپے۔ اپنا ہی ایک شعر یاد آ گیا۔

جو آسمان سے زمیں پر عذاب اُترا ہے
کسی سوال کا لوگو جواب اُترا ہے

مزدور کے حق میں یہاں نہ کوئی قانون بنے گا نہ اس قانون پر عمل ہوگا کیونکہ صدر آصف علی زرداری، قائم علی شاہ سے لے کر نواز شریف، شہباز شریف، اسفندیار ولی، حنا ربانی، جہانگیر ترین تک یہاں سب ایسی ہی کئی فیکٹریوں اور صنعتوں کے مالک ہیں۔ ان میں سے کوئی مزدور نہیں اس لیے یہ سارے قوانین ہمیشہ وہی بنائیں گے جو ان کو سوٹ کرتے ہیں۔ جس میں مزدور کے پسینے سے اربوں کما کر انہیں مزدور کی لاش کی قیمت صرف ۵/لاکھ روپے ادا کرنا پڑے۔ ■

جب حادثات پیش آنے
کی اصل وجہ کرپشن، قوانین
سے انحراف حتیٰ کہ انسانی جان
کے حوالے سے لاپروائی بھی
ہو تو وہ ”حادثہ“ نہیں
”جرم“ ہوا کرتا ہے

وزن کم کریں مگر صحت نہیں

ہمارے کھانے غذائیت کے بجائے کیلوریز کا گھر کیوں بن گئے ہیں؟

نوشین ناز
ماہر غذائیات/نیوٹریشنسٹ
0301-4585405

آپ کو جب ۲/ چیزیں پیش کی گئی تھیں۔ شراب اور دودھ تو آپؐ نے دودھ کا انتخاب کیا تھا۔ ہمارے نبی پاکؐ کی زندگی سادہ ترین تھی۔ آج ہم اُس نبی کی اُمت ہو کر بہت Complicated زندگی جی رہے ہیں۔ ذرا آسان لفظوں میں مشکل زندگی مشکلات سے بھرپور۔

ہمارے کھانے جو پہلے سادہ ہوتے تھے۔ اب فوڈ چینلز کی وجہ سے اپنی ہیئت تو بدل ہی چکے اور اپنی ساری غذائیت بھی کھوتے جا رہے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے گھروں میں پلاؤ، مٹن قورمہ، فرنی مہمانوں کے آنے پر بنتی تھی لیکن اب یہ بہت عام سی بات ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم اپنے کھانے کو خاص بناتے بناتے اس کی خاصیت سے اُسے محروم کر رہے ہیں۔

ہمارے چاول جانے کس کس ریسپی کے ہاتھوں میں چڑھ کر کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ عام سا چکن سبزی مختلف ریسپیز کے ہاتھوں چڑھ کر کیلوری ہی کیلوری بن کر رہ جاتی ہے۔

میرے پاس ایک مریضہ آئیں۔ کہنے لگیں مجھے عید کے دنوں میں چھٹی دیں مجھے ڈٹ کر گوشت کھانا ہے۔ مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ ان دنوں پلانز پر گوشت کھانے میں کون سی بُرائی ہے اور آپ گوشت کھانے سے موٹے نہیں ہوتے۔ گوشت کو ہم پکاتے ایسے طریقوں سے ہیں کہ وہ اپنی غذائیت ہمیں دینے کے بجائے بس ایک High Calorie فوڈ بن کر رہ جاتا ہے۔ سادہ پکائیں، سادہ کھائیں۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوگا کہ آپ کو اپنے پسندیدہ کھانوں سے دور رہنا پڑے۔

میرے نزدیک کامیابی یہ نہیں کہ آپ کا وزن کم ہو

WWW.PAKSOCIETY.COM

جائے بلکہ کامیابی کا مطلب مجموعی طور پر بہتر صحت اور بھرپور زندگی ہے۔ آپ محض اپنے وزن میں ۱۰ر سے ۱۵ر پاؤنڈ کی کمی کر کے بھی اپنی صحت کو قابلِ ذکر حد تک بہتر بنا سکتے ہیں۔

میں نے ایک ایسی عورت کے ساتھ کام کیا ہے جو اپنے وزن میں صرف ۱۰ر پاؤنڈ کی کمی کر کے بہت خوش تھی۔ وہ روزانہ ورزش کرتی کیونکہ وہ اپنی گرم جوشی اور ولولے کو زندہ رکھتی تھی۔ مثالی وزن حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا کوئی خیالی تصور یا خواب نہیں۔ البتہ یہ عمل محنت مانگتا ہے۔

ہر وقت وزن نہ ناپیں

ہر وقت وزن ناپنے کے بجائے اپنی صحت پر توجہ دینے والے افراد اپنے وزن کو قابو میں رکھتے ہیں۔ یہ بات برمنگھم اور بوسٹن کے خواتین ہسپتال کی تحقیق سے سامنے آئی ہے۔

میرے پاس ایک خاتون آئیں جن کا وزن ۱۲۰ر کلوگرام تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ وہ میرے پاس وزن کم کرنے کے بجائے اپنی تھکن اور جسم درد کا مسئلہ لائی تھیں۔

ٹیسٹ کروانے پر اندازہ ہوا کہ اُن کے خون میں ہیموگلوبن (HB) کی سطح بے حد کم ہے۔ جگر کا فعل درست نہیں تھا اور خون نہ بننے اور خون کی کمی کی وجہ سے اُن کا وزن بڑھ رہا تھا۔

میں نے ساری توجہ اُن کی Root Cause پر دی۔ اب الحمدللہ وہ ۱۰۵ر کلوگرام پر ہیں۔ ۱۵ر کلوگرام وزن بھی کم ہوا اور ساتھ میں ہیموگلوبن کی سطح بھی کافی بہتر ہوئی۔

جب انھوں نے بتایا کہ اب وہ بہت آسانی سے گھر کے کام انجام دیتی اور نماز ادا کرتی ہیں تو اُن کے چہرے پر بچوں جیسی خوشی اور چمک تھی۔ انھوں نے اپنا وزن اس لیے بھی جلدی کم کیا کہ اُن کو اپنی صحت کی زیادہ فکر تھی۔ اسی لیے تو میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ وزن کم کریں صحت نہیں۔

اب آیئے...... آپ کے منتخب خطوط کی طرف۔

پیٹ کم کرنے کا طریقہ بتائیے

سوال: السلام علیکم! نوشین آپی! میں علی ہوں۔ میری عمر ۲۴ر سال ہے۔ وزن ۶۴ر کلوگرام ہے اور قد ۵ر فٹ ۴ر انچ ہے۔ میرا پیٹ بہت بڑھ گیا ہے۔ پلیز مجھے پیٹ کم کرنے کا طریقہ بتائیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آپ کا بھائی علی۔

جواب: علی اپنی غذا میں دودھ کا استعمال کریں۔ دودھ سکمڈ (کریم کے بغیر) ہونا چاہیے۔ دوسرا پورے پیٹ کی ورزش کریں۔ پیٹ کے تینوں حصوں کی ورزش پر توجہ دیں۔ اگر آپ ایسا کرنے کے بجائے کسی خاص حصے پر ہی توجہ دیں گے تو اپنا ہدف حاصل نہیں کر پائیں گے۔

بالائی پیٹ کے لیے کرنچ:

کمر کے بل فرش پر لیٹ جائیں۔ گھٹنے مڑے ہوئے ہوں۔ پاؤں سیدھے فرش پر جمے ہوں۔ بازو پہلو کے ساتھ رکھے ہوں۔ اب اپنے سر، کندھوں اور کمر کو اوپر اٹھائیں اور دونوں ہاتھوں کو آگے کی طرف گھٹنوں کے اوپر لے کر جائیں۔ یہاں تک کہ انگلیوں کی پوریں گھٹنوں کو چھونے لگیں۔ ۵ سے ۱۰ر سیکنڈ تک اسی حالت میں رکے رہیں۔ اس کے بعد پہلی والی پوزیشن میں واپس آئیں اور عمل کو دہرائیں۔ اس عمل کے دوران ٹھوڑی کو اپنے سینے سے اس طرح دور رکھیں جیسے آپ نے ٹھوڑی کے نیچے ٹینس بال رکھی ہو۔

پہلو کے لیے کرنچ کریں:

کمر کے بل فرش پر لیٹ جائیں۔ گھٹنے موڑ لیں اور پیروں کو فرش پر جما دیں۔ ہاتھوں کو پیچھے کی طرف موڑ کے سر کے پچھلے حصے کے نیچے رکھیں کہ سر کو تھوڑی سپورٹ ملے۔ انگلیاں سر کو نہیں چھونی چاہئیں۔ سر کو آگے بھی نہیں کرنا۔ کہنیوں کو باہر کی طرف رکھیں۔

اب ایک سائیڈ کی کہنی کو اٹھاتے ہوئے ترچھا ہو کر دوسری سائیڈ پر لے کر آئیں جیسا کہ تصویر (بی) میں دکھایا گیا ہے۔ کہنیوں کو کانوں کے متوازی رکھیں کہ سائیڈ کو ہاتھوں کے زور سے اوپر مت اُٹھائیں۔ سائیڈ کے پٹھوں کے زور سے اُٹھائیں۔ چند سیکنڈ کے لیے اس پوزیشن میں رہیں۔ اس کے بعد واپس پہلی پوزیشن میں آ کر اس عمل کو دہرائیں۔ اس ورزش کو کرنے سے پہلے ۱۰، ۱۵ر منٹ وارم اپ ہوں۔ اس کے علاوہ Fizzy Drinks اور کافی کا استعمال کم کریں۔ نماز میں رکوع اچھے سے ادا کریں۔

پیٹ کم ہونے میں نہیں آتا

میری بے حد واجب الاحترام محترمہ و مکرمہ باجی نوشین ناز صاحبہ! السلام علیم رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

امید ہے کہ آپ مع اہلِ خانہ خیریت سے ہوں گی۔ پچھلے ۶، ۷ر ماہ سے آپ کا مضمون ''اردو ڈائجسٹ'' میں پڑھ رہا ہوں، بے حد پسند آیا۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کر کے آپ ڈھیروں دعائیں سمیٹنے کے ساتھ ساتھ اپنی عاقبت بھی سنوار رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے آمین۔

نام سید عبدالقدیر۔ عمر ساڑھے پچیس سال۔ قد ۵ر فٹ ۸ر انچ۔ وزن ۹۴ر کلو۔

عرض یہ ہے کہ ۲۲ر سال کی عمر میں میرا پیٹ نکلنا شروع ہوا۔ ۹۴ر کلو وزن میں ۵۰ر کلو وزن پیٹ کا ہے۔ میرا پیٹ بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ باقی جسم نارمل ہے۔ ٹانگیں، بازو، باقی جسم ۱۶، ۱۷ر سال کے نوجوان کی طرح ہے، صرف پیٹ بڑھا ہوا ہے۔ میری روزانہ کی روٹین یہ ہے کہ صبح ناشتا ایک خشک چپاتی مکھن سے چپڑی، چائے کے ساتھ۔ دوپہر کو ایک خشک چپاتی سالن کے ساتھ، شام ایک خشک چپاتی سالن کے ساتھ۔ مہینا میں ایک مرتبہ چاول کھا لیتا ہوں۔ جیب اجازت دے تو کبھی کبھار کوئی موسمی فروٹ کھا لیتا ہوں۔ چائے صبح ایک وقت۔ دودھ نہیں پیتا۔ عرض یہ ہے ۲۰۰۹ء میں پیٹ بڑھا۔ اپریل ۲۰۰۹ء میں جانڈس (پیلا یرقان) ہوا۔ پیٹ اپنی طبعی حالت میں آ گیا۔ پھر اکتوبر ۲۰۰۹ء میں پیٹ دوبارہ بڑھنا شروع ہوا اور آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی۔ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' والا معاملہ ہوا۔ میں ۱۰، ۱۰ر کلومیٹر روزانہ تیز چلتا رہا اب بھی پیدل ہی چلتا ہوں سیڑھیاں چڑھتا ہوں۔ جوں جوں پیدل چلتا ہوں پیٹ مزید باہر نکلتا آ رہا ہے۔ جم جوائن کیا، خوب ورزش کی ایک انچ بھی فرق نہ پڑا۔ پیٹ کم کرنے کے لیے حکیم صاحب اور ہومیوپیتھ سے دوا بھی لی۔ لیکن ایک ماہ سے ۴ر ماہ تک علاج کرانے پر رائی برابر فائدہ نہ ہوا۔ بھوک لگتی اور صحیح آتی ہے۔ بچپن سے ۵ر وقت کا نمازی ہوں۔ گھر سے دور کی مسجد میں نماز کے لیے جاتا ہوں لیکن پیٹ کم نہیں ہوا۔ میں نے پرہیز بھی کیا، ورزش بھی کی، دوا بھی لی لیکن پیٹ کم نہ ہوا۔ اس وقت میرا پیٹ کا مسئلہ ہے۔ آپ جہاں سب کی مدد کر رہی ہیں خدارا میری بھی مدد فرمائیں۔ میں سخت پریشانی میں مبتلا ہوں۔ ایسی شفقت بھری مدد فرمائیں کہ پیٹ اپنی طبعی حالت میں آ جائے۔ مجھے صرف پیٹ کم کرنا ہے صرف پیٹ کا وزن کم کرنا ہے جسم کا وزن کم نہیں کرنا۔ آپ کا مجھ حقیر پر احسانِ عظیم ہوگا جسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ کے لیے آپ کے اہلِ خانہ کے لیے ہمیشہ دعا گو رہوں گا۔ جوابی لفافہ بھیج رہا ہوں براہِ راست جواب دے سکیں تو خاص عنایت ہوگی۔ مجھے آپ کے پُرخلوص ہمدردانہ جواب کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ اگر کوئی غلطی ہو تو معاف فرما دیں۔ ڈھیروں دعائیں۔

جواب: بھائی! ایسا کوئی Magic نہیں ہے کہ صرف پیٹ کم ہو۔ اس کے لیے سارے جسم کا وزن کم کرنا ہوگا اور پیٹ کے لیے ورزش کرنی ہوگی تاکہ مسلز جو لٹک گئے ہیں مضبوط ہو جائیں۔

میں آپ کو ایک چھوٹی سی بات شیئر کرتی ہوں۔ بہت بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ ایک صحن میں بہو آٹا گوندھ کر اُٹھ کر اندر جاتی ہے اور ایسے میں دیوار پر بیٹھا کوا آٹا

WWW.PAKSOCIETY.COM

چونچ میں بھر کر اُڑتا ہے۔ بہو باہر نکل کر کہتی ہے کہ اگر میرے باپ، بھائیوں کی زمین کا اناج ہوتا تو دیکھتی کیسے تم لے کر جا سکتے۔

یہ بات صحن میں بیٹھے سسر اور شوہر کو بُری لگتی ہے کہ ایسا کیا ہے اُس کے باپ اور بھائی کی زمین میں جو اُن کی زمین میں نہیں ہے۔ پھر طے ہوا کہ سسر شوہر زمین تیار کریں گے اور بہو بتائے گی کہ زمین اُس کے باپ بھائی جیسی تیار ہوئی کہ نہیں۔

سسر اور شوہر زمین تیار کرتے ہیں۔ بہو آتی ہے اور اپنے ہاتھ میں پکڑا مٹکا زمین پر گراتی ہے تو مٹکا ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ منہ چڑھا کر کہتی ہے کہ نہیں وہ بات نہیں جو میرے باپ بھائی کی تیار کردہ زمین میں ہے۔ اسی طرح دوسری بار زمین تیار ہونے پر آتی ہے اور مٹکا گرانے پر مٹکا پھر ٹوٹ جاتا ہے اور وہ منہ چڑھا کر چلی جاتی ہے۔

تیسری بار آتی ہے تو مٹکا زمین میں دھنس جاتا ہے اور وہ کہتی ہے کہ ہاں اب ڈالو زمین میں بیج۔ سسر شوہر کی فصل اس بار بہت زیادہ ہوتی ہے بہت نفع ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک دن وہ آٹا گوندھ کر اندر جاتی ہے تو دیوار پر بیٹھا کوا آٹے کی پرات سے آٹا لے جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن آٹا اُس کی چونچ میں پھنس جاتا ہے اور آٹا لے جا نہیں پاتا۔

تو بھائی عبدالقدیر! آپ نے کوشش ضرور کی ہے لیکن "Force" اور مستقل مزاجی اُس لیول پر نہیں ہے کہ آپ کے مقصد کا مٹکا ٹوٹنے کے بجائے زمین میں دھنس جائے۔

اس بار میرے ساتھ بھی آپ کی کوشش اور فزیکل ایکٹوٹی لیول تو ویسا ہی ہوگا لیکن اُس کا فورس اور مستقل مزاجی کا لیول بس بدلنا ہوگا۔ وزن جب سارے جسم کا کم ہوگا تو پیٹ بھی خود بخود کم ہو جائے گا۔ پہلی بات!

آخری بات بھی یہی ہے کہ اللہ پر یقین رکھیں اور مستقل مزاجی قائم رکھیں۔ ہوالشافی۔

صبح اُٹھ کر ۲/ جوئے لہسن دیسی پانی کے ساتھ نگل لیں۔

۸/ بجے: ایک سیب

۹/ بجے: ایک ابلا ہوا انڈا اور چائے

۱۲/ بجے: ایک سیب/ ایک گلاس سکمڈ دودھ

۲/ بجے: ۲/ سپون اسپغول چھلکا سادہ پانی کے ساتھ ۲۰/ منٹ بعد ۴/ سپون سالن + ایک پلیٹ بند گوبھی، ٹماٹر، پودینہ سلاد۔

۴/ بجے: سکم دودھ/ چائے + ۲/ بادام

۶/ بجے: ایک سیب

۸:۳۰ بجے: ایک جوا دیسی لہسن پانی کے ساتھ پھانک لیں۔ اُبلے ہوئے شلجم کے اندر لہسن ادرک ڈال کر بھون لیں۔ نمک نہیں لینا کالی مرچ ڈال سکتے ہیں۔ ساتھ چھوٹی چپاتی فور گرین آٹے کی + گرین ٹی۔

پہلے ۱۵/ دن بعد اپنا ڈنر کا شیڈول بدلوا لیں۔ واک صبح یا پھر عصر کے بعد کریں۔ پیٹ کی ورزش جو میں نے پہلے سوال کے جواب میں بتائی ہے وہ کریں۔ میرا قول ہے "محنت کرنا کمال نہیں مسلسل محنت کرنا کمال ہے۔" آپ محنت کرتے جائیں اللہ تعالیٰ کی ذات مدد کرے گی۔

سوال: ڈیئر میڈم! میری عمر ۶۱/ سال ہے اور قد ۵/ فٹ ۱۰/ انچ۔ وزن ۷۰/ کلوگرام ہے۔ میں ہائپر ٹینشن کا مریض ہوں۔

(فرام اومان نام نا معلوم)

جواب: آپ نے اپنا فزیکل ایکٹوٹی لیول، کھانے پینے کی روٹین اور اپنا نام تک نہیں بھیجا۔ اتنی ادھوری معلومات! آپ بہر حال صبح ۲/ جوئے دیسی لہسن نہار منہ لیں۔ ناشتے میں جو کا دلیہ اور ایک فروٹ لیں۔ Midsnack ٹائم میں چائے کے ساتھ ۲/ بادام۔ لنچ میں ایک روٹی + چھوٹی پیالی سالن + بڑی پلیٹ سلاد + گرین ٹی لیں۔

شام کے Snack میں سیب کھائیں۔

رات ڈنر میں جو کا دلیہ لیں مگر مزید بھوک لگے تو ایک فروٹ ساتھ لیں۔ چائے کم سے کم استعمال کریں۔ پانی چھوٹا گلاس ہر گھنٹے بعد استعمال کریں۔ آہستہ رفتار سے ایک گھنٹہ وقت مقررہ پر واک کریں۔ آپ سب کے لیے میری نصیحت ہے اپنے کام خود کرنا شروع کریں۔ ہم لوگ ماسیوں کو پیسے دے کر سمارٹ کرتے ہیں۔

۱۵۰ کیلوری برن ہوتی ہے

☆ ۶۸/ منٹ تک کپڑے استری کرنے سے
☆ ۴۸/ منٹ کی کوکنگ سے
☆ ۴۵/ سے ۶۰/ منٹ تک کار دھونے اور چمکانے سے
☆ ۴۵/ سے ۶۰/ منٹ تک فرش یا کھڑکیاں دھونے سے
☆ ۴۰/ منٹ الماریوں میں سامان درست کرنے سے
☆ ۳۶/ منٹ تک سودا سلف کی خریداری سے
☆ ۳۶/ منٹ تک فرش صاف کرنے سے
☆ ۳۴/ منٹ تک ویکیوم کلیننگ سے
☆ ۳۰/ سے ۴۰/ منٹ تک باغبانی سے
☆ ۳۰/ منٹ ہلکی رفتار سے ۵/ میل تک سائیکل چلانے سے
☆ ۱۵/ منٹ تک سیڑھیاں چڑھنے سے
☆ ۱۳/ منٹ ٹوئسٹ کرنے سے
☆ ۱۶/ منٹ اِدھر اُدھر لاٹھی گھمانے سے
☆ ۳۴/ منٹ جھاڑ پونچھ کرنے سے

خدا کے لیے خود پر ترس کھائیں۔ اپنے کام خود کریں، بیماریوں سے بچیں۔ اچھی غذا کھائیں، Family ڈنر گھر پر تیار کریں۔ Family ایکٹوٹی ضرور رکھیں۔ خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں۔ اللہ جی کا شکر ادا کریں۔ صحت بہت بڑی نعمت ہے۔

مبارک ہو

اقرا ریاض۔ گوجرانوالہ:

وزن ۸۷/ سے ۷۲/ کلوگرام ہو گیا ہے۔ مبارک ہو اپنا ڈنر بدلوا لیں۔ مستقل مزاجی قائم رکھیں۔

سائرہ خرم۔ میانوالی:

وزن ۸۸/ سے ۸۰/ کلوگرام ہوا ہے۔ ابھی آپ اپنا ناشتا بدلیں اور دودھ کا گلاس ایک اور Add کریں۔ ورزش ایک گھنٹہ ضروری ہے۔

منہاس خورشید۔ کشمیر:

وزن ۱۲۰ سے ۱۰۶/ کلوگرام پر آنا مبارک ہو۔

اللہ جی سب کو خوشیاں اور آسانیاں دیں۔ مجھے میرے بچوں اور اہل خانہ کو اپنی اچھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

■

WWW.PAKSOCIETY.COM

چمنِ خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

۵/خوبصورت مساجد، سب پر بھاری رہا

شمارہ اکتوبر کے ۵/صفحات میں دنیا کی ۵/خوبصورت مساجد کی تصاویر اور مختصر تعارف کئی طویل طویل تحریروں پر بھاری رہا۔ ۵/عظیم اساتذہ کا تذکرہ کچھ تشنہ سا محسوس ہوا۔ پروفیسر وقار عظیم مرحوم کے ذکر (ص ۱۲۱) میں عطاء الحق قاسمی نے ''ڈاکٹر عبیداللہ'' کا نام بھی لیا ہے۔ یہ درست نہیں غالباً غلطی سے لکھا گیا ہے۔ یہاں ''ڈاکٹر سید عبداللہ'' درست ہے۔ اس زمانے (۱۹۶۵ء۔۱۹۷۷ء) میں ڈاکٹر عبیداللہ خاں اورنٹیل کالج نہیں آئے تھے، بہت بعد میں آئے۔ مزید برآں اس زمانے کے ''قابلِ ذکر'' اساتذہ میں ڈاکٹر وحید قریشی کا نام بھی آنا چاہیے۔

صفحہ ۱۴۵ پر ''توجیح'' مُنہ چڑا رہا ہے۔ ''توجیہہ'' صحیح ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۴۷ پر علامہ اقبال کے شعر کا دوسرا مصرع غلط ہوگیا۔ صحیح: چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے۔

(رفیع الدین ہاشمی۔ ممتاز ماہرِ اقبالیات، لسانیات)

شاعری اور لغت ضرور دیا کریں

جب اُردو ڈائجسٹ کی قیمت ۱۰۰/روپے ہوگی ہم پھر بھی خوشی خوشی خریدیں گے کیونکہ یہ ہماری ذہنی اور فکری غذا کی کمی پوری کرتا ہے۔ اس کی انفرادیت کیا یہ کم ہے کہ اپنی لاکھ آرائش کے بعد بھی مغرور نہیں ہے۔ مسلسل مشکل الفاظ کے لیے ایک صفحہ لغت کا ضرور دیا کریں۔ آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ قاری ہر لفظ سے بہت حد تک آشنا ہے۔ دوسرے محمود جمال کے حوالے سے کچھ شاعروں کی شاعری کے ۲/یا ۳/صفحات ہوتے تھے جو بڑے منفرد طریقے سے شائع ہو رہے تھے۔ کچھ مع تفصیلات شاعر کو پورا کرتے تھے۔ تعارف فوٹو سے بھی ہوتا تھا، اب نہیں ہے۔ ہم تو مجبور ہیں، وہ ضرور دیا کریں۔

(حسن نقی امروہوی۔ کراچی)

میٹھا زہر

صیہونی طاقتوں اور اسلام دشمن عناصر کی ہمارے مذہب اسلام پر دریدہ دہنی کسی طور بھی مسلمانوں کو قبول نہیں مگر اپنی پالیسیوں پر عمل درآمد کرتے ہوئے وہ میٹھے زہر کی طرح دین سے دوری کا سبق ہمارے ذہنوں میں اتار رہے ہیں اور ہم ہیں کہ نہایت خاموشی کے ساتھ یہ زہر پیے جا رہے ہیں۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ ہمیں دانستہ مذہب سے دور کیا جا رہا ہے!

(علی اختر۔ فیصل آباد)

(یہ بھی خوب رہی۔ کسی بات کی ذمہ داری ہی نہیں ہم پر۔ دین پر نہ چلیں تو بھی دوسرے ذمہ دار، مذہب سے دور ہوں تو بھی کوئی اور ذمہ دار، ہم روبوٹ ہیں کیا، عقل و خرد سے عاری، جس کا جی چاہے، جدھر لے جائے۔ ہمیں جیسا جی چاہے بنا لے ناراض نہ ہوں تو ہمیں تو یہ سوچ زہر لگتی ہے کہ وہ اسلام دشمن طاقتیں اس کی ذمہ دار ہیں۔ وہ بھلا اسلام کی خدمت اور ترویج کے لیے کیوں کام کرنے لگیں۔ اپنی کمزوری، غلطی مانیں گے تو ہی دور کر سکیں گے۔)

تیر بہدف چنیدہ موضوعات

اردو ڈائجسٹ کھولتا ہوں تو ڈھونڈ کر تحریریں پڑھتا ہوں۔ تیر بہدف چنیدہ موضوعات اور اس پر ایسا اندازِ تحریر۔ پُرخلوص مبارک باد قبول فرمائیے۔ ملکی حالات پر میرے دل کی پُرسوز پکار ہے کہ

اب بھی تو نے اگر فکرِ فردا نہ کی
گھُٹ کے مر جائے گی دیس کی ہر کلی

(ڈاکٹر فیاض ہرل۔ لاہور)

اتنا اچھا بھی نہیں ہے

آپ کا رسالہ اتنا اچھا نہیں ہے جتنا لوگ آپ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ آپ نے مہنگائی کا رونا روئے بغیر قیمت بڑھا دی اسی کا غم ہے۔ خرابیوں پر میں نے غور نہیں کیا، کئی نکل سکتی ہیں۔ لوگ تو آپ کو لکھ رہے ہیں کہ رسالہ بہت اچھا ہے اور اس کی قیمت ۱۰۰/روپے

میں لڑکیوں کو بری الذمہ نہیں سمجھتی

لڑکیاں جسے بوائے فرینڈ سمجھتی ہیں، لڑکے اسے رکھیل کہتے ہیں

اردو ڈائجسٹ ملا تو میں نے حسبِ معمول سب سے پہلے تمھارا کالم دردل پر دستک پڑھا اور میرا جی یوں نہال ہوگیا جیسے کہ باغبان نے سب سے قیمتی پھول گلدان میں سجا دیا ہو...... واہ واہ...... کیا خوب تحریر تھی۔ ایسا سلگتا ہوا، ضمیروں کو جھنجھوڑتا ہوا، ادراک میں نوکِ خنجر چبھوتا ہوا اور غیرت کے لیے تازیانے برساتا ہوا۔ مضمون جو تم نے باندھا اس پر تمھیں ماہ کے بہترین کالم کا انعام دینے کو دل چاہا۔ جس طرح تم ہر ماہ ایک بہترین خط پر انعام دیتے ہو...... حالانکہ میں جانتی ہوں ابھی تم اس سے بھی بہتر کالم لکھو گے ان شاء اللہ...... مگر و بینا ملک اور میڈیا چینل پر بروقت واشگاف لفظوں میں لکھ کر تم نے ثابت کر دیا کہ ہمیں اپنی نوجوان نسل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہماری امانتیں اور وراثتیں سنبھالنے کے بالکل اہل ہیں۔ اپنی ہی فوج پیدا کرو...... انعام تو لازوال دعائیں ہیں۔ جگ جگ جیو۔ اللہ تمھارے قلم کو ہرا بھرا رکھے۔ اور رواں دواں۔ آمین ثم آمین۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی ہو جائے تو وہ پڑھیں گے۔ لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ میں بہر حال پڑھتا رہوں گا۔

(محمد علی خان۔ گلشنِ اقبال، کراچی)

بہت بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور سے مشابہ

کئی ماہ سے اردو ڈائجسٹ باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ اس عنایت کے لیے شکریہ۔ خوشی اس بات کی ہے کہ بدلتے حالات کے باوجود بھی آپ نے پرچہ کی پالیسی تبدیل نہیں کی اور یہ ڈیپارٹمنٹل سٹور سے مشابہ نظر آتا ہے۔ ہر قاری کی دلچسپی اور ذوق کی تشفی کے لیے ''کاؤنٹر'' موجود ہے۔ معیاری اور بامقصد تحریروں سے مُزین پرچہ مرتب کرنا آسان نہیں مگر اُردو ڈائجسٹ کی یہی خوبی اسے نمایاں کرتی ہے۔ آپ کے ریکارڈ میں میرے پرانے فون نمبر درج ہیں آپ ان کی تصحیح کر لیں۔ شکریہ۔

(ڈاکٹر سلیم اختر۔ الجوت، اقبال ٹاؤن، لاہور)
(ممتاز نقاد، افسانہ نگار اور استاد)

۷رسال گزر گے

شمارہ معلوماتی تھا۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء کے لرزہ خیز مناظر کی یاد تازہ ہے۔ ۷رسال گزرنے کے باوجود بھی تباہی اور بربادی کے وہ نقوش آج بھی ذہنوں میں تازہ ہیں۔

ملبے سے نکلے تھے کبھی پھول کبھی خواب
کس کو کہاں دفن کیا کچھ یاد نہیں

(طوبیٰ ایمن۔ چناری، آزاد کشمیر)

واہمن کی آخری حدیں

اس وقت اُمت مسلمہ کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ موجودہ قیادت واہمن کی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ لوگ محسوس کرتے ہیں لیکن زبان نہیں کھولتے۔ کسی کو جان کا ڈر ہے، کسی کو مال کا ڈر ہے، کوئی اپنے اخبار و رسالے بچانے کے لیے مصلحت پسندی کا شکار ہے۔ قوموں اور ملکوں کی تاریخیں بتاتی ہیں کہ افراد کی مالی اور جانی قربانیاں ہی قوموں کی بقا کی ضمانت ہوتی ہیں۔

کٹیں جو چند گردنیں قوم کی ہو زندگی

اردو ڈائجسٹ کو چاہیے کہ ہمیشہ کی طرح حق بات کہتا اور لکھتا رہے۔

(پروفیسر محمد نواز۔ گاؤں دھکڑ تحصیل کھاریاں)

پرچہ خوبصورت ہی نہیں عمدہ بھی تھا

''چمنِ خیال'' میں خط کو جگہ دینے کا شکریہ۔ آغاز میں ''سونامی کا مثبت حوالہ'' اور آخری جملہ ''مصری سونامی کے لفظ نے یہ ضرور کیا کہ تحریکِ انصاف کی سونامی کو پہلی بار مثبت حوالہ دیا ہے۔'' دیکھ کر احساس ہوا کہ سابقے اور لاحقے بنانے بھی کسی کسی کے دستِ ہنر کا کمال ہے۔ وہ بات سارے افسانے میں جس کا ذکر تھا، وہ بات اُن کو بہت خوشگوار گزری ہے۔ ''جناح۔ رنگ و نسل سے برتر رہنما'' دسمبر کے شمارے میں مل جائے تو نوازش ہوگی۔ یاس یگانہ چنگیزی کا ایک شعر عرض کروں۔

حسن پر فرعون کی پھبتی کہی
ہاتھ لاؤ یار، واہ کیسی کہی

آخری جملے امید ہے اس خیال کو تقویت بخشیں گے کہ راقم تحریر ہذا ''حوالہ میری پسند کا'' کے سلسلے میں کچھ جگہ پانے کی استعداد بہم کر چکا ہے۔ ذرا غور فرمائیے اور حکم سے مطلع فرمائیے

(ڈاکٹر ندیم اکرام۔ راولپنڈی)

(فرمائش قبول کی جاتی ہے حضور!)

کورٹ میرج

اکتوبر کے شمارے میں جناب مجید نظامی اور عطاء الحق قاسمی کے پرچے کے بارے میں تاثرات پڑھنے کے بعد اب اس کی تعریف کے لیے ہمارے پاس کچھ باقی نہیں

اختر عباس! ابھی میں تمھیں اگست والا خط پوسٹ نہیں کر سکی تھی کہ ستمبر کا شمارہ آ گیا...... افوہ! اس موضوع نے تو میرے اندر بھانبھڑ بھڑکا دیے۔ یہ ایک لڑکی کا قصہ نہیں ہے۔ یہ وبا تہذیب اور ارتقا کے نام پر پھیلتی جا رہی ہے۔ عصمت کے تصور کو فرسودہ سمجھا جا رہا ہے اور فلمی کلچر کی ڈسی ہوئی لڑکیاں پریم کو سب سے بڑا دھرم کہنے لگ گئی ہیں۔ ہمارے ہاں بوائے فرینڈ کا تصور نہیں تھا۔ یہ مغرب سے آیا۔ لڑکیاں جسے بوائے فرینڈ سمجھتی ہیں لڑکا اسے رکھیل سمجھتا اور کہتا ہے کہ یہ تو بتاؤ جس لڑکی کو معصوم کہہ کر اس کے گناہ کی داستان سنا رہے ہو، کیا وہ اتنی ہی معصوم ہے کہ اس کو معلوم نہیں شادی کیسے ہوتی ہے۔ شادی میں کیا ہوتا ہے۔ گاؤں کی لڑکی ان باتوں سے بڑی جلدی آگاہ ہو جاتی ہے اور یہ کس قسم کی بیٹی ہے کہ ماں باپ کی شرکت کے بغیر قاضی اور گواہوں کی موجودگی کے بغیر بیاہ رچا لیتی ہے۔ اپنے نفس کی خواہش کو شادی جیسے پاکیزہ رشتے کا نام دیتی ہے اور اپنے والدین کو جو اس پر اعتماد کرتے ہیں انھیں صریحاً دھوکا دیتی ہے۔ ایسی بدنصیب لڑکیوں کو جو نفسانی خواہشات کی غلام ہو جاتی ہیں بتائیں کہ شریک بستر کو کبھی کوئی مرد شریک حیات نہیں بناتا...... بعد میں ٹسوے بہانے سے کیا حاصل......؟

میں اس کھیل میں لڑکوں کو بری الذمہ نہیں سمجھتی۔ وہ تو ازلی شکاری ہوتے ہیں۔ اپنی آبرو کی حفاظت کرنا اور والدین کے وقار کا بھرم رکھنا ہمیشہ سے لڑکیوں کا کام رہا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اگر معاشرے میں ہزار خرابیاں ہوں، ڈرنا نہیں۔ مگر جب معاشرے میں عورت بدکردار ہو جائے تو ڈرنا کہ ایسے معاشرے تباہی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

۲۰رسال اُدھر کی بات ہے مجھے اپنی عزیزہ کی خاطر یونیورسٹی ہوسٹل میں اکثر جانا پڑتا تھا۔ وہاں میں نے موٹر کار والوں کے ساتھ لڑکیوں کی رنگ رلیوں کے مناظر دیکھ کر کسی سے پوچھا انھوں نے جو مجھے بتایا کافی دردناک تھا۔ پھر میں نے اس موضوع پر ''پیاسی'' ناول لکھا کہ کس طرح گاؤں سے آنے والی سیدھی لڑکیاں ''ہوس'' کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کراچی کے ایک پرائیویٹ چینل نے اس پر ۱۰۰/اقساط کا سیریل بنایا تھا۔ جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ کچھ لڑکیاں مجھ سے ملنے آئیں اور گلہ کیا کہ اس ناول کے پڑھنے کے بعد والدین ہمیں کالج نہیں بھیجیں گے۔ میں نے کہا ''اس ناول کو پڑھنے کے بعد لڑکیوں کو بھی تو پتا چل جائے گا بڑے شہروں میں اُن سے دھوکا کیسے ہوتا ہے۔ مضبوط کردار کی لڑکی خواہشات کے چڑھے سمندر میں بھی کپڑے گیلے کیے بغیر پار اُتر سکتی ہے۔ آخر لکھوکھا نیک پاک لڑکیاں بھی تو اسی ماحول سے ہو کر جاتی ہیں۔

اختر عباس! تم نے بڑی خوبصورتی سے ماں کے فرائض کا ذکر کیا ہے۔ آج ماؤں کی نظر اتنی گہری کیوں نہیں ہوتی...... ایسے ہزاروں قصے مجھ تک پہنچتے رہتے ہیں۔ مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ عورت جسے ہم اپنے ناولوں اور افسانوں میں حیا کی پتلی اور وفا کی پیکر لکھتے ہیں وہ جدید تہذیب کے آذر کی پرستش میں اپنی حد سے باہر نکلی جا رہی ہے۔ یہ سب ماؤں ہی کا قصور ہے...... اسی لیے تو ہمارے ہاں طلاق کی شرح بڑھتی جا رہی ہے......

ماں کی تربیت، تاکید، توقع اور تعزیر...... اور باپ کی کڑی نگاہ بمع رزق حلال...... ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ مگر انھوں نے تو یہ کام میڈیا پر چھوڑ دیا ہے...... اور میڈیا بھلا یہ کام کیوں کرنے لگا......

والسلام
بشریٰ رحمن
وطن دوست۔ لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ نئے لکھنے والوں کے لیے پیشکش بہت خوب کام ہے۔ ایک اہم اور حساس موضوع کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے اس پر بھی کچھ لکھیں گے۔ آج کل گھروں سے بھاگ کر کم عمر بچے اور بچیاں شادی (کورٹ میرج) کرنے کے جس ذلت آمیز عمل پر چل رہے ہیں اور میڈیا اسے اتنا گلیمرس بنا کر پیش کرتا ہے کہ نئی نسل بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ اس عمل کے نتیجے میں اُن کے والدین کی عزت و ناموس کا جنازہ نکل جاتا ہے تو دوسری طرف وہ خود بھی بسا اوقات غلط دوستوں کے ہاتھوں اپنا بہت کچھ گنوا بیٹھتے ہیں۔

(کرامت راؤ۔ خیاری (سندھ)

(راؤ صاحب! یہ آج کل نہیں، بہت برسوں سے ہو رہا ہے۔ جب گھروں میں محبت اور ویلیوز کی کمی ہو جائے، تربیت میں کوتاہی رہ جائے تو یہ نوبت آتی ہے۔ میڈیا غریب تو غیرت کے نام پر گھر سے بھاگی لڑکیوں کی لاشوں اور اموات کو ہی دکھاتا ہے۔)

وہ جنرل ڈائر نہیں تھا

اردو ڈائجسٹ اور نوائے وقت ہمارے گھر میں میرے والد کی پیدائش سے بھی پہلے سے آ رہے ہیں۔ ہم نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان میں غلطیاں بہت بُری محسوس ہوتی ہیں۔

اکتوبر کے شمارہ میں صفحہ نمبر ۱۲۶

”بے آئین جمہوریت پر نازاں انگریز بلیک ہول اور قصہ خوانی بازار جیسے سانحات کو تاریخ میں اپنی کامیابیوں کے نام سے درج کراتے ہیں۔ ٹریفلگر اسکوائر میں نصب جنرل ڈائر کا مجسمہ ان کی روشن خیال، انصاف پسندی کا پول کھول دیتا ہے جنھوں نے بہادر شاہ ظفر کے ۱۰ بیٹوں کے سرخوان میں سجا کر پیش کیے۔“

تو بھائی جان! عرض ہے کہ جنرل ڈائر اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس سانحہ کے کافی عرصہ بعد جلیانوالہ باغ میں اس بدبخت جنرل نے جو کہ مارشل لاء کا چیف تھا گولیاں چلا کر سیکڑوں لوگوں کو مروایا تھا۔ بعد میں ایک ہندوستانی نے بھیس بدل کر ٹنڈ کرا کر لندن پہنچ کر اس کو جہنم واصل کیا تھا۔

بہادر شاہ ظفر کے ساتھ جس افسر نے ظلم کیا تھا اُس کا نام میجر ہڈسن تھا وہ جنرل نہیں تھا۔ بادشاہ کے ۲ یا ۳ بیٹوں کے سرخوان میں سجا کر پیش کیے گئے اور بادشاہ کے سامنے اس بدبخت نے اُن کے کلیجے بھی چبائے۔

مزید حوالہ جات کے لیے آپ باری علیگ کی کتاب ”کمپنی کی حکومت“ یا خواجہ حسن نظامی کی کتب دیکھ سکتے ہیں۔ تاریخ کو گڈمڈ نہ کریں، آگے ہی کافی بگڑی ہوئی ہے۔

(حرا ہارون ڈار۔ زوجہ میجر ہارون شہید نشان بسالت)

(صحیح کا شکریہ)

دونوں جہانوں کی سرخروئی

”دردل پہ دستک“ پڑھا۔ ذاتی طور پر خوشی ہوئی اس بات کی کہ آپ نے حقیقت کو بڑے احسن انداز میں الفاظ میں ڈھالا ہے اور دکھ اس بات پر کہ ہم ان باتوں کو سمجھنا نہیں چاہتے اور ہم اپنے معاشرے کو مغربی معاشرے سے موازنہ میں لا کر خود اپنی تذلیل کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔ خیر یہ باتیں آپ کی خوبصورت تبلیغ اور عبادہ بالقلم کے زمرے میں آتی ہیں۔ دعا ہے کریم مالک آپ کے قلم کی چاشنی میں اضافہ فرمائے اور آپ ان کے پیغامات کو عام کریں اور آپ کو دونوں جہانوں میں سرخرو کرے۔

(ڈاکٹر محمد اعظم رضا تبسم۔ راولپنڈی)

کریڈٹ میں حصہ

کچھ نیا کر دکھانے کا جنون آپ کی اور آپ کی پوری ٹیم کو ضرور جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کریڈٹ ہم جیسے ان لوگوں کو بھی ضرور جاتا ہے جو اعلیٰ ذوق رکھتے اور اردو ڈائجسٹ کا انتخاب کرتے ہیں۔ اکتوبر کا رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ ہر بار ٹائٹل بہت خوب ہوتا ہے۔ ایک دنیا آپ کے سامنے کھلی ہے، نظر ایک جگہ نہیں پڑتی۔

(عشرت جہاں۔ ٹاؤن شپ، لاہور)

(تحریر یعنی رسم الخط اچھا ہے۔ البتہ تحریر بہت مختصر ہے اور موثر ہونے سے بھی انکاری ہے)

انعام کا شکریہ

پرچہ زبردست، اے ون ہے۔ ہر موضوع نایاب ہے۔ اس ماہ وزن کم کیجیے صحت نہیں، مشورہ حاضر بہت چاہے۔ ہمارا انعام مل گیا ہے۔ اس کا شکریہ۔

(رحمت اللہ بلوچ۔ فورٹ منرو)

بازار سے خود خرید کر لایا ہوں

اُردو ڈائجسٹ کی مقبولیت یا جاذبیت، اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ گھر میں بے شمار اعزازی رسائل اور اخبارات کے آنے کے باوجود میں بازار سے اسے ۹۰ روپے میں خرید کر لایا۔ آپ پوچھیں گے کہ اتنا کیا اچھا لگا تو جان لیجیے کہ اس کی پیشکش کا انداز اور مضامین کا انتخاب اس قدر عمدہ اور خوبصورت ہیں کہ میں اسے بلاخوف تردید اُردو کا ریڈر ڈائجسٹ سمجھتا اور کہتا ہوں۔ پورے شمارے میں کوئی ایک مضمون بھی ایسا نہیں تھا جسے مدیر صاحب نے خانہ پوری یا بھرتی میں ڈالا ہو۔ یہاں تک کہ فلرز تک ”سوچ سمجھے“ تھے۔ معلومات کو ہم عام طور پر فار گرانٹڈ لیتے ہیں۔ جیسے میں نے عامر خان کے پروگرام کا سنا تھا کہ اُس نے وہاں بڑی ہلچل مچا رکھی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ خبر نہ تھی۔ تفصیل کہاں سے لیتا۔ آپ نے کمال سلیقے اور طریقے سے معلومات بھی دے دیں اور پیغام بھی۔ اُردو ڈائجسٹ کو بھی میں بہت سالوں سے جانتا ہوں مگر یہ بالکل نیا اور ماڈرن جنم ہے۔ پرانے سے بالکل مختلف۔ وہ تب موثر تھا، یہ اب موثر ہے۔

(یاسر پیرزادہ، کالم نگار روزنامہ جنگ لاہور)

دنیا کی دوسری بڑی زبان

ہیئر اسٹائلسٹ کے حیران کن عروج کی کہانی حیرت انگیز، دلچسپ اور جدوجہد کے جذبے کو تازہ خون دینے والی کہانی تھی۔ اسلامی گوشہ، محنت و کوشش اور لگن سے اپنا مقام بنانے والے لوگوں سے گفتگو، کیریئر پلاننگ پر مضامین اور کہانیاں بھی کچھ دلچسپ تھا۔

یونیسکو کی تحقیق کے مطابق ۲۰۰۰ء میں چینی زبان بولنے والوں کی تعداد ۱۳۰۰ ملین تھی۔ اردو بولنے والوں کی تعداد ۴۶۵ ملین ہے۔ یوں اردو دنیا میں دوسری بڑی زبان قرار پائی لیکن ہم نے اردو کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ پاکستان دنیا بھر کے آزاد ملکوں میں شاید واحد ملک ہے جہاں قومی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہیں۔ بین الاقوامی ٹھیکیدار ملالہ کے لیے تو درد محسوس کرنے لگے، کیا ڈاکٹر عافیہ صدیقی پاکستان کی بیٹی نہیں؟ مغرب کا ملالہ اور عافیہ کے متعلق اتنا واضح فرق کیوں؟ ”دردل پر دستک“ کا انتظار رہتا ہے۔

(رانا محمد شاہد، بورے والا)

ہنر عیب...... اور عیب ہنر

حیران ہوئی ٹائٹل دیکھ کر۔ کس قدر اچھوتا خیال جس کو سرورق کی زینت بنایا گیا۔ یہی تو ترقی کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ نہ معلوم کیوں پیشوں کو چھوٹے اور بڑے ہونے کی دلیل بنا لیا گیا ہے۔ ہمارے لوگ جب دوسرے ممالک میں جاتے ہیں تو ہنر عیب اور عیب ہنر بن جاتا ہے۔ برگر بیچنا، علی الصبح گھروں میں اخبار ڈالنا، کسی شاپنگ مال میں سیلز مین ہونا عیب نہیں۔ دل خوش کر دیا اس ایشو کو اٹھا کر۔ ”اسلامی گوشہ“ محض برکت کے لیے نہیں ہوتا، سچ مچ محنت کی جاتی ہے۔

نئے بل گیٹس کی دریافت ہو یا بزنس رول ماڈل یا اسٹیفن کووے کی باتیں، ہر تحریر کے بعد ایک سوچ پختہ ہوتی ہے۔ میں نے اپنے کالج میں Seven Habits میں سے ورکشاپ تیار کر کے طالبات کو کرائیں اور حیرت انگیز ریمارکس تھے طالبات کے۔ ناظم حکمت کی باتیں دل کو چھو گئیں۔ 'محیر العقول' بھی خوب رہا۔ اشعب کی تحریر نے سب کو اپنے 'اندر' تلاش کرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ اللہ آپ سب کو آباد رکھے۔ آمین۔

(افشاں نوید۔ کراچی)

■

WWW.PAKSOCIETY.COM

"خوف" کا تحفہ واپس کرنے کا خوف

درِ دل پہ دستک
اختر عباس

سوچتا ہوں تو جھرجھری سی آجاتی ہے، سخت سردیوں کے دن تھے، چھٹیوں میں دادی اماں کا دیا ہوا کھیس لے کر مربعے پہنچے جہاں "ویلنا" چل رہا تھا، گنے چھیلے جارہے تھے، ان کا رس نکل رہا تھا تاکہ اسے پکایا اور گڑ بنایا جاسکے۔ دادا جی نے کماد کے خشک پتوں کو جمع کرکے آگ جلانے کی کوشش کی مگر شبنم کے ننھے ننھے قطروں نے انھیں گیلا کر رکھا تھا۔ انھوں نے ہاتھوں کی اوک سی بنائی۔ چند پھونکیں ماریں اور آگ جلا کر بولے بسم اللہ آجاؤ اور ہاتھ سینکو۔ پھر اٹھے، ایک دن پہلے رس نکلے گنے کا خشک چورا اٹھا کر لائے اور آگ کے قریب رکھتے بلکہ بچھاتے ہوئے اشارہ کیا "ادھر آجاؤ اس کے اوپر چوکڑی مار کر بیٹھو، پاؤں کے بل بیٹھو گے تو تھک جاؤ گے۔" پھر انھوں نے مزارع کے لڑکے سے کہا ۲،۳/صاف صاف گنے لاؤ پھر کماد چھیلنے والے ٹوکے سے بیچ میں سے ۲/حصوں میں تقسیم کیا اور مسکراتے ہوئے بولے "کاکا! تیرے کولوں تے ثابت گنا چھلیا وی نہیں سی جانا، اے لے مزے نال چھل تے چوپ۔"

دادا ویلنے میں گنے لگارہے تھے۔ میں کچھ دیر بعد قریب جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے بیل چکر لگاتے ہوئے قریب آئے تو لکڑی کی گاٹی کو آتے دیکھ کر بولے "بیٹا! جب یہ قریب آئے تو سر نیچے کرلینا۔" میں نے پہلا سوال کیا تھا "میاں جی! اتنے منہ اندھیرے آجاتے ہیں۔ ڈر نہیں لگتا۔"

جواب کے بجائے اُلٹا انھوں نے سوال کردیا تھا "کس چیز کا ڈر؟"

"بیٹا اتنا تو سکون ہوتا ہے، میں تو نماز بھی یہاں آکر پڑھتا ہوں۔ اس وقت تو رب سوہنا خود پہلے آسمان پر آیا ہوتا ہے، خیر ہی خیر۔" وہ سامنے کھالے سے وضو کرکے یہاں "کھوری" بچھائی، اوپر اپنی لوئی (گرم چادر) ڈالی۔ کبھی جو کھیس کا بکل مارا ہوا ہو تو پھر یہاں بوری رکھی ہوئی ہے۔ اس کو سیدھا کرلیا اور نماز پڑھ کر کام شروع کردیا۔"

ان کے کام اور ہدف میں جس ڈر کو میں رکاوٹ سمجھ کر حیرت سے پوچھ رہا تھا، اس کا ان کی زندگی کی صبح اور شاموں میں ہی نہیں سوچ میں بھی کوئی دخل نہیں تھا۔ "میاں جی! کوئی چور اچکا، کوئی سانپ، کوئی گیدڑ، کوئی اوندھا (سور (پگ Pig) اسی نام سے بلایا جاتا ہے۔) سامنے آجائے تو......"

وہ ہنس پڑے اور جواب دینے سے پہلے ان کی نظر چھلے ہوئے گنوں کی ایک ڈھیری کی طرف گئی۔ وہ لپک کر گئے اور ایک موٹی رسی کو ایک سائیڈ سے پکڑ کر ۳،۴/مرتبہ زمین پر مارا، پھر مجھے آواز دی۔ سوچتا ہوں تو اب بھی جھرجھری سی آجاتی ہے۔ وہ ۴، ۵/فٹ لمبا سانپ تھا جسے انھوں نے چند سیکنڈ میں ماردیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اسے ہاتھ لگا کر دیکھوں، اٹھا کر زمین پر ماروں۔ میں باوجود کوشش کے یہ نہ کرسکا اور نتیجتاً آج تک سانپ سے خوف کھاتا ہوں۔ میرے اپنے بچے عید پر گھر آئے بکرے کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ انھیں ہاتھ پکڑ پکڑ کر بکرے

...کمر پر لگا کر بتانا پڑتا ہے کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں مگر ...ں میں بیٹھے کسی بھی چیز کے ان دیکھے ڈر کو دور کرنا ...سان نہیں ہوتا۔ کچھ ڈر تو انسان کے اندر ہی ہوتے ہیں ...کچھ چیزوں، لوگوں، رشتوں اور خطروں کے خوف ...اثت کی طرح بڑوں سے منتقل ہوتے ہیں۔ جس جس چیز ...گھر کے بڑے لوگ ڈراتے ہیں وہ ہماری روزمرہ زندگی کا ...بن جاتا ہے۔ دادا بتانے لگے "گیدڑ تو انسانوں کو دیکھ ...اپنے ڈر کے باعث خود ہی بھاگ جاتا ہے۔ ہاں بھی ...ں بگھیاڑ (بھیڑیا) سے واسطہ پڑے تو اسے ڈرانا پڑتا ...۔ سور بھی اکیلے دکیلے اور کبھی پورے خاندان کے ساتھ ...اور دوسری فصلوں پر حملہ آور ہوتے ہیں تو انھیں دیکھ کر ...لوگ کھیت چھوڑ کر گھر تھوڑی آجاتے ہیں کہ نقصان ...کے خود ہی چلے جائیں اور ان کا سامنا ہی نہ کرنا پڑے۔ ...چل جائے کہ کدھر ہیں، کس کے مربعے، کس کی فصلوں ...تو ۴، ۶/لوگ مل کر پہنچ جاتے ہیں۔ گاؤں بھر کے بچے ...شور مچاتے آجاتے ہیں۔ بندوق نہ بھی ہو تو ڈنڈے ...ے بہت ہم، اپنا نقصان نہیں ہونے دیتے۔"

میں نے گھبراہٹ میں پوچھا "میاں جی! وہ تو سنا ہے ...بھی کردیتا ہے۔"

"ہاں وہ ناک کی سیدھ میں آتا ہے۔ احتیاط نہ کی ...ے اور آخری لمحے ایک دم سائیڈ پر نہ ہٹ جایا جائے تو ...تھوتھنی میں چھپے دانتوں سے پیٹ پھاڑ دیتا ہے۔ ...ٹر شریف ایک بار اپنی اکلوتی بندوق اور شور مچاتے گئی ...ے بالوں کے ساتھ اوندھوں کے ایک خاندان کے پیچھے ...نی دور تک گیا تھا۔ ایک دو مار ڈالے۔ ایک نے راستہ نہ ...ر گھبراہٹ میں جوابی حملہ کردیا۔ ماسٹر شریف کی غلطی کہ ...بروقت بچاؤ نہیں کرسکا کہ اس سے گولی چلی نہ وہ سائیڈ ...بنا۔ ماسٹر شریف بہرحال ہیرو بن گیا کہ وہ اس سے گتھم ...تھا ہوگیا تھا۔ اسے پیٹ پر زخم آیا۔ اتنی دیر بعد لوگ پہنچ ...ے۔ انھوں نے اس نامراد کو ڈنڈوں سے مار ڈالا۔"

میاں جی کے پاس ہر سوال اور مسئلے کا سیدھا سادا ...ی حل ہوتا تھا۔ ایک دو حل ایسے بھی تھے جو مجھے پسند نہیں ...ے مثلاً ایک بار خربوزوں کے موسم میں گئے تو انھوں نے ...بھا خربوزہ کھاؤ گے۔ جواب دیا میاں جی نہ چھری نہ

پلیٹ کیسے کھائیں گے؟ وہ بیری کے نیچے بچھی ڈھیلی سی چارپائی سے اُٹھے، قریبی کھیت سے پکا ہوا خربوزہ توڑا۔ اپنی چادر سے صاف کیا۔ دونوں ہاتھوں کے بیچ میں رکھ کر زور دیا اور اس غریب کو بغیر کسی چھری کے چار حصوں میں تقسیم کرڈالا۔ وہ حیرت آج تک نہیں گئی۔ تازہ گاجر مولی کو زمین سے نکال کر اس کے اپنے پتوں سے صاف کرکے دھوئے بغیر کچر کچر کھانے کی دعوت دیتے اور انھیں کھاتے تو ہم نے کئی بار دیکھا۔ خود کو حفظانِ صحت کے اصولوں کو یاد کرکے کھانے سے محروم رکھنے کا افسوس بھی نہیں جاتا۔ گھر میں دادی، چچی حتیٰ کہ ان کے بچوں کو بیلوں، بھینسوں، کتے، بلیوں سے کبھی ڈرتے نہ دیکھا۔ بھاگتے ٹھوئیں (بچھو) کو تو ہماری دادی اپنی جوتی اتار کر ماردیتی تھیں۔ وہ یہ معرکہ بغیر جوتی کے اپنی ننگی ایڑی کی مدد سے بھی انجام دے چکی تھیں۔

اندھیرے اور ان دیکھی ہر چیز سے ڈرنے والوں کے دل میں جس ذات کا خوف یا احساس ہونا چاہیے۔ وہ اب وراثت میں بھی نہیں ملتا۔ اندھیرے کا خوف بھی ہے مگر اندھیرے کے مالک کا نہیں۔

اب روزمرہ زندگی میں بچوں کو چوہے بلی سے لے کر کاکروچ اور چھپکلی تک سے ڈرتے اور ڈر کر بھاگتے دیکھ کر اپنے دادا اور ان کے آس پاس پلے بڑھے بچے یاد آتے ہیں تو حیرت دوچند ہوجاتی ہے۔

جس جس چیز کے خطرے اور نقصان کے احساس کا ہم سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں وہی خوف بن کر ڈرانے لگتا ہے۔ شہروں میں ماؤں کے پاس ڈرانے دھمکانے کے لیے اندھیرے کے جن، چڑیل سے زیادہ (کہ ان سے وہ خود بھی ڈرتی ہیں) بلی کھا جائے گی۔ کتا آجائے گا قسم کے جملے، دھیرے دھیرے خوف بن کر زندگی کا یوں حصہ بنتے ہیں کہ کاکروچ دیکھ کر بچے ہی نہیں عورتیں بھی چیختی ہوئی بیڈ پر چڑھ جاتی اور چھپکلی دیکھ کر چیخیں مارنے لگتی ہیں۔ ہم اپنے جوتے اتار کر چھپکلیوں کے پیچھے بھاگتے اور نشانے لگا لگا کر مارتے تھے۔ جب جب کوئی چھپکلی نشانے پر آجاتی تو بے جی سے نقد انعام ملتا۔

کبھی کبھی دل اس بات سے بہت ڈرتا ہے کہ جس کا خوف کھانا چاہیے تھا اس سے ڈرنا کسی نے سکھایا ہی نہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ چھوٹے بڑے خوف اپنی جگہ پر سانپ بن کر ڈراتے رہتے ہیں اور موسیٰ کا عصا ہاتھ میں ہونے کے باوجود جوان سانپوں کو کھانے کی صلاحیت رکھتا ہے، ڈرتے رہتے ہیں۔ اپنے رب سے محبت تو دور رہی۔ اس کا خوف کسی بڑے نے نہ سکھایا نہ پڑھایا، نہ اس کی ناراضی اور گرفت سے ڈرایا۔

چھوٹی چھوٹی چیزوں سے "خوف" انجانے میں ہم اپنے بچوں کو کسی تحفہ کی طرح دیتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ یہ تحفہ ان کو راضی رکھنے اور منانے کے لیے دیے گئے چھوٹے چھوٹے کھانے پینے کے تحفوں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔

یہ تحفہ ان کو اس وقت ڈرانے کے کام آتا ہے جب وہ ہم بڑوں کی بات نہیں مانتے۔ ڈرا کر منانے، سلانے، ناپسندیدہ کام سے منع کرنے اور کام نکلوانے کے لیے اسے ہمیشہ سے اکسیر سمجھا گیا ہے۔ اس لیے نسل در نسل یہ سیکھا اور سمجھا ہوا سبق ہم آزماتے اور دہراتے رہتے ہیں۔ چھوٹے سے ذہن کو ڈر اور خوف کا بڑا سا تحفہ دے کر اکثر بڑے تو اگلے ہی لمحے یوں بھول جاتے ہیں جیسے بڑے دل والے احسان کر کے بھول جاتے ہیں۔

مگر کیا کیجیے بڑوں کی کہی ہوئی باتیں، استعمال کردہ لہجے اور دل توڑنے والے جملے، ڈرانے والے صوتی اثرات، خوف زدہ کرنے والے کردار، شرمسار کر دینے والی مثالیں خود سے ہی نظر ملا نہ سکنے والی حرکتیں، بچے کبھی بھلا نہیں پاتے۔ ۱۶ سال کیا، اس کے بعد کئی برسوں میں بھی وہ باتیں، خوف بھری یادیں بن کر ڈرانے آتی رہتی ہیں۔

بچوں کے خوف کو کسی کتاب یا لیکچر سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ تو کسی خوفزدہ ہونے والے بچے کی وہ ڈر بھری چیخ ہوتی ہے جو اس کے اندر ہی گھٹ کر رہ جاتی ہے اور پھر سالہا سال اسے ڈراتی اور ستاتی ہے۔

اس کی ڈری ہوئی آنکھیں، ڈرا ہوا ذہن اور ڈری ہوئی روح جس اذیت سے دوچار ہوتی ہے اس کا عشر عشیر بھی ہم اور آپ محسوس نہیں کر سکتے۔ اندھیرے کا خوف، اندھیری راتوں میں نامعلوم خوفناک مخلوق سے سامنے کا خوف، کتے، بلیوں، سانپوں، چھپکلیوں، کاکروچوں اور چوہوں کا خوف، دوائیوں، ڈاکٹروں، ٹیکوں، سوئیوں کے درد کا خوف، اونچائیوں، گہرائیوں میں گرنے اور جان کے جانے کا خوف، عزت لٹنے، بے عزت ہونے، شرمندگی کا سامنا کرنے کا خوف۔ کسی برتر سے سامنا ہونے کا خوف، ادب آداب سے ناواقفیت کا خوف، بڑوں کے سامنے غلطی ہو جانے کا خوف، ڈاکٹر کے پاس جا کر رونے پہ قابو نہ پا سکنے کا خوف، کسی نامہربان کے جسم کو چھونے کا خوف۔ جسمانی زیادتی چھپانے اور نہ بتانے کا خوف۔ کسی کی جنسی زیادتی کے بعد اسی درد کا سامنا کرنے کا خوف، اس بات کے پھیل جانے اور ڈانٹ کھانے کا خوف، خوف کی اتنی قسمیں ہیں کہ سوچیے تو آپ کو حیرت ہونے لگے کہ کتنے لمحاتی، واقعاتی، حادثاتی، اطلاعاتی، ماحولیاتی، معاشی اور نفسیاتی خوف جن کا انھیں سامنا رہتا ہے۔

لڑکے لڑکیوں کے خوف، سوتے جاگتے کے خوف، جذبات اور ہیجان کے خوف، ٹوٹتے اور ناخوش رشتوں کے خوف۔ سکول کے سخت اساتذہ کے خوف، پڑھائی میں پیچھے رہ جانے کا خوف، امتحان میں ناکامی کا خوف، جسمانی کمزوری کا خوف، دوسروں کی اچھی شخصیت کا خوف، بچھڑ جانے، گم ہو جانے، بہہ جانے، گر جانے اور امریکی حملے یا طالبان کے بم دھماکے سے مر جانے کا خوف۔ ذرا خود سے سوچیے چھوٹی سی عمر میں ایک بچہ کیا کیا خوف نہیں سہتا۔

یہ خوف اس قدر بے درد ہوتے ہیں کہ کبھی تو دل چاہتا ہے کہ ان سے بھی پوچھا جائے کہ تمھیں بھی کسی خوف کے ساتھ رہنا پڑ جائے تو کیا پھر بھی ان معصوموں کو تنگ کرتے رہو گے جو یہ بھی نہیں جانتے کہ خوف ہوتا کیا ہے۔ کہاں سے آتا ہے، کہاں رہتا ہے، کہاں ملتا ہے؟ وہ خوف کو اندھیرے اجالے، عزت، بے عزتی، شہرت اور بدنامی کو درد اور آسانی کے پیمانوں سے ہی ماپنا جانتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اکثر یہ خوف جو ہمارے بچوں کی زندگیوں سے خوشیاں چھیننے آتے ہیں اب ہم بڑوں کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ جاتے ہوئے اپنا نشان بھی ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔

خوفزدہ بچوں کی زندگیوں میں خوف سے آباد پورے شہر کو موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ بچوں میں سال بہ سال سے چھپے ہوئے "خوفوں" کو ڈھونڈنے میں کئی سال چاہئیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ جب تک مسئلہ ہمارے اپنے گھر کے دروازہ پر آ کر بیٹھ نہ جائے تب تک ہم اسے مسئلہ ہی نہیں سمجھتے۔ حل، ڈھونڈنا تو بڑی دور کی بات ہے۔ ہم حل سوچنے پر بھی اکثر آمادہ نہیں ہوتے۔ سر پر پڑے تو ہمیں ماہرین نفسیات، ڈاکٹر، کنسلٹنٹ ہی نہیں جعلی پیر فقیر بھی اچھے لگنے لگتے ہیں۔ تب بھی ہم خود حل نہیں ڈھونڈتے۔ اکثر اپنے ہی بچوں کو تھوڑا پیار اور اپنائیت کا احساس دینے کا وقت نکالنے کے بجائے کچھ بے مہر اور بے حس پیشہ وروں پر تکیہ کرنے میں سہولت محسوس کرتے ہیں جو ہماری جگہ ہمارے بچوں کے خوف دور کرنے کی کوشش کرتے اور ہمیں ہمارے بچوں کے خوف دکھا کر ان سے نجات دلانے کے ڈھیر سارے پیسے لیتے ہیں۔

اللہ کرے سوچ کے اس پڑاؤ پر ہم بڑے ہی اس خوف اور اس کی وجوہات میں اپنی اپنی شکلیں اور اپنا اپنا ڈالا ہوا حصہ پہچان لیں۔ اگلے مرحلے میں آپ کے ساتھ چمٹ کر سونے والا بچہ ممکن ہے اسی رات سونے سے پہلے آپ کے حوصلہ، محبت اور یقین سے بھری، کہانی اور باتیں سن کر سکون سے سوئے اور آنے والے دنوں میں جب اسے دھیرے دھیرے خوف کے سائے میں بڑا ہونا ہے۔ آپ کی انگلی پکڑے پورے اعتماد سے کھڑا ہو، وہ خوابوں میں بھی پورے قد سے جیئے۔ ناواقف یا شناسا لوگوں کی غیر مطلوب ناپسندیدہ باتوں اور حرکتوں پر ڈرنے، سہمنے کے بجائے پورے زور سے بولے اور اپنی خوشی، ذات، عزت اور حفاظت اس یقین سے کرے کہ آپ اس کے پیچھے کھڑے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ "بچوں میں خوف" کے اسباب، علامات اور تدارک کو اگر "فرض کفایہ" کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ جس طرح اپنے مریضوں اور اپنے پیاروں کو دوسرا آپ کی طرح پیار نہیں کر سکتا، اس طرح سچائی تو یہی ہے کہ آپ کو، اپنے اپنے بچوں کے خوف خود ہی کم کرنے ہوں گے۔ خوفزدہ کرنے میں جو آسانی ہوتی ہے اس کی قربانی دینا ہوگی۔ اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ پھر یقیناً بہتری کی کئی صورتیں نکل آئیں گی۔ چلیں! ہم اور آپ مل کر آغاز تو کرتے ہیں اپنے بچوں کو پیارے رب سے ملواتے ہیں۔ اس سے محبت اور اس پر بھروسا سکھاتے ہیں۔ اس جنت کا بھی بتاتے ہیں جس میں کوئی خوف نہ ہوگا اور یہ سارے بچے وہاں پھولوں کی طرح آباد اور شاد ہوں گے اور ہم اُن سے ان خوف ناک خوفوں کا تذکرہ بھی نہیں کریں گے جو ہم بڑے سہتے ہیں۔ ڈرون طیاروں کے حملوں میں ہزاروں بچوں، بڑوں کے مارے جانے کا خوف، طالبان کے ہاتھوں ۳۰ ہزار سے زائد بے گناہ پاکستانی معصوم بچوں، بڑوں کے دھماکے سے اُڑائے جانے کا خوف، ملالہ کو سر میں لگی گولی کے باوجود بچ جانے اور دوبارہ نشانہ بنائے جانے کا خوف، حد تو یہ ہے کہ امریکی حملوں کو بُرا کہنے سے امریکی ناراضی کا خوف اور طالبان کو ظالمان کہنے سے ان سے مروت رکھنے والوں اور خود طالبان کی دھمکیوں کا خوف۔ تاریخ میں تو ایسے ہی ہم وہ واقعہ پڑھ کر توبہ توبہ کرتے رہے جب ایک بادشاہ نے اپنے نشانے بازی کے شوق کو آزمانے کے لیے جانور نہ پا کر ایک دھوبی کے معصوم بیٹے کو کھڑا کر کے اس کے سر پر سیب رکھوایا، پھر نشانہ لے کر تیر چلایا۔ ساتھ تاکید کی کہ لڑکا آنکھیں بند نہ کرے کہ بند آنکھیں بادشاہ سلامت کے موڈ پر گراں گزرتی ہیں۔ پہلا تیر خطا گیا۔ دوسرے میں سیب بچ گیا مگر لڑکے کی جان چلی گئی۔ دکھ سے بلکتے باپ کو درباریوں نے سمجھایا۔ رونا بند کرو اور بادشاہ سلامت کے نشانے کی مبارک باد دو۔ خوفزدہ باپ نے روتے ہوئے کہا "ظالم مارتا بھی ہے اور رونے بھی نہیں دیتا۔"

ہمارے آج کے ظالم امریکی ہوں یا پاکستانی طالبان، یا افغانی طالبان۔ مارتے بھی ہمیں اور ہمارے بچوں کو ہیں اور پھر اپنے نشانوں کی داد چاہتے اور ہمارے رونے پر ناراض بھی ہوتے ہیں۔ میرے دادا ہوتے تو ان سے ضرور پوچھتا "میاں جی......! ہم بڑے اس خوف کا کیا کریں؟" جواب میں اگر وہ دھیرے سے یہ کہہ دیتے "جنھوں نے خوف کے یہ تحفے دیے ہیں، اُنہی کو لوٹا دو۔" تو سچ کہوں سوچتا ہوں تو جھرجھری سی آجاتی ہے۔ میں تو جواب سن کر خوف سے ہی ادھ موا ہو جاتا۔ آپ بہادر آدمی ہیں۔ گنوں سے نکلے رس کی طرح انسانوں کے بے فیض خون کے مسلسل بہنے پر بھی ڈر نہیں لگتا......

WWW.PAKSOCIETY.COM